جهانِ خیال



غلام نبی خیالؔ

برخوردار سلیم سالک
کے لئے

غلام نبی خیال

جہانِ خیال

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ناشر:
کشمیر کلچرل کانفرنس، سری نگر

2016ء

کتاب کا نام : **جہانِ خیال**

مصنف : غلام نبی خیال

صنف : تحقیق وتنقید

اشاعت اول : 2106 عیسوی

طباعت : رنگ محل، دہلی

قیمت : پانچ سو روپے

ناشر : کشمیر کلچرل کانفرنس، سری نگر

مصنف سے رابطہ : email: gulkhayal@gmail.com
Mobile: 0-9419005909

Name of Book : *Jahaan-e-Khayal*

Author : Ghulam Nabi Khayal

Genre : Research & Criticism

First Edition : 2016

Printing : Rang Mahal, Delhi

Price : Rs 500

Author's Contact : 0-949005909

Email : gulkhayal@gmail.com

Publishers:

KASHMIR CULTURAL CONFERENCE

Srinagar - Kashmir

فہرست

مقالات

تاثرات

تبصرات



مقالات

کشمیری ادب کا جائزہ

کشمیری زبان میں ادب کی تخلیق کا آغاز باقاعدہ طور پر تحقیق کے مطابق آج سے سات سو سال قبل اُس وقت ہوتا ہے جب انگلستان میں انگریزی کے اولین شاعر چاسر نیس Centerbury Tales کو نظم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہاں سرزمین کشمیر میں شیوزم اور روحانیت کی مبلغہ للّہ عارفہ کشمیری کی پہلی فلسفہ دان شاعرہ کی حیثیت میں اُبھر رہی تھیں۔ اسے زمانے کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی اور کشمیری دونوں ہم عصر زبانیں ہونے کے باوجود اوّل الذکر جہاں آج سارے جہاں میں جانی پہچانی ہے وہاں کشمیری زبان وادیٔ کشمیر کی چاردیواری میں محبوس ہو کے رہ گئی ہے۔ حالانکہ ایک مشہور مستشرق جے ہنٹن نولز نے اس زبان کی لوک کہانیاں مرتب کرتے وقت کہا تھا کہ ''غالباً دنیا کی کسی بھی زبان میں اس اعلیٰ پایہ کا لوک ادب موجود نہیں ہوگا جس قدر یہ کشمیری زبان میں پایا جاتا ہے''

چودھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں للّہ عارفہ کی پیدائش کے وقت کشمیر میں تقریباً چھ سو سالہ شیوزم اور تانترک فلسفہ دم توڑ رہا تھا اور اس کی جگہ مقامی فکر و ذہن کو اسلام کے بلند و بالا اصولوں اور عالیشان انسانی تصورات نے اپنی روشنی سے منور کرنا شروع کیا تھا۔ کشمیر کے افکار و اذہان میں ایک حیات بخش تبدیلی لانے کا یہ عمل شاہ ہمدان حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے وسط ایشیاء سے کشمیر تشریف لانے اور اُن کی طرف سے یہاں اسلام کی تبلیغ و تشہیر کا سلسلہ شروع

کرنے سے سالہا سال تک جاری رہا۔

للہ عارفہ کے محسوسات کو بھی روایتی شیوزم اور ترقی پسند اسلام کے امتزاج نے ایک نئے شعور اور طرز فکر کی شکل میں متاثر کیا اور اس طرح اُن کا کلام جذبات اور مذہبی خیالات کے مثبت پہلوؤں کا حامل ہوکر انسانیت اور وحدانیت کے آہنگ سے روشناس ہوگیا۔

للہ کے واکھیوں میں جن شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کا شاندار مظاہرہ ہوا ہے اُن کے پیش نظر یہ کہنا کبھی کبھی مشکل ہوتا ہے کہ وہ کشمیری زبان کی اوّلین شاعرہ ہوسکتی ہیں۔ ہمارے ایک مشہور شاعر اور مورخ عبدالاحد آزاد نے اپنی تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' میں بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ 'للہ عارفہ کا دور کشمیری ادب کے کسی ایسے ترقی یافتہ دور کا ایک باب ہوسکتا ہے جس کے خدوخال زمانے کے حادثات نے مٹا دیئے ہوں''۔ آزاد کا عندیہ واقعی ادب کے طالب علم کو دعوت فکر اور ترغیبِ تحقیق دیتا ہے۔ للہ عارفہ کی ذاتی زندگی دنیاوی آلائشوں اور لذتوں سے مبرا فنافی اللہ کے عالم میں گزری ہے۔ ان کی شاعری کے وجدانی انداز اور الٰہیاتی تکلم کے پیش نظر کشمیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں وہ برابر مقبول و مشہور ہیں اور اسی مناسبت سے مسلمان انہیں للہ عارفہ یا کاملہ اور ہندو للہ ایشوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

للہ عارفہ کا جو بھی کلام چند مغربی محققین اور مستشرقین کو دستیاب ہوسکا اُسے جارج گریرسن اور رچرڈ ٹمپل نے انگریزی میں منتقل کیا، لیکن اُردو میں للہ کے کلام کا بہترین ترجمہ پروفیسر نندلال طالب نے کیا، جس کی چند مثالیں یوں ہیں:

آسان تھا بادلوں کا ہٹانا میرے لئے
ممکن ہے میں نکالتی دریا سے سارا آب

بیمار خستہ دل کا بھی کرسکتی تھی علاج
لیکن میں بیوقوف کو قائل نہ کرسکی



دم میں جمتی شبنم دیکھی دم میں دیکھا پڑتا پالا
دم میں دیکھی رات اندھیری دم میں دیکھا دن کا اُجالا
تھی میں ایک کم سن سی دختر دم میں جوانی کو جا پہنچی
چلتی پھرتی تھی میں اب تک ہوگئی جل کر راکھ کی ڈھیری



ترک کر یہ ماسوا ترک کر حرص و ہوا
نور ہی میں ڈوب جا دیکھ اس کے نور کو
وہ بہت ہے بے بہا وہ بہت نایاب ہے
ڈھونڈتا ہے دُور کیا ہے وہ تیرے ہی قریب
وہ خلا ہے یا ملا کچھ نہیں اُس کے سوا

للّہ عارفہ کے ہم عصر اور اسلامی تصوف کے سب سے بڑے کشمیری نغمہ گو شیخ نورالدین نورانی شیخ العالم رحمۃ اللہ علیہ شاعری کی زبان میں اس مشن کی دوسری کڑی ثابت ہوئے جسے للّہ عارفہ نے ہاتھ میں لیا تھا۔ اسی طرح سے للّہ اور شیخ کا دور کشمیری شیوزم اور صوفی ازم کے فلسفہ کو بیان شعری دینے اور اسے ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر نصب العین بنانے میں زبردست تاریخی کردار کا حامل ہے۔

روایت ہے کہ جب شیخ نورالدین عالم ہست وبود میں آئے تو اُنھوں نے اپنی والدہ کا دودھ پینے سے انکار کیا، لیکن للّہ عارفہ نے اُن کے کان میں کہا ''زینۂ مند چھو کھنۂ تہٖ چینۂ کو وہ چھُکھ مند چھان'' (تمھیں پیدا ہونے سے یعنی

جینے سے شرم نہیں آئی تو پینے سے کیوں شرماتا ہے) تو شیخ نے غٹا غٹ سارا دودھ پی لیا۔اس کے بعد للّہ خود بھی کبھی کبھی انھیں اپنا دودھ پلایا کرتی تھیں۔

شیخ العالمؒ نے ایک جگہ اپنے کلام میں للّہ عارفہ کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے اُس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی شعوری نشو ونما اور ذہنی ارتقاء پر للّہ کے فلسفہ کا گہرا اثر رہا ہے۔

للّہ عارفہ کے کلام کو ''واکھ'' کہا جاتا ہے جو اُن چار بیتی چھوٹی منظومات پر مشتمل ہے جن کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں۔ شیخ نورالدینؒ کی شاعری کو مقامی زبان میں شُرک یا اشلوک کا نام دیا گیا ہے۔ان دونوں سخن وروں کا کلام اپنے اسلوب، ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے کم وبیش ایک ہی فلسفہ حیات پیش کرتا ہے۔شیخ العالمؒ کے یہ اشلوک پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ للّہ کا بھی کلام ہوسکتا ہے۔

کچھ تو وہ ہیں جن کو آئی غیب سے تیری ندا
اور کچھ وہ ہیں کہ ہم آغوش دریا ہوگئے
پی کے مئے آنکھیں کسی کی جم گئی ہیں سوئے بام
اور کسی کی پختہ فصلیں کھا گئی ہیں ٹڈیاں



عہد جوانی میں جی بھر کے پاپ کمائے
اور بڑھاپے میں آکر ریشی کہلائے
یہ تسبیح تمہارے ہاتھ میں ناگن ہے
اور نماز تمہاری بھلا کس کھاتے جائے



میرا جیون میری جوانی جیسے پھول انار کا ہو
میری جوانی کب چاہے گی ایندھن اس انگار کا ہو
میرے دست وبازو اپنے کئے کا پھل جب پائیں گے
کیا اُس وقت کروں کیا حاصل میری چیخ وپکار کا ہو

شیخ نورالدین کا تعلق مسلکِ ریشیاں سے تھا اور انھوں نے کشمیر میں ریشی مت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے کلام میں جو فلسفہ پیش ہوا ہے اُس کے مطابق انسان کی جدوجہد حیات کی معراج اُس وجود سے ہم کنار ہونا ہے جسے حُسن مطلق یا **Eternal Truth** کہا جاتا ہے۔

شیخ العالمؒ نے اپنی سادہ زندگی گزار کر پاکیٔ نفس، خداپرستی اور خودآگاہی کا وہ مقام ارفع حاصل کیا کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں بادشاہِ وقت سلطان زین العابدین بڈشاہ نے بھی شرکت کی۔

للّہ عارفہ اور شیخ العالم کے ڈیڑھ سو سال بعد تک کشمیری ادب کے نقوش مقامی افراتفری اور انقلابات کی دھند میں چھپے رہے مگر سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں وادیٔ کشمیر ایک بار پھر حبہ خاتون کے رسیلے نغموں سے گونجنے لگی۔

حبہ خاتون نے کشمیر کے دارالحکومت سرینگر کے مشرق میں ایک نواحی گاؤں پانپور میں جنم لیا جو زعفران کی کاشت کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ حبہ خاتون کا اصلی نام زُون یعنی چاند تھا۔ ایک روز جب وہ ایک زعفران زار میں اپنی ناکام ازدواجی زندگی کی صعوبتوں اور کلفتوں کا رونا رو رہی تھی، تو سلطان کشمیر یوسف شاہ چک کا وہاں سے گزر ہوا۔ یوسف شاہ نے حبہ کے حُسن اور اُس کی پرسوز آواز سے متاثر ہو کر اُسے اُس کے شوہر عزیز لون سے طلاق دلوا کر اپنے قصر

شاہی میں داخل کرلیا اور دربار یوسفی میں زُون حبہ خاتون بن گئیں۔

یوسف شاہ نے 1579ء میں تخت نشین ہونے کے بعد حبہ خاتون کو اپنی ملکہ کا درجہ دے دیا۔ یہ بادشاہ خود بھی شعر و موسیقی کا دلدادہ تھا۔ شاہی دربار میں حبہ خاتون ایک الھڑ اور جاہل دیہاتی گھرانے کے خشک اور بے جان ماحول سے نکل کر سخن گوئی اور نغمہ گری کی حسین دنیا میں آباد ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ حبہ خاتون نے اُنھی دنوں کشمیری کلاسیکی موسیقی میں ایک اہم راگ ''راست کشمیری'' کو ایجاد کیا۔

یوسف شاہ چک کے دورِ حکومت میں مغل بادشاہ اکبر کی للچائی نگاہیں وادیٔ کشمیر کے حسن و خوبصورتی پر مرکوز ہوگئیں اور اُس نے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ یوسف شاہ اور اُس کے بیٹے شہزادہ یعقوب شاہ نے اپنی حریت پسندی کا زبردست مظاہرہ کر کے مغل افواج کو شکست فاش دی۔ کشمیر پر قابض ہونے کے اپنے توسیع پسندانہ ارادے کو ایک عملی شکل دینے کی غرض سے اکبر نے ایک بااصول اور بہادر بادشاہ ہونے کا ثبوت دینے کے بالکل برعکس ایک مکار اور فریبی حکمران کا رول ادا کرتے ہوئے 1581ء میں یوسف شاہ کو صلح جوئی کی دعوت دے کر اپنے دربار میں بلایا اور بعد میں اُسے گرفتار کر کے بہار کے صوبہ میں بسوک نامی ایک گاؤں میں جلاوطن کر کے قید کرلیا جہاں اپنے عزیز وطن اور ملکہ کی یاد میں آزاد اور خود مختار کشمیر کا یہ آخری فرمانروا 1586ء میں ایک عالم بے بسی میں جاں بحق ہوا۔

زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے جب حبہ خاتون کو اپنے محبوب سے جدا کیا تو ہجر و فراق کی تپتی بھٹی میں اس کے فن کا سونا کندن بن کر نکلا اور اُس نے اس عالم فراق میں جو درد بھرے گیت اور پُر سوز نغمے تخلیق کیے وہ کشمیری شاعری کے سرمایہ میں ایک بیش بہا اور بے مثال اضافہ ہیں۔ جب خاتون بھی جدائی کے اسی عالم میں

1605ء میں باون سال کی عمر پا کر خدا کو پیاری ہوگئی۔ اُس کے کلام کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو:

قدم قدم گلزار کھلائیں آؤ میرے پھولوں کے رسیا
آؤ چلیں ہم چنیں چنبیلی موت کے بعد ہے اللہ بیلی
راہ تکوں میں بیٹھ اکیلی آؤ میرے پھولوں کے رسیا
آؤ چلیں باندھے گلدستے کیوں روٹھے ہو ساجن ہم سے
دور دیس میں کیا سکھ لوگے آؤ میرے پھولوں کے رسیا
آؤ چلیں ہم کاہو توڑیں دنیا والے تہمت جوڑیں
لیکھ کی دھارا کیسے موڑیں آؤ میرے پھولوں کے رسیا
آؤ چلیں ہم ندی کنارے مست پڑے ہیں نیند کے مارے
بیٹھی ہوں سندیس سہارے آؤ میرے پھولوں کے رسیا

حبہ خاتون کے کلام سے کشمیری سخن گوئی میں پہلی بار گیت معرض وجود میں آیا۔ رومان اور غنائیت کی ملکہ حبہ چونکہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اپنے شوہر کی جدائی میں گزارنے پر مجبور ہوئی تھی۔ لہازا اپنے محبوب کی یاد میں جو نغمے اُس نے تخلیق کیے اُن میں نسوانی جذبات کا بیان واظہار انتہائی پُرسوز انداز میں کیا گیا ہے۔ بعد میں ایک روایت بن کر کشمیری شاعری میں یہی رسم چل نکلی کہ گیتوں، نغموں اور رومانی شاعری میں تخاطب عورت کی طرف سے مرد کے نام ہوتا رہا اور فراق کی ماری معشوقہ یعنی عورت ایک والہانہ پن کے ساتھ اپنے محسوسات بیان کرتی رہی۔

للہ عارفہ اور شیخ العالمؒ کے عہد کو اگر کشمیری شاعری کا اولین دور اور حبہ خاتون کے دور کو دورِ ثانی کہا جائے تو محمود گامی سے اس کا تیسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔

محمود گامی 1765ء میں وادیٔ کشمیر کے جنوب میں ایک خوبصورت علاقے شاہ آباد ڈورو میں پیدا ہوا۔ اُس کے زمانے میں کشمیر کی مقامی زبان کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی جگہ ہندوستان میں مغل بادشاہوں کی سرپرستی کی وجہ سے فارسی نے لے لی تھی۔ عام لوگ اگرچہ بول چال میں اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتے تھے مگر دربار کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے شعراء اور روساء کے طبقے نے فارسی علم وادب کو روزمرہ میں شامل کرلیا تھا۔ اسی طرح درسگاہوں میں بھی فارسی کے کلاسیکی شہ پارے پنج گنج، گلستان اور بوستان اور یوسف زلیخا وغیرہ نصاب میں شامل تھے۔ انھی ہمہ گیر اور غالب اثرات کے تحت کشمیری شاعروں نے ان فارسی شہہ پاروں کو کشمیری میں منتقل کیا، لیکن فارسی اور اُردو کی روایات کے برعکس کسی ترجمے کے آغاز میں بادشاہِ وقت یا اُن کے مقرر کردہ حکام کی تعریف وتوصیف میں ایک مصرعہ بھی قلم بند نہیں کیا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کشمیری شعراء کو مغلوں کے وقت شاہی عنایات سے محروم ہی رکھا گیا۔

محمود گامی کو دنیائے سخن میں کشمیر کا نظامی کہا جاتا ہے۔ اُس نے سب سے پہلے کشمیر کی ادبی تاریخ میں مثنوی کو متعارف کیا اور فارسی سے استفادہ کرتے ہوئے نظامی، گنجوی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاہ پاروں کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا۔ محمود کی ان تمام مثنویات میں ''یوسف زلیخا'' کو سب سے زیادہ شہرہ اور قبول عام حاصل ہوا ہے۔ اس مثنوی کے اختتام پر جو مرثیہ شاعر نے حضرت یوسفؑ کی وفات پر بی بی زلیخا کی زبانی کہا ہے اُسے دنیائے ادب کی اس صنف میں ٹامس گرے کی ممتاز **Elegy** کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یوسف زلیخا کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعد میں جرمنی کے ایک عالم کارل برکھارڈ نے اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کرکے اس پر ایک تعارفی مضمون

بھی لکھا جو 1895ء میں شائع ہوا تھا۔

محمود گامی ایک پُر گو شاعر تھا۔ مثنوی کے علاوہ اُس کے کلام میں غزلیات، گیت، منظومات اور ریختہ بھی شامل ہیں۔ بعد میں محمود کے ہی دیہات میں پیدا ہونے والے ایک اور غنائی شاعر اوران کے ہمعصر رسول میر شاہ آبادی نے کشمیری زبان میں غزل کو باقاعدہ ترویج دے کر رومانیت کے نئے آہنگ اور اسلوب سے مالا مال کر دیا۔

کشمیر کے مثنویاتی ادب میں مقبول کرالہ واری کی ''گلریز'' نے جو نام پایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گلریز دراصل ضیائی نخشبی نے فارسی میں لکھی تھی۔ لیکن فارسی میں اسے وہ شہرت نصیب نہ ہوسکی جو مقبول کے فنکارانہ تخیل کی بدولت اسے اُسی طرح حاصل ہوئی جس طرح عمر خیام کی رباعیات کو ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے یورپ میں زبان زد خاص وعام کرلیا۔ اس مثنوی میں مقبول کی قوت تخیل اور فنی صلاحیتیں اس طرح سے نکھر آئی ہیں کہ گلریز کو کشمیری میں ایک عظیم شعری کارنامہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

کشمیری شاعری میں سب سے زیادہ پُر گوئی اُن فارسی مثنویات پر حامل ہیں جن کے منظوم تراجم کے ذریعہ کشمیر کے لوگ عجیب وغریب اور پُر اسرار کرداروں کے تانے بانے سے بنی ہوئی کہانیاں اور افسانے سنا کرتے تھے۔ ان تراجم کو ادبی اصطلاح میں Adaptation کہنا زیادہ موزوں رہے گا، کیونکہ اکثر مثنویات میں جہاں مترجم نے اصل کی روح کو قائم رکھنے کی بدرجہ اُتم کوشش کی ہے وہاں وہ کئی مقامات پر حسب منشا یا اختصار کی غرض سے چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے اور اس طرح سے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی اس کی کوشش بہر حال سعی ناتمام کے سوا اور کچھ نہیں رہ پاتی۔ اس کی ایک مثال ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل فردوسی کا شاہنامہ ہے جسے کشمیر کے ایک شاعر وہاب حاجنی

نے اصل کے ایک تہائی سے بھی کم اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

کشمیری مثنویات اگرچہ ایک طرف ہمارے ادبی خزانے کا ایک قابل قدر سرمایہ کہلائی جاسکتی ہیں وہاں دوسری جانب خالص ادبی لحاظ سے یہ کشمیری زبان کی شاعرانہ خیال آرائی اور شاعری کی آفاقیت کے لیے کسی خاص وجدان کا باعث نہیں بن سکی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے مثنویاتی دور کے اکثر کشمیری شاعر خود فارسی زبان کے عاشق تھے، لہذا اُنہوں نے اپنے تراجم میں بھی فارسی تلمیحات، اصطلاحات اور ترکیبوں کا بے محابا استعمال کر کے ایک تصنع کا عالم پیدا کرلیا ہے۔ اس کے پیش نظر مقامی لوک داستانوں یعنی ''ہی مال ناگرائے'' کو ولی اللہ متو اور ''اکہ نندن'' کو رمضان بٹ، احد زرگر اور صمد میر نے زیادہ اثر آفرینی اور طبع آرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غزل کشمیری شاعری کے ماتھے کا سب سے چمکتا ہوا جھومر ہے جس میں آب وتاب والے نگینے جوڑنے کا آغاز محمود گامی اور رسول میر نے کیا۔ ان دونوں اساتذہ کے دور سے جب کشمیری غزل دور جدید میں داخل ہوئی تو وہ فارسی کے گہرے اثر سے آزاد ہو کر غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد کے ہاتھوں خالص کشمیری محاوروں اور استعاروں سے آراستہ ہونے لگی۔

جدید غزل کشمیری میں بالواسطہ طور پر اُردو غزل سے وارد ہوئی ہے۔ لہذا پہلے پہل اس پر وہی موضوعات غالب رہے جن پر جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، اسرارالحق مجاز، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، مجروح سلطان پوری، مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، سردار جعفری اور غلام ربانی تاباں نے خامہ فرسائی کی تھی (یہاں جدید غزل سے ہماری مراد 1947ء کے بعد کی کشمیری غزل ہے)۔

ترقی پسند تحریک کے معین کردہ آداب ولوازمات نے غزل کے موضوع کا

دائرہ اور بھی تنگ کر دیا، لیکن یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو کشمیری غزل نے بعد میں حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدم، جگر مرادآبادی، قتیل شفائی اور فراق گورکھپوری کے ساتھ ساتھ غالبؔ اور اقبالؔ کے اثرات قبول کیے اور اس طرح کشمیر میں اس دورنگی امتزاج کی بدولت رحمٰن راہی، امین کامل اور فاضل کشمیری کی کئی خوبصورت غزلیات معرض وجود میں آئیں۔ دوسری طرف غزل گوئی کے اس بے پناہ ذوق وشوق کے عالم میں کئی ایسے شعراء مستقل طور پر روایت پرستی کے محدود ماحول سے اپنے خیالات کو آزاد کرانے میں ناکام ہی رہے اور ان کی غزلیات گنے چنے محاوروں اور اصطلاحوں کے دائرے میں قید ہو کر رہ گئیں۔ ان میں محی الدین نواز، پیتامبر ناتھ فانی، عبدالمجید سائر، رسا جاودانی، دینا ناتھ مست، ارجن دیو مجبور اور غلام محمد مشتاق وغیرہ شامل ہیں۔

کشمیری غزل کو اگرچہ غالبؔ کی ہم سری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا، لیکن تقابلی مطالعہ مقصود ہو تو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ غزل اپنی معنوی برتری اور اظہار کی سر بلندی کے لحاظ سے ہندوستان کی کئی زبانوں کی غزلیات سے بہتر اور افضل قرار دی جاسکتی ہے جن میں اُردو، ہندی، پنجابی اور سندھی کی جدید غزل کی مثالیں بھی شامل ہیں۔

کشمیری شاعری میں تصوف نگاری کو ایک عام کشمیری سخن فہم اور ''روحانیت'' کے طالب کی نظروں سے آج بھی اس زبان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ایک پُرسوز حصہ سمجھا جاتا ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک جدید زاویہ نگاہ اور نقطہ نظر سے اس شاعری کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی اس نام نہاد روحانیت کے صحیح مطالب تلاش کرنے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ کشمیری نقادوں اور سخن شناسوں نے بذات خود اس نوع کے تصوف کا کوئی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ چند عربی، فارسی اور سنسکرت

کتابوں کے اقتباسات کو دوسروں کے ذریعہ اپنے الفاظ کا جامہ پہنانا اور اس طرح سے کشمیری زبان کی صوفی شاعری پر مقالات تحریر کرنا محض ایک ادبی مذاق ہوسکتا ہے اور کچھ نہیں۔ کشمیر کی صوفی شاعری کے بارے میں مبہم قسم کے شکوک وشبہات کو اس لحاظ سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ہمارے اکثر صوفی شاعر مکمل طور پر ناخواندہ تھے مگر اس کے باوجود اُن کی شاعری میں بظاہر آمد کے نتیجے میں کہیں کہیں عظیم شاعری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جن میں رحمٰن ڈار کے ''شش رنگ'' کو نمایاں طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

کیا ایک ان پڑھ لوہار، کمہار، گلکار یا مزدور کسی مطالعاتی تجربے کے بغیر دل کو چھو لینے والی شاعری کرنے کا اہل ہوسکتا ہے اور کیا وہ اُن موضوعات کی شیرازہ بندی کرنے کے قابل بن سکتا ہے جن کا رشتہ براہ راست ایک خالص فلسفہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جواب بھی حل طلب ہے اور جس کی گرہ کشائی اطمینان بخش حد تک کسی کشمیری نقاد کے ہاتھوں آج تک نہیں ہوسکی ہے۔ شاعری میں الہام یا آمد کو خارج از امکان قرار نہیں دیا گیا ہے مگر شاعری میں ان خاص تلمیحات اور محاورات کا استعمال اس زبان یا زبانوں کے بھرپور مطالعہ کے بغیر ناقابل فہم ہے جن کا تعلق ان کی لسانی شیرازہ بندی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔

کشمیری نظم بھی اپنے ابتدائی دور میں نعرہ بازی اور ہنگامی موضوعات کی تبلیغ تک ہی محدود رہی جس کی بنیاد عبدالاحد آزاد نے ڈالی۔ آزاد کی منظومات میں شاعرانہ آہنگ کے برعکس شور وغوغا کا دھوم دھڑا کا صاف نظر آتا ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ اگر آج آزاد زندہ ہوتے تو وہ اپنی نظموں ''انقلابِ روس'' اور ''مارکسزم'' کو خود ہی رد کرلیتے، کیونکہ اُن کی وفات کے بعد انقلابات اور ازموں کا تصور بہت حد تک معنوی لحاظ سے تبدیل ہوتا رہا۔ البتہ اُن کی طویل

نظم ''دریا'' اس قسم کے سارے نقائص اور سطحیت سے بالاتر ہے۔

کشمیری زبان کی بہترین نظمیں 1955ء سے لے کر 1970ء تک تخلیق کی گئیں۔ یہ مختصر سا زمانہ کشمیر میں حقائق کو پرکھنے اور سمجھنے اور سیاسی سازشوں کے پردے چاک ہونے کا زمانہ تھا۔

کشمیری ادب میں غلام احمد مہجور کو نشاۃ الثانیہ کا نقیب کہا جا سکتا ہے جنھوں نے کشمیر کے فکر و فن کو شعور اور آگہی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ مہجور نے 1885ء میں ایسے نظام میں آنکھ کھولی جب کشمیر کی سرزمین جاگیرداری کے استیصال سے کراہ رہی تھی اور صدیوں کی غلامی نے اہل کشمیر کو مجبوری اور مقہوری کی زنجیروں میں جکڑ کے رکھ دیا تھا۔

مہجور چونکہ پیشے کے لحاظ سے پٹواری تھے اور انھیں اس وجہ سے وادیٔ کشمیر کے دیہاتوں میں گھومنے پھرنے کا بھرپور موقع ملا تھا۔ اس لیے اُن کی منظومات میں کشمیر کے دل فریب نظاروں، روپہلی ندیوں اور نالوں، فلک بوس اور برف پوش پہاڑوں اور عطر بیز مرغزاروں کی گوناگوں تصویر کشی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مہجور نے اہل کشمیر کی غلامی کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں طور پر آشکارا کیا ہے۔ مہجور کے شاگرد اور ہم عصر عبدالاحد آزاد نے مہجور کے دل میں موجزن جذبات کو بعد میں اپنے فن کی سب سے زوردار تحریک کی شکل میں نمایاں کیا۔ اپنی عوامی تخلیقات اور قوم پرستانہ منظومات کی بدولت مہجور کو کشمیر کا قومی شاعر کہا جاتا ہے اور ان کا وہ نغمہ آج بھی مقامی طور پر سیاسی، سماجی اور ثقافتی اجتماعات میں پیش لفظ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا پہلا شعر ہے:

چمن والے چمن میں اب نئی اک شان پیدا کر
کھلیں گل ہوں فدا بلبل تو وہ سامان پیدا کر

مہجور کی منظومات کا بہت کم حصہ اُردو اور دوسری زبانوں میں منتقل ہوا

ہے، لیکن جب دیویندر ستھیارتھی اور مرحوم بلراج ساہنی نے تقریباً اسّی سال قبل بنگال کے ''وشوا بھارتی'' رسالے میں اُن پر تعارفی مضمون قلمبند کیے اور ان میں مہجور کے چند گیتوں کے انگریزی تراجم بھی شامل کر لئے تو رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ ترجمہ پڑھنے کے بعد کہا ''اگر مہجور بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو میں ضرور کہتا کہ اُس نے میرے خیالات سے استفادہ کیا ہے''۔

عبدالاحد آزاد بیک وقت اقبال اور اشتراکی خیالات سے متاثر تھے، لہٰذا اُن کے یہاں فلسفہ خودی اور سماجی طبقات کی کشمکش دونوں ساتھ ساتھ اُبھرے ہیں۔ آزاد نے اپنی عمر درس و تدریس میں گزاری اور جوانی میں ہی بے کسی کے عالم میں 1948ء میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ اپنی مختصر زندگی کے دوران ہی آزاد نے خاص طور پر کشمیری ادب میں نظم کی صنف کو اپنی کئی بے مثال تخلیقات سے مالا مال کیا، جن میں شکوۂ ابلیس، دریا، وتستا اور شکوہ کشمیر وغیرہ ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

1947ء میں کشمیری ادیب اور شاعر کلچر کانفرنس کے پرچم تلے پہلی بار ایک منظّم صورت میں یکجا ہو گئے اور اُنھی دنوں کشمیری ادب میں پہلی بار افسانہ اور ڈراما وجود میں آیا۔ اس ترقی پسند تحریک نے مرزا غلام حسن بیگ عارف، دینا ناتھ نادم، نور محمد روشن، حبیب کامران، سوم ناتھ زتشی، اختر محی الدین، رحمٰن راہی، امین کامل، غلام نبی عارض، پیتامبر ناتھ فانی، غلام محمد ناز کولگامی اور فاضل کشمیری وغیرہ کو کاروانِ ادب کے قافلہ سالاروں کا درجہ بخشا۔ بعد میں غلام نبی فراق، مظفر عازم، چمن لال چمن، مکھن لال بیکس، واسدیو ریہہ، اُمیش کول، فاروق بڈگامی، غلام نبی خیال، عبدالعزیز ہارون، علی محمد لون، ہری کشن کول، رتن لال شانت اور پشکر بھان اپنے فن سے ہم عصر ادب کا دامن بھرتے رہے۔

تنقید و تحقیق کے میدان میں رحمٰن راہی، غلام نبی فراق، امین کامل،

غلام نبی خیال، شفیع شوق، موتی لال ساقی، محمد یوسف ٹینگ، بشیر اختر، ناظر کولگامی اور مشعل سلطان پوری اپنی کدو کاوش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک کئی کشمیری ادیبوں اور شاعروں کو ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا ہے۔

ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے بھی ہر سال کشمیری زبان کی بہترین مطبوعات پر انعام دئے جانے کا سلسلہ چل رہا ہے۔ کشمیری زبان میں تراجم کے لین دین کا عمل بھی کئی برسوں سے جاری ہے، جس کی بدولت رباعیات عمر خیام، گوگول کی انسپکٹر جنرل، گورکی کی ماں، الف لیلیٰ، زین العابدین کی پیامبر، ابسن کے ڈرامے گھوسٹ اور وایلڈ ڈک، ارسطو کی بوطیقا، ٹالسٹائی کی جنگ اور امن، ڈاکٹر فاسٹس کا ایک منظر، شیکسپیئر کی جولیس سیزر، مسدس حالی، بابا فرید کا پنجابی کلام، بال جبرئیل، اسرار خودی، دیوان غالب، ٹیگور کے ڈرامے چوکھیر بالی، ڈاک گھر اور سائیکل آف سپرنگ، مکتہ دھارا، راجا اور روانی اور گل لالہ، منظوماتِ اقبال اور غالب، ٹینی سن، کیٹس، ناظم حکمت اور یوری پیڈیز کا یونانی المیہ میڈیا کشمیری میں منتقل ہو چکے ہیں۔

کشمیری ادب میں جدیدیت کی نہج کو کوئی واضح سمت نہیں مل سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری ادب جن روایتی اثرات کے سائے میں پروان چڑھا ہے اُن کے مقرر کردہ اسالیب اور موضوعات کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے ذہن پر مکمل طور پر غالب وحاوی ہیں اور کشمیری شاعری اب بھی کلاسیکی لہجے کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی سبب سے رحمٰن راہی، مظفر عازم، چمن لال چمن، فراق، روسل پونپر اور دینا ناتھ نادم اور کئی اور شعرا کا جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا کلام قاری کے دل ودماغ پر کوئی دیرپا تاثر قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا، لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ کشمیری شاعر اور ادیب سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس تیز گام زمانے میں ہر آن بدلتے ہوئے ماحول اور اقدار کے مدوجزر سے آگاہ نہیں

ہیں۔اس کے تحت الشعور پر وقت کی ہر کروٹ کے نشانات ثبت ہوتے ہیں جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً فن کے مختلف النواع پیکروں کو تراش کر کرتا ہے اور بعض اوقات یہ تصویر کشی جاذب نظر اور دیدہ زیب بھی بن جاتی ہے۔

کشمیری ادب گزشتہ سات صدیوں کے دوران زندگی کی ہر دھڑکن کو محسوس کرتا رہا ہے اور ان دھڑکنوں اور محسوسات اور تجربات کا ردعمل ساری دنیا کے ادبی اظہار کی طرح ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔



کشمیری شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

1947ء میں اکتوبر کے آخری ہفتے میں جب سرزمینِ کشمیر پر پاکستان کی طرف سے قبایلی بندوق برداروں نے حملہ کیا تو کشمیر کے دانشور، ادیب، شاعر اور تمام اہل قلم قومی کلچرل فرنٹ کے پرچم تلے یک جا ہو کر حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات خیز ترانے تخلیق کر کے ثقافتی محاذ پر کمر بستہ ہوئے۔ اس طرح انقلابی گیتوں اور ترانوں کا پہلا مجموعہ ''گائے جا کشمیر'' اپریل 1948ء میں منظر عام پر آیا جسے کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے نام معنون کیا گیا۔

اس یادگار مجموعہ کلام کے پیش لفظ میں کہا گیا کہ ''کسی دور کی شاعری ایک قوم کی کیفیت، قوت اور کمزوری کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان نظموں کو پڑھنے، سنانے اور گانے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے زبردست جذبات، حب الوطنی کے گہرے احساسات اور ایک درخشندہ مستقبل کے عظیم الشان تصورات نے ہمارے شعرا کو ایسی غیر معمولی جامعیت، سرعت اور تحریک کے ساتھ ہمارے عوام کے قومی تحفظ، آزادی اور نیا کشمیر کی جنگ کے لیے عزم بالجزم کی عکاسی کرنے کی ترغیب دی ہے۔ یہ نظمیں آگے ہی عوام میں مقبول ہو چکی ہیں اور ان میں جذبات کی گہرائی، آزادی کی امنگیں اور ان جذبات کو عملی جامہ پہنانے کا عزم صمیم پیدا کرتی ہیں۔

''اجتماعی گانے کی تحریک جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ لوگ مل کر حب الوطنی کے نغموں کو ایک باقاعدگی کے ساتھ گائیں، انھیں اپنی محافظتی جد و جہد کا صحیح مطلب سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور آزادی کے لیے آخر دم تک لڑنے کا حوصلہ اور ارادہ پختہ بنا دیتی ہے۔

''جہاں تک ہم جانتے ہیں چینی قوم نے جاپانیوں کے خلاف جد و جہد میں عوام کو منظّم کرنے کے لیے گیت کی طاقت کو سب سے پہلے پہچانا۔ تب سے جس جس قوم نے جمہوریت اور آزادی کے لیے جنگ لڑی ہے اُس نے یہ زبردست ہتھیار اٹھایا ہے''۔

اس کتاب میں کشمیر کے ایک ترقی پسند شاعر پریم ناتھ پردیسی کا یہ جنگی ترانہ قابل ذکر ہے:

قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پر لڑیں گے ہم
لڑیں گے ہم لٹیروں اور حملہ آوروں کے ساتھ
لڑیں گے ظالموں کے ساتھ اور جابروں کے ساتھ
وطن فروش، بے وفاؤں اور شاطروں کے ساتھ
قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پر لڑیں گے ہم
ہم اپنے دیش کے لیے جوان خوں بہائیں گے
وطن کے ننگ و نام پر ہم گردنیں کٹائیں گے
وطن کے گیت گائیں گے وطن کو ہم بچائیں گے
قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پر لڑیں گے ہم

سوال اب نہیں رہا کسی کی خاص ذات کا
یہ مسلہ نہیں ہے ایک دو یا پان سات کا
سوال یہ ہے قوم کی حیات کا ممات کا
قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پر لڑیں گے ہم

اس مجموعے میں جنگِ آزادیٔ کشمیر کے حوالے سے مخدوم محی الدین اور پریم دھون کے چند ترانے بھی شامل ہیں۔

کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک کے پسِ پردہ برصغیر کے وہ نامور ادیب اور ان کی تخلیقات اور نظریات کارفرما تھے جو اس تحریک کی بنیاد رسمی طور پر 1936ء میں سید سجاد ظہیر کی سربراہی میں ڈال چکے تھے۔ ان میں سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور ملک راج آنند بھی شامل تھے جو لندن میں زیر تعلیم تھے اور وہیں پر اس ہمہ گیر تحریک کے بانی ہونے کا شرف حاصل کر چکے تھے۔

کلکتہ میں اس تحریک کا آغاز بھی اسی سال ہوا جب لکھنو کے ثقافتی شہر میں سجاد ظہیر ہی کی سربراہی میں ترقی پسند مصنّفین نام کی تنظیم کا قیام 10/اگست 1936ء کو عمل میں لایا گیا۔ اس طرح سے یہ تحریک ہندوستان میں سرسید احمد خان کی تحریک برائے فروغ علم کے بعد سب سے زیادہ با اثر اور با مقصد تحریک بن گئی جس کے علم برداروں میں منشی پریم چند، ڈاکٹر رشید جہان، فیض احمد فیض، محمود الظفر، پروفیسر احمد علی اور احمد ندیم قاسمی جیسے معتبر نام شامل ہیں۔

کشمیر میں اس تحریک کو پہلے پہل قومی کلچرل فرنٹ کے نام سے موسوم کیا گیا جس نے بعد میں کلچرل کانگریس اور پھر کانفرنس کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے دوش بدوش ترقی پسند مصورین اور ترقی پسند تھیٹر سرگرم عمل رہے۔

کشمیر کی ترقی پسند ادبی تحریک چونکہ ہندوستان کی با اثر تحریک سے ہی متاثر ہوئی تھی لہازااس کی پشت پناہی اور آبیاری کے لیے اردو کے سرکردہ دانشور اور اہل قلم بار بار یہاں آتے رہے جن میں رامانند ساگر، بلراج ساہنی، سردار جعفری،، مخدوم محی الدین، کمال احمد صدیقی، دیویندر ستھیارتھی، خواجہ احمد عباس، شیودان سنگھ چوہان اور تھیٹر سے وابستہ نامور شخصیات شیلا بھاٹیہ، اچلا سچدیو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مخدوم نے تو کشمیر پر پاکستانی یلغار کے حوالے سے ایک زوردار نظم لکھی جو مقامی طور پر زبان زدِ خاص و عام ہوئی۔ ''آزادی کا ترانہ'' نام کی اس نظم کے چند اشعار یوں ہیں:

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
کشمیر کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

ہندی کے جانے مانے ناول نگار اور نقاد شیو دان سنگھ چوہان نے تو تحریک کے ترجمان کشمیری رسالے ''کونگ پوش'' (زعفران کا پھول) میں یہاں کی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات پر کئی مبسوط مضامین بھی لکھے۔ اس کے علاوہ تینا ہم ترقی پسند شاعروں دینا ناتھ نادم، رحمان راہی اور امین کامل کے فن پر اس کا ایک سیر حاصل تجزیاتی مقالہ بھی اسی ماہنامہ کے جولائی 1951ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی بدولت کشمیری زبان میں پہلی مرتبہ افسانہ، ڈراما،

ناول اور اوپیرا لکھا گیا۔ اس کے علاوہ پہلی بار میکسم گورکی، ایلیا اہرن برگ، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور کئی دیگر ادیبوں کے افسانے کشمیری میں منتقل کیے گئے۔ اس پس منظر میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہم عصر کشمیری شاعری کی شاندار عمارت ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد پر ہی استوار ہوئی ہے کیونکہ اس کے بعد کسی ایسی تحریک نے کشمیری ادبیات کو متاثر نہیں کیا۔ کانفرنس ہی کے اہتمام سے کشمیری زبان کا اولین ادبی ماہنامہ کونگ پوش بھی جاری ہوا۔

تحریک کے شعری کاروان کے قافلہ سالاروں میں شاعرِ کشمیر مہجور، عبدالاحد آزاد، دینا ناتھ نادم، امین کامل، رحمان راہی، نور محمد روشن، غلام نبی فراق اور میرا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ تحریک 1960ء کے آس پاس لبھ کار کی زبردست مخاصمت سے دم توڑ گئی جو اسے خطرناک کمیونسٹوں کا ایک ٹولہ سمجھتی تھی، لیکن اس کے بعد آج تک جتنے سینکڑوں کشمیری ادیب اور شاعر منظر عام پر آئے ان کے فن میں کسی نہ کسی شکل میں ترقی پسندی کا بھرپور اثر نمایاں ہے۔ یہ بھی ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا سورج غروب ہونے کے بعد کشمیری زبان نے تاحال کوئی نادم، راہی، کامل یا خیال پیدا نہیں کیا۔

ترقی پسند شاعری کی اس نئی اور تازہ دنیا میں مہجور کشمیری کو ایک علم بردار کی حیثیت حاصل تھی جس نے اپنی کئی نظموں سے سخن گوئی کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ کیفی اعظمی نے مہجور کی ایک مشہور نظم کا یہ خوبصورت ترجمہ کیا ہے:

چمن والے چمن میں اب نئی اک شان پیدا کر
کھلیں گل، ہوں فدا بلبل، تو وہ سامان پیدا کر

ابھی ویراں ہے پھلواری ابھی خونیں ہے ہر کیاری
کہاں تک روئے گی شبنم، بنا اشکوں کو چنگاری!

کوئی ہلچل، کوئی بادل، کوئی طوفان پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر

جدا ہیں رنگ پھولوں کے جدا ہیں ڈھنگ پھولوں کے
کبھی کانٹا نہ ہو دامن رہے جو سنگ پھولوں کے

نیا ہر ڈھب، نیا مذہب، نیا ایمان پیدا کر
چمن والے چمن .والوں کی کوئی شان پیدا کر

تیری مشکل تیری مشکل تیری منزل تیری منزل
سہارا دے کوئی تجھ کو تو پھر چلنے سے کیا حاصل

تو اپنا ہوش، اپنا جوش، اپنی آن پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر

عبدالاحد آزاد کو انسانیت کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اُس کے کلام میں قاری کو انسانی محبت اور بلند اقدار کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ یگانگت اور بھائی چارہ کی مثالیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ آزاد نے پہلی بار کشمیری نظم کو ایک نئ ہیت اور اسلوب سے آگاہ کیا۔ اُس کی حب الوطنی پر مبنی ایک مختصر نظم کا میں نے یوں ترجمہ کیا ہے:

یہ بادِصبا اور معطر فضا
جو کرتی ہے دل کو جوانی عطا

ٹلیں غم کھلیں فرحتوں کے چمن
ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن

چمن میں ہر اک پھول خندان ہے
شبِ چار دہ نور افشان ہے
فلک پر ستاروں کی ہے انجمن
ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن

ہیں جھرنے یہاں تشنگاں کے لئے
ہر اک مردِ پیر و جواں کے لئے
چناروں کے سائے میں اترے تھکن
ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن

یہ جنت یہاں ہے عیاں سامنے
وہ جنت نہاں ہے ہر اک دید سے
حقیقت یہ ہے اور وہ ہے سخن
ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن

یہ آزاد بلبل جو گاتا رہے
گلستاں کو نغمے سناتا رہے
تو گل اور بلبل کا ہوگا ملن
ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن

دینا ناتھ نادم کو کشمیری شاعری کا انقلابی شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کی شاعری میں کڑکتی بجلیوں کی گھن گرج اور سیلابوں کی پُرشور روانی ہے۔ انیسوی صدی کے وسط میں جب مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں سے کوریا میں ایک اور جنگ کے

بادل منڈلانے لگے تو ناؔدم نے ایک معرکتہ لآرا نظم لکھی جس کا عنوان تھا ''مجھے آشا ہے کل کی''۔ایک ابدی تاثر کی حامل یہ نظم آج بھی سنی اور سنائی جاتی ہے۔

اس یادگار نظم کا کوئی منظوم ترجمہ نہیں ہوا ہے لہاذا اس کے چند اشعار آزاد نثر میں مثال کے طور پر یہاں درج کیے جاتے ہیں یہ نظم شوہر سے دور ایک عورت کی زبانی بیان کی گئی ہے:

مجھے کل کی آشا ہے
کل دُنیا جھوم اٹھے گی
کہتے ہیں کہ جنگ چھڑ جائے گی
کاش کل ایسا نہ ہو
میرے بچوں کا باپ آنے والا ہے
میں رات گئے تک اُس کا انتظار کروں گی
وہ آئے گا تو میری آنکھیں
کاجل کے بغیر ہی سرمئی ہو جائیں گی
میری چھاتیوں سے دودھ ابل پڑے گا
اور ہم ایک دہائی کے بعد دسہرہ منائیں گے
اُس کی گھٹڑی میں گل اور گلزار ہوں گے
میرے لئے چھینٹ کے کپڑے
بیٹی جاؔنی کے لئے کانوں کی بالیاں
اور حبیب کے ختنے کے لیے ڈھیر سارے پیسے
مجھے کل کی آشا ہے
کل جنگ چھڑ نہ جائے
کل میرے بچوں کا باپ آنے والا ہے۔

گیان پیٹھ انعام یافتہ رحمان راہی کی شاعری نئ نسل کی نئ اور اچھوتی آواز ہے جس میں ماحول اور اس کے آس پاس رونما ہونے والے کوایف کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔ رومانوی لہجے کے اس اہم شاعر کی کئ نظمیں آج بھی مقامی طور پر مقبول ہیں۔ فارق نازکی نے ان کی ایک طویل نظم ''تابِ جلوہ'' کا ترجمہ کیا ہے جس سے یہ دو تین بند پیش ہیں:

خدا کے نام پہ ہوتا ہے قتلِ عام یہاں
ہزار تشنہ دہن کھوگئے سرابوں میں

دکھائے کس نے سبز باغ کھیتیاں بھولیں
صدف کی چاہ نہ کی پھنس گئے حبابوں میں

نسیم صبح! تمہیں یاد کیا نہیں وہ دن؟
چھلک پڑے تھے یہاں پر بھی آرزو کے ایاغ

میرے وطن نے مقدر کی تیرہ راہوں میں
جلائے تھے ارادوں کے خون رنگ چراغ

یہ درد یونہی رہے گا یہ ٹیس زندہ ہے
جو تو نہ خود ہی مداوائے دردِ دل کرلے

نہ راستہ ہی ملے گا نہ منزلوں کا سراغ
اگر نہ رختِ سفر باندھ لیں گے دیوانے

امین کامل کے کلام کا اگر چہ ترجمہ دستیاب نہیں، اُس کے ان دو ہی اشعار

سے اس کی شاعرانہ فطانت کا اظہار ہوتا ہے جسے نثر میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

کتے کی گردن سے سونے کی زنجیر لٹک رہی ہے
میں قربان جاؤں اُس کے بھونکنے پر

کاملؔ! تمہارا ہر شعر الہام کی طرح ہے
اور ہر مصرعہ ایک ایک آیت ہے

غلام نبی خیالؔ کی ایک مشہور نظم ''شہرنامہ'' کے یہ چند اشعار اس کی شاعرانہ فن کاری کی دلالت کرتے ہیں۔ انھیں خیالؔ نے خود ہی اردو کے سانچے میں ڈھالا ہے:

درد کے شعلوں میں جل کر کتنے آنسو پی لئے
کتنا زہریلا ہے شبنم کا اثر اس شہر میں

تیرگی میں چیختی ہے کیوں یہاں آوازِ دل
کھا گئی ہے نور کو کس کی نظر اس شہر میں

کس طرح اپنوں کے رشتے جاگزیں دل میں رہیں
اب تو بیگانوں کے ہیں شام وسحر اس شہر میں

غیر اس بستی میں آکر صورتِ گل کھل اٹھے
کھو گیا مجھ سے مگر میرا نگر اس شہر میں

1947ء تک کشمیر کی چھ سو سالہ پرانی شاعری اکثر وبیشتر رومانوی موضوعات سے ہی اثر پذیر رہی جس میں زیادہ تر فارسی مثنویوں کے ترجمے کا پلہ بھاری تھا۔ اس طرح سے تقریباً دو سو کے قریب بزمیہ، رزمیہ اور مذہبی مثنویاں کشمیری میں منتقل ہوئیں۔ اس سے قبل چودھوی صدی عیسوی میں پہلی

شاعرہ للہ عارفہ اور اس کے ہم عصر شیخ نورالدین ولی نے شیومت اور اسلامی تصوف کے سدا بہار گیت گائے تھے جو واکھیوں اور اشلوکوں کی شکل میں عرصہ دراز گذرنے کے باوجود موسیقی کی ہر محفل کے آغاز میں آج بھی عقیدت واحترام سے گائے جاتے ہیں۔

کشمیری کے ان اولین سخن وروں کے بعد سینکڑوں شاعروں نے سالہا سال تک اس زبان میں مثنوی، غزل، نظم، حمد، نعت، ریختہ اور کئی دیگر اصناف سخن کو متعارف کر کے اس کی شعری دنیا کو بیش بہا سرمائے سے مالا مال کیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک مہجور نے اس حد تک کشمیر سے باہر بھی شہرت حاصل کی تھی کہ ایک بار جب دیویندر ستھیارتھی نے مہجور کے چند نغمے رابندر ناتھ ٹیگور کو انگریزی میں سنائے تو مہا کوی نے کہا کہ اگر مہجور بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو اُسے لگتا کہ مہجور نے اُس کے خیالات کا سرقہ کیا ہے۔ مہجور کو بیرونی دنیا سے متعارف کرانے کا سہرہ بلراج ساہنی کے سر جاتا ہے جس نے ٹیگور کے جاری کردہ شانتی نکیتن سے شایع ہونے والے انگریزی جریدہ ''سہ ماہی وشوا بھارتی'' کے نومبر 1938ء۔ جنوری 1939ء کے شمارے میں شاعرِ کشمیر پر ایک مضمون لکھ کر اس کی چند منظومات کا انگریزی ترجمہ بھی شامل کیا۔ ساہنی نے بعد میں مہجور پر اردو اور کشمیری میں فلم بھی بنائی۔

اس تناظر میں ہمہ گیر طور پر ترقی پسند تحریک نے ہی کشمیری شاعری کو نئی رفعتوں اور عظمتوں سے مالا مال کیا اور یہ شاعری آج ملک کی کسی بھی دوسری زبان کے ہم پلہ قرار ہونے کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس تحریک کو بجا طور پر نئے کشمیر کے تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے کی آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔



ہم عصر کشمیری زبان وادب

مسائل اور امکانات

کشمیری زبان کی صورتِ حال

کسی بھی زبان میں اس کے ادبی امکانات کا جائزہ لیتے وقت لازماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس ادب کا عوامی قبول کس حدتک وسعت پارہا ہے یا اس کے قارئین دن بہ دن کم تو نہیں ہوتے جارہے ہیں؟ یہاں پر واقعی امکانات پر گہری نظر رکھنے اور انھیں ازسرنو پرکھنے کا سوال اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں کشمیر کے ہم عصر ادب کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس کے مستقبل کی ضمانت یعنی اس کا وجود اور ارتقائی منازل طے کرنے کی اس کی سکت کس حد تک مستحکم اور محفوظ ہے؟ موجودہ صورت حال کہہ رہی ہے کہ کشمیری میں شعری اور نثری ادب کا سلسلہ رواں دواں ہے اور اس میں نئے نئے تجربات کیے جارہے ہیں مگر زبان کا کل یعنی مستقبل مخدوش ہی نظر آتا ہے۔

انجمن اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم یونیسکو نے تحقیقی جائزہ لینے کے بعد اپنی دو دستاویزوں میں کہا ہے کہ اکیسویں صدی کے اخیر تک دنیا میں مروج زبانوں میں سے کم از کم نصف زبانیں کالعدم ہو کے رہ جائیں گی۔ اگر چہ ان زبانوں کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے لیکن کشمیری کی موجودہ صورت حال کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو زمانے کی اس دست برد میں کشمیری زبان کی

شمولیت عیاں ہے۔ ہمارے چند خوش فہم اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کی کشمیری زبان کے لیے کونسی نئی آفت اسے صفحہ ہستی سے مٹا سکتی ہے۔

سالہا سال پر پھیلے بیرونی تسلط کے دوران کشمیر میں اگر چہ مختلف ادوار میں زیادہ تر غیر کشمیری زبانوں ہی کو فروغ ملا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسے کسی حاکم یا بادشاہ نے زک پہنچانے کی کوئی حرکت نہیں کی بلکہ وہ اپنے اقتدار کے نشے میں شاہانہ طرز زندگی میں مست و مگن رہے اور اپنی زبان کی پرداخت کے لیے یہاں محمود گامی جیسا بسیار گو شاعر دوش بدوش سخن گوئی کی دنیا کو آباد کرتا رہا۔

اب وہ صورت حال نہیں ہے۔ آج نئی نسل کشمیری تو کیا اردو بھی اس کے مستند اور مستعمل رسم خط میں پڑھ نہیں سکتی۔

زبانوں کے عروج و زوال کی کہانی صرف اس حقیقت ہی کے مدار کے گرد گھومتی رہی ہے کہ اس کے بولنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے۔ اس وقت اگر چہ مدارس میں کشمیری برائے نام درس و تدریس میں شامل ہے لیکن کیا اس کے طلباء گھروں میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں، بالکل نہیں۔

میری نظر میں ایک اہم مسلہ جو ہماری مادری زبان کو دھچکا دینے کا باعث بن سکتا ہے وہ اس کے رسم خط میں کئی خامیوں کا اضافہ کیا جانا ہے۔ 1953ء تک اُس وقت کے ریاستی وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کے دور اقتدار میں اس زبان کے لیے نسخ یعنی عربی رسم الخط کو متعارف کیا گیا اور اسے کشمیر کی تمام سرکاری درس گاہوں میں ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل کر کے نظام تعلیم کا ضروری حصہ بنایا گیا۔ طلباء کے لیے نہایت دلچسپ اور کا آمد کتابیں تیار کر کے انھیں بنیادی سطح کے سارے تعلیمی اداروں میں برائے درس و تدریس تقسیم کیا گیا۔ اگست 1953ء میں جب شیخ سرکار کا تختہ الٹ دیا گیا تو نئی حکومت نے اس رسم خط کو منسوخ کر کے اس کے لیے ایک نیا رسم الخط بنانے کا اقدام کیا جس کی تکمیل کی خاطر

مرزا غلام حسن بیگ عارف کی سربراہی میں جیالال کول، سری کنٹھ توشخانی، محی الدین حاجنی اور پرتھوی ناتھ پشپ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے نسخ کے برعکس نستعلیق طرز کا خط کشمیری زبان کے لیے وضع کیا۔ نسخ خط اس لیے بنایا گیا تھا کہ وہ ٹائپ رائٹر پر بھی چڑھ سکتا تھا۔ الغرض ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت کے مصداق شیخ سرکار کے مروج کشمیری رسم خط کو ہمیشہ کے لیے رد کیا گیا۔ اس کمیٹی نے البتہ اپنی رپورٹ میں واضح الفاظ میں اس بات کی تاکید کی تھی کہ نئے رسم خط کا استعمال کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ کشمیری میں مستعمل عربی اور فارسی کے الفاظ اور تراکیب کو جوں کا توں تحریر کیا جائے اور ان کی شکل بگاڑنے کی ہرگز کوشش نہ کی جائے۔

بدقسمتی سے ہمارے چند نام نہاد اور خود ساختہ ماہرین لسانیات نے نہ جانے کس لیے اس کی شکل وصورت مسخ کرتے ہوئے اس میں غیر مانوس اور بیگانے اعراب کی بھرمار کرلی جو ہمارے لیے بالکل ان جانے اور غیر ضروری ہیں۔ اس رواروی میں شاعر کو شایر بنا کر لکھا گیا۔ بے معنی لحاظ سے عجیب وغریب اشکال کو استعمال میں لایا جارہا ہے۔ آج یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح رسم الخط کو بھاری بھرکم بنا کر اسے نئی نسل کے لیے ناقابل فہم بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اس سے مانوس ہونے سے کتراتے ہیں کیونکہ ان کی یہ رائے برحق ہے کہ زبان کا رسم خط جتنا سہل اور کم سے کم اعراب کا حامل ہو اُتنی ہی اُسے مقبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔ میرے اس موقف کو اس مقالے میں نہیں بلکہ ایک بلیک بورڈ سامنے رکھ کر ہی واضح کیا جاسکتا ہے۔

اس خود ساختہ رسم خط کو اپنانے میں دوردرشن، کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ کشمیری، بورڈ آف سکول ایجوکیشن اور کلچرل اکیڈیمی نے جو طریق کار اپنایا ہے وہ اسے عوام سے دور رکھنے کا باعث بن سکتا ہے۔ دوردرشن کیندر سری نگر سے کشمیری

سکھانے کا جو سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا اور جس پر لاکھوں روپے برباد کیے گیے اس کا کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آسکا ہے کیونکہ اس پروگرام کے پیش کار کشمیری لسانیات کے ماہر ہونے کا دعوی نہیں کر سکتے۔ آج کشمیری طلباء کی اکثر تعداد کشمیری نہیں پڑھ سکتی لہٰذا انھوں نے اس میں بات کرنا بھی ترک کیا ہے۔

کشمیری زبان کے رسم الخط کو عام فہم اور قابل قبول بنائے جانے کے حامی احباب کی رائے ہے کہ اسے از سر نو تشکیل دینے کی غرض سے حکومت کی طرف سے ایک با اختیار کمیٹی بنائی جائے جو اس کام کو صرف دنوں میں انجام دے سکے کیونکہ رسم خط کو اصلی اور صحیح شکل میں لانا چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو کشمیری زبان کے رفتہ رفتہ معدوم ہونے جو سنگین خدشہ لاحق ہے اس کی ذمہ واری ہمیں پر عائد ہوگی۔

اس وقت جو ماحول ہمارے اردگرد پرورش پا رہا ہے اس میں کشمیری زبان کی ترقی اور تشہیر کے مواقع بہت دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ اب تو سرکاری اور نجی درس گاہوں میں کشمیر کی مانوس زبانوں کشمیری، اردو اور انگریزی کے برعکس ہندی زبان کو ایک منصوبہ بند طریقے سے ترویج دی جارہی ہے اور طلباء بھی جوق در جوق اس کی طرف مائل ہوتے نظر آرہے ہیں کیونکہ اُن پر گریجویشن یا ڈاکٹریٹ کے ساتھ ہی ملازمتوں کے دروازے وا کیے جاتے ہیں۔ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ طالب علم جتنی زبانوں سے واقف ہو اُتنا ہی اس کے لیے مفید ہے لیکن اپنی مادری زبان کے تئیں لاپرواہی اور غفلت برتنا اسے فائدے کے برعکس نقصان ہی پہنچانے کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی لیے رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا کہ: ''ایک دانشور اپنی مادری زبان کی ندی کو پار کر کے ہی ابدیت کے سمندر تک جا پہنچ سکتا ہے''۔

ریاستی محکمہ تعلیم کے اعداد وشمار کے مطابق اب کشمیر کے سکولوں۔ کالجوں

اور یونیورسٹیوں میں طلباء ہندی ہی کو ترجیح دیتے ہیں جو انھیں بغیر کسی جد و جہد کے روزگار فراہم کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ ریاستی درس گاہوں میں کشمیری تو ویسے ہی برائے نام پڑھائی جاتی ہے۔ اب تو حالات اس کے خلاف ہونے کا خدشہ مضبوط ہو رہا ہے۔

کسی زبان کی ادبیات میں خواہ تخلیقی میعار کتنا ہی بلند ہو اُس کی بدولت وہ عوام کی زبان نہیں بن سکتی کیونکہ ادب کے عاشق اور پرستار نہائت ہی محدود تعداد میں سماج کے ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور عام آدمی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ادبی تخلیقات کا باقاعدہ مطالعہ کرے حقیقت سے بعید ہے۔

جہاں تک ہمارے کسی شاعر کی بے پناہ مقبولیت کا تعلق ہے تو اس میں مہجورؔ کا مقام کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ وہاں مہجور نے ایک نغمہ یا غزل لکھی یہاں اُس کے مخصوص گلوکاروں محمود شہری اور غفار لوجر نے اسے بستی بستی قریہ قریہ موسیقی کی دُھنوں پر سجا کر زبان زد خاص و عام کیا لیکن اس سے زبان کی تشہیر و تبلیغ کو کوئی مثبت فائدہ نہیں پہنچا۔ زبان کی بقا اور پھیلاؤ کی بنیاد اس کے بولنے والوں کی تعداد پر ہی استوار ہو سکتی ہے۔ اگر ہم کشمیری کی موجودہ صورت حال کو دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ پہلے طلباء کی اکثریت انگریزی کی طرف مائل تھی جو اَب نہیں رہی۔ یہاں اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جہاں اردو یا انگریزی میں اونچی ڈگریاں حاصل کرنے والے امیدوار دہائیوں تک روزگار حاصل نہیں کر سکتے وہاں ہندی زبان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فوری طور پر سرکاری نوکریاں کیسے پیش کی جاتی ہیں؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ کشمیری زبان کو ذرائع آمدن کی شکل دینے کے لیے کسی سطح پر کون سا ٹھوس عمل جاری ہے؟۔

کشمیری ہم عصر ادب اور ''صوفیانہ'' شاعری؟

گزشتہ پچیس تیس سال سے دیکھا جارہا ہے کہ بالعموم کشمیر کے دیہاتی علاقوں میں ایک نئ قسم کی عامیانہ اور بیرنگ شاعری صوفیانہ سخن گوئی کے نام پر ہماری دنیائے ادب پر حاوی ہورہی ہے۔اس شاعری کے تخلیق کار عام طور پر اُمی اور تصوف کے بنیادی نظریہ سے قطعاً ناواقف لوگ ہوتے ہیں جن میں سے کسی ایک نے بھی ہماری بیش بہا صوفی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ وہ بزعمِ خود شمس فقیر، رحمان ڈار یا احمد بٹواری بننے کا خواب نہیں دیکھتے۔

عبدالاحد آزاد نے للہ عارفہ اور شیخ العالم کے کلام کو ہمارے گم گشتہ مگر ایک ترقی یافتہ ادبی دور کا تسلسل قرار دیا تھا مگر زندگی سے شاعری کے ذریعے مفر کی یہ صورتِ حال اسی طرح ہمارے اعصاب پر سوار رہی تو دور حاضر کو اُس زبان کے سات سو سالہ دور زریں کے بعد اس کے زوال پذیر زمانے سے ہی تعبیر کیا جائے گا جس کا ادبی سرمایہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے ادب کے مقابلے پر رکھا جاسکتا ہے۔اس بے معنی سلسلے کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں توہمات اور قبر پرستی کے ایک نئے اور تکلیف دہ دور کا آغاز ہونے کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے جس کی طرف علامہ اقبالؔ نے اشارہ کرتے ہوئے اس ''نجیب، چرب دست اور تر دماغ'' قوم کی خود سے ناشناسی اور فروغ نگاہ سے محرومی کا ماتم کیا تھا جب اس نے کہا تھا:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ　　　　بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے　　　　خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے　　　　نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے

چونکہ اقبال کے رگ و ریشے میں کشمیر کی محبت رچی بسی تھی لہٰذا اُس نے

اس بے حسی کا رونا روتے ہوئے بھی دل سے یہی دعا کی تھی کہ:

ازاں مئے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

کشمیری نثر کے حوالے سے نہایت مختصراً بات کی جائے تو بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قبیل کے ہم عصر ادب نے ہمارے سامنے کوئی شاندار یا لازوال کارنامہ نہیں رکھا ہے۔

آج کے کشمیری شاعر اگر چہ اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق دنیائے سخن گوئی میں کئی تجربے کر رہے ہیں مگر ابھی تک ہمیں ایسی شعری تخلیقات نصیب س شاعری سے تعبیر کر سکیں حالانکہ رواں حالات کے تناظر میں شاعر کے لیے موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ اس دوران مزاحمتی منظومات کے اضافے نے اگر چہ شاعری کو ایک نئی طرح دی ہے لیکن اس نوع کے کلام میں جگہ جگہ ابہام کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اگر یہاں یہ ذکر بھی کیا جائے کہ اسی طرح کئی عامیانہ شعری مجموعوں کو ذاتی مصلحتوں اور حقیر مالی مفادات کی بنا پر ہی ساہتیہ اکادیمی کے اعزازات سے نوازا بھی گیا ہے پھر بھی ہم اس بحث طلب موضوع کو کسی اور موقعے پر اٹھائے رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔



کشمیر میں اردو صحافت

مسائل اور امکانات

کشمیر میں اردو صحافت کا آغاز بالواسطہ طور پر انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اُس وقت ہوا جب ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی رہبری میں عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور کشمیر میں بھی جموں کے مہاراجوں کے شخصی راج کے خلاف تحریکِ حریت پر تول رہی تھی۔ 13 جولائی 1931ء کو جو خونین واقعہ سری نگر کی سنٹرل جیل کے باہر پیش آیا جب سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں دو درجن کے قریب نہتے کشمیری گولیوں سے بھون ڈالے گئے تو وہ اس تحریک کا سنگ میل قرار پایا اور اس کی گونج سارے برصغیر میں سنائی دی۔

اُن دنوں لاہور غلام کشمیر کے مظلوم و مقہور عوام کے بہی خواہوں اور ہمدردوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کا بھی اہم ترین مرکز تھا جہاں تحریک حریت کشمیر کے علمبردار مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت اور شورش کشمیری زمیندار، سیاست، انقلاب، کشمیری میگزین اور چٹان جیسے عہد ساز اخبارات کے صفحات پر برصغیر کی تحریک آزادی کے حق میں پُر جوش اور باا ثر مضامین، مقالات اور منظومات سے ہر ایک کا فکر و ذہن گرما رہے تھے۔ ان اخباروں کے مدیران نے کشمیر کا درد محسوس کیا اور اسے اپنے قلم کی آواز بنا کر یہاں کے جبر و استبداد تلے کراہتے عوام کا حال

زار ہر ایک کو سنایا۔ اگر چہ ان اخبارات کی جائے اشاعت لاہور ہی رہی لیکن ان میں تقریباً ہر صفحے پر دردِ کشمیر جھلک رہا تھا۔

تحریک آزادئ کشمیر کے ان بہی خواہوں اور محبان نے اپنے اخبارات کو کشمیر کے لیے اس شدت سے وقف کیا تھا کہ ان میں سے ہر اخبار پر کشمیر نامہ کا گمان ہوتا تھا۔ بالخصوص مولانا ظفر علی خان زمیندار میں وقتاً فوقتاً کشمیر میں شخصی راج کے ظلم و جبر اور استبداد کے خلاف جو پُر جوش اور ولولہ انگیز منظومات تحریر کرتے رہے وہ سارے کشمیر میں دیر تک زبان زد خاص و عام ہو چکی تھیں۔ یہ تینوں اخبارات ہر روز راولپنڈی کے راستے سینکڑوں کی تعداد میں کشمیر بھیجے جاتے تھے، ان کے شوقین اخبار بین ان پر ٹوٹ پڑتے تھے اور دن بھر ذوق وشوق کے ساتھ ان کے مطالعہ سے محظوظ ہوتے تھے۔ مقامی طور پر کوئی قابل ذکر اردو اخبار موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہی لاہوری اخبارات یہاں کی صحافتی دنیا میں روزمرہ کے مطالعہ کا ایک مقبول ذریعہ بن گئے تھے۔

جولائی 1931ء کا دن، جو اب یوم شہدائے کشمیر کہلاتا ہے، چند کشمیری اہل دانش اور اصحاب قلم کے لیے اردو صحافت کی طرف بھی متوجہ ہونے کا باعث بن گیا۔ چند سال بعد مولانا محمد سعید مسعودی اور پریم ناتھ بزاز نے یہ ضرورتِ وقت ہاتھ میں لی اور اس طرح سے ہندوستان کی تقسیم کے آس پاس سرزمین کشمیر سے دو شاندار اور معیاری اخبار خدمت اور ہمدرد کے نام سے منظر عام پر آ گئے۔

ان اخباروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کے مدیران پڑھے لکھے اور اردو زبان سے کما حقہ واقف تھے۔ ملکی کوائف وصحائف پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی نے ان دونوں شخصیات کو مقامی طور پر ثقافتی اور صحافتی لحاظ سے نابغۂ روزگار بنایا تھا۔

1946ء میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کے

ساتھ یہ دونوں اخبارات بعد میں سیاسی لحاظ سے الگ الگ راستوں پر چل پڑے۔خدمت جہاں باضابطہ طور پر شیخ صاحب کی نیشنل کانفرنس کا ترجمان اور تحریک کا پُر زور مبلغ بن گیا وہاں پریم ناتھ بزاز نے راہِ دگر اختیار کر کے کشمیر چھوڑ دو تحریک کی مخالفت میں یہاں کے چند قلم کاروں عبدالاحد آزاد اور میر عبدالعزیز کی قلمی خدمات بھی حاصل کیں جنھوں نے شیخ صاحب کی ذات تک کو نہیں بخشا اور ان کی مخالفت میں ایسی مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں تحریر کیں جو شیخ مخالف حلقوں میں نہایت مقبول ہوئیں۔ بزاز کے خیال میں شیخ صاحب کی تحریک نامعقول اور مبنی بر حقائق نہیں تھی کیونکہ مہاراجہ ہری سنگھ خود ریاست کا پشتنی باشندہ تھا اور اسے کشمیر چھوڑ دینے کی دھمکی دینا ایک ناقابل فہم بات تھی۔ خدمت اور ہمدرد کے لیے اس وقت کے چیدہ چیدہ قلم کار اور ادیب بھی شذرات، سیاسی تبصرے اور مختصر مضامین لکھتے رہے جس سے ان کی معنوی حیثیت کو وقار ملا۔ اس طرح سے خدمت اور ہمدرد کا دورِ گذشتہ آج بھی ہماری یادوں میں آباد ہے۔

1947ء کے بعد کشمیر میں اردو صحافت محض چند بے قاعدہ اور غیر معیاری روزناموں یا نام نہاد ہفت روزوں تک ہی محدود رہی جن کا کوئی مثبت اثر قارئین کے ذہنوں نے قبول نہیں کیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان جرائد نے اپنے آپ کو برسرِ اقتدار سیاسی تنظیم کے ساتھ وابستہ کیا تھا جس کے عوض انھیں چند روپے بھی ملتے تھے لیکن ان کے صفحات پر غیر جانبدار اور مبنی بر حقیقت خبریں اور تبصرے نہ ہونے کی بنا پر ان کی افادیت کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ ان کی باقاعدگی اور اشاعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ عام طور پر مفت ہی تقسیم کیے جاتے تھے۔اس طرح یہاں کی صحافت مقصدیت کی راہ سے ہٹ کر مکمل طور پر ایک ایسی عامیانہ اور بے رنگ سیاست میں ڈھل گئی جس میں

حریفوں کی پگڑی اچھالنا، غیر مقبول حکومت کی قصیدہ خوانی اور ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے ہر غلط قدم کو حق بجانب قرار دینا شامل تھا۔

بزاز کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ 1947ء سے قبل ہی ریاستی اخباروں پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں اور ان کی خلاف ورزی کے نتیجے میں صحافیوں کو سزائیں بھی سنائی جاتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مہاراجہ ہری سنگھ کی جمہور کُش پالیسی اگست 1947ء کے وسط میں پوری طرح واضح ہوگئی جب یہاں انسانی حقوق پر شب خون مارا گیا۔ مہاراجہ کی طرف سے بادامی باغ کی فوجی چھاؤنی میں عبداللہ سے مفاہمت کے بعد سرکار نے مکمل طور پر آزادئ تحریر و تقریر کو دبانا شروع کیا۔ دارو گیر کا یہ سلسلہ خاص کر اُن علاقوں میں زور پکڑتا گیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کشمیر مسلم کانفرنس کے اخباروں ملت اور جوہر کی اشاعت بند کردی گئی۔ روزنامہ ہمدرد، کشمیر ٹائمز اور ہفت روزہ اصلاح کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہر لفظ کی اشاعت سے قبل اسے سرکار کے پبلسٹی افسر سے سنسر کرائیں''۔ بزاز نے یہ شکایت بھی کی کہ اس کے ہمدرد کی کاپیاں اسے بیچنے والوں کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لی گئیں۔ انھیں برسرعام نذر آتش کیا گیا اور پولیس خاموش تماشائی بن کے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔

اُن دنوں مقامی سطح پر غلام رسول عارف کے ہمدرد، کشیپ بندھو کے دیش، غلام رسول عرفانی کے نیا سنسار، یووک سبھا کے مارتنڈ اور مرزائیوں کے ترجمان اصلاح کا نام بھی چند برس تک سنا گیا لیکن وقت کی بادِ مخالف کے تھپیڑے کھا کھا کر یہ شجر بھی مرجھا گئے۔

کشمیر میں بدقسمتی سے یہ غیر صحت مند سلسلہ سالہا سال تک جاری ہے کہ اردو کی صحافتی دنیا سے متعلق اکثر صحافی کسی درس گاہ یا دانش گاہ سے اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہی رہے ہیں اور نہ ہی انھوں نے ذاتی طور

پر اسے لسانی تناظر میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ مولانا مسعودی، میر غلام احمد کشفی، غلام رسول نازکی اور شمیم احمد شمیم جیسے اردو شناسوں کو یہ ودیعتِ خداوندی فطری طور پر عطا ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے ہمارے یہاں ایسا کوئی سرکاری تدریسی ادارہ بھی کبھی موجود نہیں رہا جہاں صحافت کے طلبا یا اس اہم پیشے سے وابستہ اشخاص کو اردو زبان کی ایسی تربیت دی جائے کہ وہ لسانیات، محاورات ، تراکیب، املا، تذکیر و تانیث اور گرامر کے حوالے سے صحیح زبان کا استعمال کر سکیں۔ پچھلی صدی کے وسط میں شہر میں اورینٹل کالج کے نام سے ایک ایسا تعلیمی ادارہ سرگرم عمل تھا جو نا معلوم وجوہات کی بنا پر جلد ہی بند ہو گیا۔

کشمیر میں چونکہ اردو زبان میں ہی سب سے زیادہ اخبارات شائع ہوتے ہیں لہازا ان طلباء کے لیے یہاں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے شعبہ اردو سے منسلک ایک ایسا ہی تدریسی سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے جہاں سر کردہ اور پختہ مشق صحافی شوقین طلباء کو صحافت کے مختلف تقاضوں کی برآوری سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ آج تک اس اہم ضرورت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1925-1885) نے اردو کی اہمیت کو زیر نظر رکھ کر اسے 1889 میں ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ 1956ء میں جب ریاست کا آئین منظور کیا گیا تو قانون ساز اسمبلی نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی توثیق کر لی۔ اس طرح آئین کی دفعہ 145 کے تحت یہ توثیق اس طرح ہوئی:

"The official language of the State shall be Urdu but the English language shall, unless the legislature by law provides, continue to be used for all the official purposes of the State for which it was being used immediately before the commencement of this Constitution."

اس آئینی حقیقت کے باوجود اردو کا جو حالِ زار سامنے ہے اسے بیان کرنے سے کوئی فایدہ نہیں۔

1947ء کے کچھ سال بعد خواجہ ثنا اللہ بٹ نے آفتاب اجرا کیا اور اس کے بعد سری نگر ٹائمز کی اشاعت کے ساتھ مقامی طور پر عوام میں اخبار بینی کا شوق دوبارہ پیدا ہوا۔ یہ ان اخبارات کے مالکان اور مدیران کی انتھک مساعی ہی کا نتیجہ ہے کہ یہی دو روزنامے آج بھی اشاعت اور مقبولیت کے لحاظ سے کشمیر میں سرِفہرست ہیں۔ سری نگر ٹائمز میں مسلسل طور پر چھپنے والا میں برمحل اور پر معنے کاٹون اس اخبار کی شہرت کو واقعی چار چاند لگا رہا ہے۔

کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت قائم ہونے سے سے کئی نوجوان طالب علم اس میدان میں ضروری تربیت حاصل کر کے اخبارات، ٹیلیوژن، مقامی، ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے اداروں سے منسلک ہو کر اپنی روٹی روزی عزت کے ساتھ کما رہے ہیں۔ مگر یہ شعبہ صرف انگریزی کی تعلیم و تدریس تک ہی محدود رہا اور اردو صحافت اس سے کوئی استفادہ حاصل کرنے سے محروم ہی رہی۔

گذشتہ تقریباً تین دہائیوں سے کشمیر میں اردو صحافت کو خاصا فروغ ملا۔ لوگوں میں ہر صبح اخبار بینی روزمرہ کی عادت بن گئی اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اخباروں کی تعداد بھی ضرورت سے زیادہ رفتار سے بڑھتی گئی اور بڑھ رہی ہے۔

ان اخباروں کے درپیش گوناگون مسائل ہیں جن میں سے اکثر ان کے خود پیدا کردہ ہیں۔ ریاستی محکمہ اطلاعات بھی ایک عالمِ رواروی میں قانونی طور پر مطلوبہ کارروائی کئے بغیر نو زائیدہ اخباروں کو اشتہارات کی فہرست میں شامل کر کے غیر صحت مند اخبار نویسی کی حوصلہ افزائی کرنے کا بھی مرتکب ہو رہا ہے۔ مدیران کے حوالے سے دیکھا گیا ہے کہ ان میں کبھی کبھی پاکستانی

اخباروں کے اداریے ہو بہو نقل کر کے اپنے تحریر کردہ اداریوں کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں۔اور جہاں پر زبان کی صحت کا تعلق ہے تو بار بار رسم کو مذکر اور سنگ کو مونث باندھا جاتا ہے۔یعنی کتاب کا رسم اجرا کیا گیا اور عمارت کی سنگ بنیاد ڈالی گئی۔

اب تو خبروں پر اشتہاروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔یہ صحیح ہے کہ اشتہار اخبار کی بقا کے لیے خاصی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اخبار کا ماخذ خبر ہے اور اگر اس میں ضروری اور اہم خبریں نہ ہوں تو اسے کونسا نام دیا جاسکتا ہے؟ اکثر نئے اردو اخباروں کی تعداد اشاعت بھی نہایت محدود ہے۔اسی لیے یہ کسی اخبار فروش کے یہاں نظر نہیں آتے البتہ اشتہارات کے قواعد پورے کرنے کی خاطر محکمہ اطلاعات کے لیے چند پرچے اور بچے کھچے شمارے مفت بانٹنے کے لیے چھاپے جاتے ہیں۔ان میں سے کشیر تعداد میں اخباروں کے لیے موقعہ پر کسی واقعہ کو دیکھنے، اس کا تجزیہ کرنے ،متعلقہ فریقین کا نقطہ نظر سننے اور غیر وابستگی سے تحقیقات کرنے کے لیے نامہ نگار بالکل موجود نہیں۔ اس تناظر میں خبریں یا تو انٹرنیٹ سے اخذ کر کے یا حکومتی اور سیاسی تنظیموں کے پریس نوٹوں کی شکل میں حرف بہ حرف چھاپی جاتی ہیں اور صحافتی ذمہ واریوں کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔کئی اخباروں کے بارے میں یہ گرم افواہیں بھی چارسوگشت کررہی ہیں کہ انھیں چند مخصوص ایجنسیوں سے مسلسل طور پر مالی معاونت حاصل ہورہی ہے۔ورنہ اخبار کا ایک شمارہ جس کے صفحات رنگین چھپتے ہیں، اگر دس روپے کی لاگت سے تیار ہو جائے تو اس کی قیمتِ فروخت تین روپے رکھنے میں بھلا کیا تُک ہوسکتی ہے؟ اب تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے کئی نام کے اخبار شہر کی دکانوں پر برائے مفت تقسیم رکھے جاتے ہیں اور سوداسلف خریدنے والے گاہک اس مالِ مفت کو بھی ہاتھ میں

تھما کر گھر میں ردی کاغذوں میں پھینک دیتے ہیں۔

ریاست کا محکمہ اطلاعات بھی اشتہاروں کے حوالے سے خود ہی سرکاری ضوابط اور قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ حکومت نے جو پالیسی اس سلسلے میں وضع کی ہے اس کی رو سے ایک روزنامے کو صرف اسی وقت اشتہارات دئے جاتے ہیں جب اس کی اشاعت چھ مہینوں تک باقاعدہ ہو اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نظر نہ آئے۔ ہفتہ وار اخباروں کے لیے یہ مدت ایک سال رکھی گئی ہے۔ لیکن اب دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر آج اخبار شروع ہوا تو کل ہی سے اسے اشتہارات سے نوازا جاتا ہے۔ ظاہر کہ اس کے پس پردہ لین دین کا عمل ہی کارفرما ہوگا۔

وادیٔ کشمیر سے اس وقت اردو زبان میں ایک سو چودہ اخبارات شائع ہوتے ہیں جن میں روزناموں کی تعداد پچھتر ہے اور انتالیس جریدے ہفت روزوں کی شکل میں منظر عام پر آتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ آمدنی کا زیادہ تر انحصار سرکاری محکمہ جات کی طرف سے جاری کیے گئے اشتہارات کے معاوضے پر ہی ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق ان میں سے فقط 67 کو حکومتی اشتہاروں کے لیے منظور کیا گیا ہے۔ باقی سینتالیس اخبارات، جن میں سے کئی ایک سے لوگ واقف بھی نہیں، کس طرح اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان کے مالکان یا مدیران ہی دے سکتے ہیں۔

سیاست کی طرح صحافت بھی ایک ایسا پیشہ بن چکا ہے جسے اختیار کرنے کی خاطر کسی علمی قابلیت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ اس کا منفی نتیجہ لازماً یہی ہوسکتا ہے کہ آج کے ہمارے نئے اردو اخبار اس صنف میں کوئی مثبت اضافہ کرنے سے قاصر ہی رہے ہیں اور ایسے اخباروں کے وجود یا عدم وجود سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس قبیل کی اخبار نویسی بہ قامت

بہتر اور بہ قیمت کہتر سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

پچھلی نصف صدی سے جو اردو اخبار کشمیر سے اشاعت پذیر ہیں ان میں سے بھی سبھی نے عوام میں پذیرائی حاصل نہیں کی ہے۔ایک اخبار کی ممکنہ کامیابی کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔اول یہ کہ اس کا اداریہ اور انتظامیہ دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر کے انھیں ایک دوسرے کے کام میں مداخلت کی اجازت کے بغیر اپنا فریضہ انجام دینے کی آزادی حاصل ہو یعنی انتظامیہ کو اخبار کے مالی اعتبار اور معاشی استحکام کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی اور اس ضمن میں بازار میں اس کی فروختگی اور مقبولیت اولین حیثیت رکھتے ہیں۔اداریہ بنیادی کام اخبار کو معنوی اور صوری لحاظ سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔مزید برآں ہر خبر اور مضمون یا تحریر کو بغور پرکھنا لازمی ہے مبادا اس سے کسی فرد یا تنظیم یا جماعت کی دل آزاری ہو۔ اصل خبر کو کسی صورت میں نظر انداز نہ کیا جائے۔اس وقت کئی ایسے نئے اخبار ہمارے سامنے ہیں جن کے مالکان یا مدیر پہلے سیاست دان یا سیاسی جماعتوں کے زرخرید بن جاتے ہیں۔اور جو خبر، خواہ وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، ان کے ذاتی نظرئے سے میل نہ کھاتی ہو اُسے ردی کی نذر کیا جاتا ہے۔مختلف تقریبات کے سلسلے میں بھی مدیران اُن شخصیات کا مناسب ذکر کرنے میں ذاتی تعصب کے غلام بن جاتے ہیں جن کی موجودگی ایسی محفلوں کی شانِ زیبائی ہوتی ہے۔ آداب صحافت کی دنیا میں اس طریق کار کو سرے سے ہی رد کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اخبار کی باقاعدہ اشاعت ایک اہم بات ہے جس کی بدولت قاری کو کوئی بھی اخبار متواتر طور پر زیر مطالعہ رکھنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ آج کے اردو اخباروں کا حال یہ ہے کہ اگر ان میں سے اکثر و بیشتر کے لیے سرکاری اشتہاروں یا خفیہ طور وصول کردہ مالی اعانت کا سلسلہ منقطع ہو جائے یا وقتی طور پر رک جائے تو اگلے دن ان کا وجود بھی باقی نہیں رہ پائے گا۔اس پس منظر

میں ہم آج اُنھی دو کامیاب روزنامہ اخباروں کا نام زبان پر لا سکتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

ہم عصر اخباروں میں خبریں بھی مالک یا مدیر کی ذاتی پسند یا ناپسند کو ملحوظ نظر رکھ کر جگہ پاتی ہیں حالانکہ ایسا کرنا صحافتی بے ایمانی کے مترادف ہے۔ پریم ناتھ بزاز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کشمیر چھوڑ دو تحریک کے دوران شیخ صاحب کے ساتھ ان کے شدید اختلافات منظر عام پر آچکے تھے لیکن بزاز نے صحافت کے پیشے کا تقدس سامنے رکھتے ہوئے ایماندانہ اور دیانتدارانہ طریق عمل کو اس طرح جاری رکھا کہ اپنے حریف شیخ صاحب کے خلاف بغاوت کے مقدمے کی روئداد حرف بہ حرف اپنے اخبار میں مسلسل طور پر شائع کرتے رہے۔

کشمیر میں اردو صحافت کی آبیاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس شعبے میں اردو زبان پر عبور رکھنے والے سامنے آئیں جو اس عمل کو تجارت سے زیادہ ایک مشن کی صورت میں تقویت بخشیں۔ خبروں سے کسی نوع کی جانبداری نمایاں نہ ہو اور پڑھنے والا اسے ایک حق پرست اور بے لاگ سرگرمی کی صورت میں قبول کرے۔ نئے اخباروں کے تئیں سرکار قوائد اور ضوابط کی جس خود عاید کردہ خلاف ورزی پر نا قابل فہم خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے اس کی نشان دہی کرنا اور مناسب اقدامات کرنا بجائے خود اخباروں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر صحت مند روایات کے ساتھ صحافت کے احیأ کی ضرورت ہے تاکہ سرکاری سطح پر تغافل کی شکار اردو زبان کو بھی اس شعبے کی بدولت زندگی کا سانس لینے کا موقعہ حاصل ہوتا رہے۔ یہ صحیح ہے کہ یوپی، بہار اور دہلی کی طرح کشمیر میں اردو کا گلا گھونٹنے کی کوششیں نہیں کی گئیں مگر اس زبان کے تئیں حکومتی غفلت شعاری اس کی ترقی میں ہمیشہ مانع رہی ہے۔

ملکی سطح پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی کم و بیش ایسا ہی حال

ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی اردو اخبار سارے ملک میں اپنی قبولیت قائم نہیں کرسکا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ملک میں خاص طور پر نئی نسل کے لوگ اردو سے دن بدن نا آشنا ہوتے جارہے ہیں اور وہ اپنی اس مادری زبان سے اپنا رشتہ توڑ چکے ہیں۔ ہندی سیکھنے، پڑھنے اور بولنے کی مجبوری کو اردو دانوں کے لیے ہر سطح پر ایک لازمی امر بنایا گیا ہے۔ ثانیاً یہ کہ اردو صحافت کو ساہو جین، برلا اور گوینکا جیسے کروڑ پتی تجارتی اداروں کا سہارا نصیب نہیں ہوسکا اور اسی بنا پر کوئی بھی اردو اخبار انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز یا ٹائمز آف انڈیا نہیں بن سکا۔ نہ ہی ٹائمز آف انڈیا کا گیان پیٹھ ایوارڈ یا ہندوستان ٹائمز کا سرسوتی سمان انعام کسی اردو ادارے کی طرف سے شروع کیا جاسکا۔ دنیا بھر میں ان بڑے اخباروں کی پذیرائی کی یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ان کی زبان انگریزی ایک عالم گیر زبان ہے۔ ہر طرف سے بے اعتنائی کی شکار اردو کو اس قبیل کے اُن مالیاتی ادروں کی سرپرستی کبھی نصیب نہیں ہوسکی جواب بھی یہی باور کراتے رہے ہیں کہ یہ اصل میں مسلمانوں ہی کی زبان ہے اور اس کی جگہ کہیں اور ہونی چاہیے۔ اب تو اردو کے حوالے سے یہ صورت حال سامنے آئی ہے کہصوبوں میں رفتہ رفتہ اردو مدارس کو بند کیا جارہا ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں اساتذہ اور طلباء اس زبان میں تعلیم پانے سے محروم ہوجائیں گے۔

کشمیر میں موجودہ اردو صحافت کی بہر حال یہ ایک مثبت دین ہے کہ پڑھنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جس کی توقع آج سے نصف صدی قبل مشکل سے کی جاسکتی تھی۔

اس مضمون میں جموں کی اردو صحافت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جہاں سوائے ایک کے باقی سبھی اخبار اور جریدے برائے نام ہی شائع ہوتے ہیں۔ جنہیں بصورت دیگر بھی نام نہاد اخبار ہی کہا جاسکتا ہے۔ جموں سے تو اب انتہا

پسندوں نے اردو کو دیس نکالا ہی دیا ہے۔ اسی طرح ہفت روزہ جریدوں اور برقیاتی صحافت یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بھی زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔

اردو صحافت کے بنیادی لوازمات سے ناآشنا اور اس پیشے کو محض تجارت کے مقاصد پورا کرانے کی غرض سے اس میدان میں کودنے والوں سے میں اخیر پر یہی کہوں گا:

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہنا
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

(2014 میں تحریر شد)

☆☆☆

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو رُباعی

رُباعی عربی زبان کے لفظ ربع سے ماخوذ ہے، جو چار کے عدد کی خاطر استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے رُباعی کی صنف سخن بھی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ رُباعی گوئی سخن وری کی سب سے مشکل صنف ہے، کیونکہ اس میں شاعر کے لیے اپنے کمالِ فن سے گویا سمندر کو کوزے میں بند کیا جانا مقصود ہے۔ رُباعی شاعری کی اصناف میں ایک مشکل ترین صنف ہے جس میں اظہار خیال کی برجستگی کے لیے شاعر کو فنی باریک بینی اور کمالِ فن سے کماحقہ واقف ہونا چاہیے۔ ایک مختصر بحر کے چار مصرعوں پر مشتمل یہ صنفِ سخن ایک ہی رُباعی میں ایک ایسے جہانِ معنی کو سمو دینے کا تقاضا کرتی ہے جس کا اظہارِ خیال کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل نظم میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن رُباعی میں مصرعوں کی پابندی اور وزن کی تنگ دامنی کے باوجود جو سخن گو اس میدان میں کامیاب تجربے کا حوصلہ رکھتے ہوں وہی اس تنگ دامن مگر بے حد اثر کُن شاعری کے زمرے میں اپنی فنی مہارت اور فکری نزاکت کے جلوے دکھاتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے رُباعی کے مقبولِ عام وزن کی دریافت کے بارے میں یہ واقعہ درج کیا ہے:

''اہلِ ادب اور اہلِ تذکرہ، ان کا خیال ہے کہ رُباعی اتفاقیہ ایجاد کا نتیجہ ہے، اس کے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ غزنین یا سجستان کے کسی شہر میں چند لڑکے گولی کھیل رہے تھے۔ ایک گولی لڑھکتی ہوئی سوراخ کے پاس آئی۔ اس

پر خوشی کے عالم میں ایک لڑکے کے منہ سے بے ساختہ نکلا ؎

غلطاں غلطاں ہمے رود تا بن کو

(کس طرح یہ گولیاں بچوں کے ہاتھوں سے لڑھکتی ہوئی جارہی ہیں)

اتفاق سے کوئی صاحب ذوق وہاں کھڑا تھا۔ اس کو یہ وزن بہت پسند آیا۔ اُس نے اس کا وزن عروضی دریافت کیا اور پھر وہ شعراء میں مقبول ہوکر رواج پذیر ہوا۔ مزید معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ بحر ہجز کی ایک قسم ہے"

چونکہ ندوی نے اس واقعے کے محل وقوع کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن گمان ہے کہ عربستان کے برعکس عجم میں رونما ہوا ہوگا، کیونکہ بچے کے منہ سے جو مصرعہ نکلا وہ عربی میں نہیں بلکہ فارسی میں ہے۔

رُباعی کے لئے جو کئی اور اوزان مقرر کیے گئے ہیں اُن سبھی کے لیے کشمیری زبان کی شاعرانہ دنیا اجنبی سی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ یہاں کے مقامی رنگ میں ڈھل کر لوک ادب کے گیتوں اور نغموں سے آباد ہے۔

رُباعی کا فن اگر چہ عربی سے ہی ادبی دنیا میں وارد ہوا، لیکن اسے فارسی میں ایسی پذیرائی نصیب ہوئی جس کی بدولت اس زبان نے عظیم رُباعی گو ابوسعید ابوالخیر، رودکی، حافظ، جامی، سعدی اور عمر خیام جیسے اساتذۂ فن پیدا کیے۔

یہ ایک قدرتی کارنامہ ہے کہ ان سبھی شعراء میں صرف عمر خیام ہی کو رُباعی نویسی سے شہرۂ دوام حاصل ہوا۔ خیام کی رباعیوں میں ہمیں حیاتِ فانی، مئے ارغوانی اور عشق جاودانی کی تصاویر ایک خوبصورت عکس کی صورت میں نظر آتی ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں رُباعی گوئی کو کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں ہوسکا، کیونکہ اس صنف میں شعراء کی مساعی کو فنی اعتبار سے درمیانہ درجے کی

شاعری سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ غالباً اس کی یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ رُباعی کے اوزان میں سے اس کی قبول عام بحر لاحول ولاقوۃ الا باللہ کو اثر انگیزی اور معنی آفرینی کے ساتھ ورطہ تحریر میں لانے میں ہمارے شاعر اُس شاعرانہ مہارت اور فن کاری پر ید طولی نہیں رکھتے تھے جس کی وہ متقاضی ہے۔

اُردو رُباعی گوئی میں جموں کے شعراء میں کون کون سے احباب شامل ہیں، اس کا ذکر اس مقالے میں نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے اس نوع کے کلام کا کوئی نمونہ ہمیں دستیاب نہیں ہوسکا۔ البتہ کشتواڑ کے ایک رُباعی گو کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کی چند رُباعیات جموں میں ہی ایک تقریب کے دوران نظر سے گزریں۔ اس لحاظ سے زیر نظر مقالے میں زیادہ تر وادیٔ کشمیر ہی کے سخن وروں کے تذکرے پر اکتفا کی گئی ہے۔

اُردو میں کشمیر کے جن شاعروں نے رُباعی گوئی میں طبع آزمائی کی ہے اُن میں میر غلام رسول نازکی، شہہ زور کشمیری، فرید پربتی، حکیم منظور، رفیق راز وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ البتہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں مجموعی طور پر رُباعیات کے حصے کو نہایت کمزور اور کسی حد تک بے اثر کہا جاسکتا ہے۔ اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے غلام رسول نازکی نے ایک قابل قبول اور آسان بحر میں رُباعیات لکھنے کا آغاز کیا۔ اس میں وہ اس طرح کامیاب ہوئے کہ اُن کی کشمیری رُباعیات اپنے معیار، حسن اسلوب اور معنی آفرینی کی بدولت ان کے سارے اُردو کلام پر حاوی ہیں۔

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، نازکی کی اُردو رُباعیات میں اُس اثر انگیزی کا دم خم موجود نہیں جو قاری کو ان کی اپنی مادری زبان میں تحریر کردہ اس صنف میں نظر آتی ہے۔ پھر بھی ان کی اُردو رُباعیات قدرے بہتر کہلائی جاسکتی ہیں۔ اس کلام سے یہ تین نعتیہ رُباعیات مثال کے طور پر پیش ہیں:

سحر کا وقت ہے بیدار ہے دلِ آگاہ
نزول رحمتِ پروردگار پر ہے نگاہ
درود خوان ہیں گل و خار و یاسمین و گیاہ
کلی کلی کی زباں پر ہے یا رسول اللہ

-

ہمیشہ عرش سے آگے رہی میری پرواز
میرا وجود ہے ابنائے جنس میں ممتاز
میری نگاہ میں ہموار ہیں نشیب و فراز
ہے دل میں جب سے تمنائے خاکِ پاکِ حجاز

-

تجھے خبر نہیں عالی مقام ہوں میں
مثیلِ خضر علیہ السلام ہوں میں
جہانِ لوح و قلم میرے زیرِ فرماں ہیں
محمدؐ عربی کا غلام ہوں میں

غلام قادر شہہ زور کشمیری کے کلام کا انتخاب فرید پربتی نے مرتب کیا ہے جس کے پیش نامے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ ''شہہ زور کشمیری پچھلے تیس بتیس سال سے شعروادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور اس فن پر قدرت حاصل کرنے میں انھوں نے اتنی ریاضت کی ہے کہ اب نہ صرف کشمیر بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے سخن وروں میں انھیں استادی کا مرتبہ حاصل ہوگیا ہے''۔

اس مختصر سے مجموعے میں شہزور کی نظمیں، غزلیات اور قطعات شامل ہیں، جن میں سے اس کی تخلیق کردہ رباعیات کی کل تعداد صرف پانچ ہے۔ لہازا

ان نصف درجن سے بھی کم رباعیات کو یہاں پر من وعن نقل کرنا موزوں ہوگا:

بے سود ہے تہدید عقل و دانش
اور رہنما کی یہ جد و جہد و کوشش
ٹھوکر ہی سکھاتی ہے سنبھل کر چلنا
تقویٰ ہے حقیقت میں شعور لغزش

-

اے بے خبر از موجود و لا موجود!
ہیں دہر میں لاکھوں دنیا نا شہود
محدود جہاں ہو یہ ناممکن ہے
اک ذرہ نہیں ہے اس دنیا میں محدود

-

لوگوں کی طبایع ہے خرافات پسند
یہ کیسے کریں گے میرے ابیات پسند
اے سوزِ نفس نہ کر مجھے گرم نوا
اس بزم میں ہے کس کو حق بات پسند

-

جب یاد مجھے منزل کی آتی ہے
تو روحِ تمنا تک تھراتی ہے
بے ساختہ آتا ہے زباں پر اک نام
اور میری جبینِ دل جھک جاتی ہے

-

مذہب سے نہ فطرت کے آئین سے پوچھ
یہ بات عبث تو نہ شیاطین سے پوچھ
بدامنی دنیا کا باعث اے دوست
اپنے ہی خردساز قوانین سے پوچھ

حقیقت یہ ہے کہ اگر غور سے ان رُباعیات کی تقطیع کی جائے، تو ان میں بھی کئی جگہوں پر بحر اور وزن کا سُقم نظر آئے گا۔

حکیم منظور ایک بسیار گو شاعر تھا جس کے درجن بھر اُردو دواوین منظرِ عام پر آچکے ہیں، اگرچہ اسے ملک کی دنیائے ادب میں وہ پذیرائی نصیب نہ ہوسکی جس کا وہ مستحق تھا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے فخر اور مسرّت ہورہی ہے کہ منظور میرے شاگردوں میں شامل تھا۔ سرینگر کے قدیم شہر میں ایک ہی علاقے میں رہنے کی وجہ سے وہ تقریباً ہر روز میرے گھر آتا تھا کہ میں اُس کے اُردو کلام پر ایک ناقدانہ نظر ڈالوں۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا کلام کئی لحاظ سے فنی پختگی کا حامل تھا اور شاذونادر ہی مجھے اس کے کسی شعر یا مصرعے کی نوک پلک سنوارنے کا موقع نصیب ہوا۔ منظور کی رُباعیات کا مجموعہ ''چہار ضرب'' کے عنوان سے اُس کے بعد از مرگ منظرِ عام پر آیا۔ یہ رُباعیات اُسی مجموعے سے لی گئی ہیں:

دل میں اُترا قابلِ صد دید ہوا
میرے ہر اظہار کی تمہید ہوا
کچھ اور چھپا اور بھی بیتاب کیا
کچھ اور کھلا لفظ تو تجرید ہوا

غلام نبی بٹ المتخلص بہ فرید پربتی نے اپنے خیالات، جذبات، محسوسات

اور تاثرات کے اظہار بیان کے لیے پسندیدہ موضوعات سخن میں سے رُباعی ہی کو منتخب کیا۔ کشمیر کی ادبی دنیا میں فرید کو انھی رُباعیات کی بنا پر جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ فرید نے اردو شاعری کے کئی مجموعے شائع کیے ہیں، جن میں اس کا مجموعۂ رباعیات ''فریدنامہ'' بھی شامل ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے فرید کی رباعیات پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ''کلاسیکی ادب پر غیر معمولی نگاہ ہونے کی وجہ سے فرید نے اس صنف کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ انھیں الفاظ کے انتخاب کا بھی سلیقہ ہے اور فن رُباعی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھوں نے نہایت دلکش اور پیاری رُباعیاں کہی ہیں''۔ جاوید نے کرشن کمار طور کی اس رائے کا بھی حوالہ دیا ہے کہ ''رُباعی گوئی پر کسی نہ کسی وجہ سے کم توجہ کے دور میں فرید پربتی کا اس اہتمام سے رُباعی کہنا اُردو شاعری کے لیےفال نیک ہے''۔

فرید کے یہاں رُباعیات میں اگرچہ محسوسات کے اظہار کی بھرپور شدت موجود ہے مگر اسے ایک زوردار شعری اثر کی شکل دینے میں وہ برِ صغیر کے کسی نامور اُردو رُباعی گو سخن ور کا مقابلہ نہیں کر سکا ہے۔ فرید کی چند منتخب رُباعیات یہاں پیش خدمت ہیں:

واقف ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست!
کنعاں سے نہیں وادیٔ کشمیر سے ہوں

—

اطراف میں خوشبو سی کھلی لگتی ہے
سانچے میں نئی طرح ڈھلی لگتی ہے

آنا وہ تیرا ہو کہ چلے جانا تیرا
ہر ایک ادا تیری بھلی لگتی ہے

—

تنہائی ہے ، میں ہوں ، اور شام ہے بس
تھوڑی سی عنایت ہے آرام ہے بس
دنیا کا ہر اک کام نبیڑا میں نے
بس خود کو کروں یاد یہی کام ہے بس

—

آئے گا فلک پر وہ ستارا واپس
یہ چیز ہے کیا آئے گا سارا واپس
افسوس اس اک بات کا ہے دنیا میں
آنا نہ مجھی کو ہے دوبارا واپس

ایسا لگتا ہے کہ یہ رُباعی: آنا نہ مجھی کو ہے دوبارا واپس، فرید نے ایک پیش گوئی کے طور پر اپنی بے وقت موت کے تصور میں موزون کی تھی جب وہ صرف پچاس سال کی عمر میں خدا کو پیارا ہو گیا اور اُردو دنیا اس کے نئے نئے قلمی معجزوں اور کارناموں سے محروم ہی رہی۔

رفیق راز اُردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اُردو شاعری ہی کی نذر کرتا رہا، لیکن ساہتیہ اکادمی کا اعزاز اُسے کشمیری مجموعہ کلام پر ہی دیا گیا۔ رفیق راز کو فن سخن گوئی پر پوری دسترس حاصل ہے اور اس قابلیت کی بنا پر اُس نے کئی اچھی غزلیں اور نظمیں تخلیق کی ہیں۔ راز کی یہ رُباعیات اس دعویٰ کی دلیل کا ثبوت ہیں:

میں مثل شمع نور بھی ہوں نار بھی ہوں
سالک ہوں شب تار گرفتار بھی ہوں

خایف ہوں میں بادِ مخالف سے اُدھر
سانسوں سے ادھر برسرِ پیکار بھی ہوں

-

یہ نکتہ تو کھول مالکِ ہست و بود
ہر شے ہے تیرے ہی نام سے جب نور آلود
پھر کیوں ہے درونِ جسم تیرے ہوتے؟
اک تیرہ و تار بیاباں موجود

-

باہر کے جہاں کو بھی ذرا پیار سے دیکھ
کچھ خواب نئے دیدۂ بیدار سے دیکھ
تو روح کے زنداں میں نظر بند ہوا
چپکے سے کبھی روزنِ دیوار سے دیکھ

-

دم لے لو ابھی ہوگئی ہے رات نہیں
تنہا ہو تمہیں خضر کا بھی ساتھ نہیں
امید بہت چشمۂ حیواں کی نہ رکھ
یہ سایہ دیوار ہے ظلمات نہیں

محمد الیاس ملک تنویر بھدرواہی کا تعلق خطۂ چناب سے ہے۔ انھوں نے بہت کم رُباعیات لکھی ہیں۔ البتہ ان کے دو مجموعہ کلام ''پرتو تنویر'' اور ''منظر منظر آئینہ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی یہ تین رُباعیات پیش ہیں تا کہ وادیٔ چناب کی بھی ترجمانی ہوسکے:

ہر چند ہو افکار کا گہنا اچھا
لگتا نہیں خاموش ہی رہنا اچھا
سچ کہنے سے ہوجائے خفا کوئی تو
کچھ کہنے سے ہے کچھ بھی نہ کہنا اچھا

-

کب برق بلا رکھتی ہے تنکا باقی
طوفاں میں تو کچھ بھی نہیں رہتا باقی
پامالِ غم و درد اگر دل ہوجائے
رہتی ہی نہیں کوئی تمنا باقی

-

کٹتی ہو اگر زندگی پسپائی میں
پھر لطف کہاں انجمن آرائی میں
جس دل پہ مسلط ہو اندھیرے غم کے
وہ کیوں نہ بھٹکتا رہے تنہائی میں

ریاست جموں وکشمیر میں 1947ء کے بعد کی دنیائے ادب پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہاں اصنافِ ادبیات میں رُباعی یا نظم کے مقابلے میں افسانہ اور غزل زیادہ پُرشور اور خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ افسانے کی صنف میں علی محمد لون، پریم ناتھ در، پریم ناتھ پردیسی، نورشاہ، جی این شاہد، موہن یاور، اختر محی الدین، ترنم ریاض، سوم ناتھ زتشی وغیرہ نے کئی یادگار اُردو افسانے تخلیق کیے جو آج بھی مقامی ماحول کے تناظر میں برمحل اور برجستہ ہیں۔ اسی طرح اکبر جے پوری، ہمدم کشمیری، حکیم منظور، شبیب رضوی کے نام عروسِ غزل کی آراستگی کے لیے اپنی پُرکاری اور فن کاری کا مظاہرہ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ البتہ نظم میں

ہم نے کوئی احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، فیض احمد فیض، شاذ تمکنت اور رُباعی کی صنف میں جوش، فراق، یاس یگانہ چنگیزی یا امجد حیدر آبادی پیدا نہیں کیا ہے۔

میں اس مقالے کو اس اعتذار کے ساتھ اختتام پر لاتا ہوں کہ اس میں اُن ہی رُباعی گو شاعروں کو زیرِ تذکرہ لایا گیا ہے جن کی تخلیقات دستیاب ہو چکی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ چند اور کشمیری سخن وروں نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہو، لیکن اُن کے کلام کی غیر موجودگی میں اُن کے فن پر کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔



کشمیر میں تہذیبی ہم آہنگی کے مظاہر

کشمیری میں ایک کہاوت ہے :

حضرتِ آدمس زِی گبر

اَکی رٔٹ آورنٕز اَکی رٔٹ قبر

حضرت آدمؑ کے دو ہی بیٹے تھے، ایک نے شمشان کو چُن لیا اور دوسرے نے قبر کا انتخاب کیا۔ یہ کہاوت اپنے معنوی لحاظ سے ازمنہ قدیم سے برابر آج تک سرزمین کشمیر میں سماجی، معاشی اور بالخصوص تہذیبی زندگی پر اثر پذیر رہی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں تقریباً ایک ہزار سال تک بدھ مت کا دور دورہ رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے اس کا تنزل اور برہمن دور کے ارتقاء کا آغاز ہوا، تو اس تغیر کے باوجود کشمیر کی ثقافتی ہم آہنگی کا ہر گوشہ ہر ضرررساں اثر سے محفوظ رہا۔ 1320ء میں جب کشمیر میں باقاعدہ مسلم حکومت قائم ہوگئی تو اس یکجہتی کے مظاہر ثقافتی زندگی کے ہر پہلو سے پھر ایک بار جھلک کر سامنے آتے رہے۔ یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ کشمیر کے عارفِ کامل اور سخن گو حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ نے جب پیدائش کے بعد اپنی والدہ کا دودھ پینے سے انکار کیا، تو حضرت شیخ کی ہم عصر شاعر لل ایشوری اُن سے یہ کہہ کر انھیں اپنے پستان سے دودھ پلانے میں کامیاب ہوگئی:

زٕینہٕ مند چھوک نہٕ چینہٕ کیازہ چھُکھ مند چھان

(تو جینے سے یعنی پیدا ہونے سے نہیں شرمایا، تو پھر پینے سے کیوں شرماتا ہے)

حضرت شیخ ؒ اپنی زندگی میں لل ایشوری کے فلسفۂ حیات اور تصور انسانیت کی شائستگی اور پاکیزگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کشمیر کے ان اوّلین سخن وروں کا کلام ایک دوسرے سے الگ کرنے میں آج بھی محققین کو دقتیں درپیش آتی ہیں۔ حضرت شیخ العالمؒ نے بھی انسان کو اسی نفس کشی، حق پرستی، انسان نوازی اور صدق وخلوص کا پیغام دیا جس کا فیضان انہیں بہت حد تک للہ عارفہ کے واکھ سے حاصل ہوا تھا، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے، وہ خود کہتی ہیں ۔

شِو ہی شِو ہے جابجا جلوہ نما جلوہ طراز
کر نہ ہندو اور مسلمان میں تو کچھ بھی امتیاز
گر ہے تو ذی ہوش اپنی ذات کو پہچان لے
درحقیقت بس یہی اللہ کی پہچان ہے

لَلّی ایشوری کے بارے میں عام عقیدہ ہے کہ وہ ہندو اور شِومت کی مقلد تھی اور بقول سر رچرڈ ٹپل ''اُس کا رجحان خیال صاف طور پر اس کے اپنے ہی عقائد کا آئینہ دار تھا، پھر بھی اس میں صوفیوں کی تعلیم کو بہت دخل رہا ہے جو قریب قریب ہندوؤں کے اُپنشدوں کا نظریہ ہے'' لیکن ایک خاص عقیدے سے وابستہ ہونے کے باوجود اس واقعہ سے للّہ کی حق شناسی اور حق نوازی کا بھرپور ثبوت ملتا ہے۔ کہتے ہیں للّہ عارفہ کے پیٹ کا نچلا حصہ بڑھ گیا تھا اور جائے ستر پر پردے کا کام دیتا تھا، ورنہ وہ عام طور پر برہنہ ہی رہتی تھی۔ اسی دوران اس کی ملاقات کشمیر میں اسلام کے نقیب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ سے ہوئی۔ اُن سے نظر ملتے ہی وہ پاس ہی ایک نانوائی کے تندور میں جا چھپی اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے زرق برق لباس میں پھر نمودار ہوئی۔ جب للّہ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو اُس نے کہا ''میں نے زندگی میں پہلی بار ایک مرد یعنی مرد خدا کو دیکھ لیا ہے'' ایک اور واکھیہ کا مفہوم ہے ۔

میرے دل کا میل سارا ڈھل گیا
اُس طرح جیسے کہ آئینے سے زنگ
گیان کیوں حاصل نہ ہوتا پھر مجھے
میں نے جب پایا اُسے اپنے قریب
تھا وہی سب کچھ، میں خود کچھ بھی نہ تھی

پندرہویں صدی کے مشہور کشمیری بادشاہ سلطان زین العابدین بڈشاہ نے اپنے دربارشاہی سے لے کر ملک کے طول وعرض کو تہذیبی شیرازہ بندی کا ایک ایسا سدابہار گلستان بنایا تھا جس کی خوشبو نے آج تک ہماری میراث کو عطر بیز کرر کھا ہے۔ بڈشاہ کا وزیراعلیٰ ایک بودھ تلک آچاریہ تھا۔ اس نے دریائے جہلم کے دو کناروں پر دو بہت بڑے اور خوبصورت بودھ وہار تعمیر کروائے۔ اس کے زمانے میں ادبی اور تہذیبی شعبوں میں عربی اور سنسکرت زبانوں کے ادب وفن کو ممتاز علماء، فضلاء اور دانشوروں نے نئے سرے سے نئی جلا بخشی۔ اس دور میں شری ور نامی مشہور شاعر نے یوسف زلیخا اور دلا رام کی کہانیوں کو عربی سے سنسکرت میں منتقل کیا۔ بڈشاہ کے دل میں دیگر مذاہب کے اصولوں کا اس حد تک احترام تھا کہ اُس نے کشمیر میں گائے کے ذبیحہ کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دے دیا۔ ''کشیر'' کے مصنف ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کے بقول ''کشمیر میں اکثر خانقاہوں کی ظاہری شکل وصورت بُدھ پگواڑوں سے مشابہ ہے'' کیونکہ خدوخال کی یکسانیت سے بھرپور فروغ تو فن تعمیر کو عہدِ بڈشاہی میں ہی حاصل ہوا بڈشاہ کا زمانہ کشمیر میں تہذیبی ہم آہنگی اور ثقافتی عروج کا سنہری زمانہ رہا ہے۔ اگرچہ دور استبداد کے ہاتھوں اس بیش بہا سرمایہ کا اکثر حصہ آج بٹ چکا ہے، لیکن تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ بڈشاہ نے جہاں اپنے وقت کے مذاہب اور عقائد کی آبیاری کی، وہاں اُس نے علوم وفنون اور افکار واظہار کے نئے نئے

جادے تلاش کیے اوراس اکتساب میں کشمیری ثقافت کو وسط ایشیائی اور ایرانی ہنر مندی کی آمیزش سے مالا مال کر دیا۔

دورِ بڈشاہی میں اس تہذیبی رواداری کی جو بنیادیں اُستوار ہوئی تھیں، آج سرزمین کشمیر میں اُن پر ایک ایسی عمارت تعمیر ہوئی ہے جس کے دریچوں سے بیک وقت ناقوس واذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ یہاں کوہِ ماران کے دامن میں جہاں سلطان العارفین حضرت مخدوم صاحبؒ کی زیارت مرجع خاص وعام ہے وہاں اسی پہاڑی کے شمالی سرے پر چکرا ایشور مندر عقیدت مندوں کو صبح وشام سکونِ قلب اور روحانی طمانیت عطا کرتا ہے۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی خانقاہ اور مہا کالی کا مندر ایک ہی جگہ پر واقع ہیں۔ جہاں صدیوں سے مسلمان اور ہندو دونوں اس زیارت اور استھاپن پر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ دیوسر میں ترپرسندری دیوی کے استھاپن پر مسلمان بھی آتے ہیں۔ کھیر بھوانی کی متبرک جگہ پر پوجا کے کیلیے پھول، دودھ اور میوے فروخت کرنے کا کاروبار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اسی طرح شری امرناتھ جی کی مقدس گپھا پر جب ساون کی پورن ماشی کو میلہ لگتا ہے تو نذرانے کا ایک حصہ حال ہی تک بوٹہ کوٹ کے ملک گھرانے کو بھی جاتا تھا۔

کشمیر میں اس ثقافتی ہم آہنگی کے خوشگوار اثرات تقریباً ہر گھر میں مختلف صورتوں میں موجود نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی اکثر ذاتیں یا خاندانی نام مثلاً کول، پنڈت، بٹ، متو، جلالی، رینہ، گنجو وغیرہ مشترک ہیں اور کئی پنڈت گھرانوں میں فارسی زبان میں بھی بھگوت گیتا کا پاٹھ ہوتا رہتا ہے۔

کشمیر کی علمی اور ادبی دنیا میں جہاں پنڈت مفکروں اور دانشوروں نے فارسی زبان میں نام پیدا کیا ہے وہاں مسلمان شاعروں شمس فقیر، صمد میر اور

عبدالاحد زرگر نے اپنے کلام میں سنسکرت اصطلاحات کو وہ معنی آفرینی بخشی ہے کہ ان سخن وروں کی انتہائی محدود علمی استعداد کے پیش نظر اس بامحل استعمال کا مشکل سے یقین آتا ہے۔

وادیٔ کشمیر جغرافیائی اعتبار سے صدیوں تک رشیوں، منیوں اور صوفیوں اور سنتوں کے لیے تلاش حق کا محبوب ترین مقام رہی ہے۔ کیونکہ اس وادی کے پرسکون ماحول میں نور حق کے جلوے گام گام پر نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب اور خیالات کی ترویج وتشہیر کے پیہم عمل نے یہاں تہذیبی رواداری اور ہم آہنگی کو ایک ایسی ابدی اور لازوال حقیقت کی تشکیل کیھے جس کے نقوش تغیرات کے مدوجزر میں بھی دلوں میں ثبت رہے ہیں۔



کشمیری شاعری میں تحریکِ حرّیتِ کشمیر کے رجحانات

1586ء میں مغلوں کی تسخیر کشمیر کے بعد کشمیری زبان کے شعراء ایک غیر موافق ماحول کے خلاف اگرچہ علی الاعلان اپنے قلم کو شعلہ بار نہ کر سکے، لیکن مختلف فارسی جنگ نامے ان کی طرف سے کشمیری میں منتقل کیے جانے کا سلسلہ دراصل وفورِ جذبات کے اس بالواسطہ اظہار بیان کا ردعمل تھا جو وہ کھل کر نہیں کر سکتے تھے۔ ان تراجم کا مقصد و مدعا یہی تھا کہ کشمیریوں کے دل و دماغ رزم وجزم کے کارناموں سے اس حد تک گرمائے جاسکیں کہ بیرونی قابضوں اور حاکموں کے خلاف ان کے غصے اور نفرت کو برابر حدت اور حرارت ملتی رہے۔

مغلوں کے بعد پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے ملک کشمیر کو زیر تسلط لاکر استبداد کا نشانہ بنایا اور اہل کشمیر جور و جفا کے یہ دن خاموشی کے ساتھ گزارتے رہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب سارے برصغیر میں انگریز کے خلاف جدو جہد آزادی نے ایک نیا موڑ لیا تو کشمیری شاعر بھی ڈوگرہ راج کے خاتمے کے لیے کمر بستہ نظر آنے لگے۔ اس طرح کشمیر میں پہلی بار واضح طور پر تحریکِ آزادی کے رجحانات کو شاعری کے دامن میں جگہ پانا نصیب ہوا۔

1947ء تک کشمیری زبان کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ مقامی طور پر ڈوگرہ حکمرانوں نے اس زبان کی پسماندگی کو قائم رکھا۔ لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں ریاست میں اُردو کی ترقی اور ترویج کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کئی اقدامات کیے گئے، جو ڈوگروں کے آخری فرمانروا مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ اقتدار تک برابر جاری رہے۔ بیرونی دنیا میں اُس وقت کشمیر لاہور جیسے اردو کے مرکز سے والہانہ اثر لے رہا تھا اور جب ریاست کی تحریک آزادی میں مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حفیظ جالندھری، محمد دین فوق، شورش کشمیری اور چراغ حسن حسرت جیسے جادونگار اہل قلم اور صحافیوں کی بھرپور حمایت شامل رہی تو لاہور اور پنجاب کے دیگر صحافتی مراکز کے اردو اخبارات وادیٔ کشمیر کے ہر گھر میں روزمرہ کے مطالعہ کا ایک جزولاینفک بن گے۔

1947ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جس طریقے پر مقامی حکومتوں کی اقتدار پرستی کا دور دورہ شروع ہوا وہ ہر جمہور نواز اور امن وقانون کا احترام کرنے والے ریاستی باشندے کو نا اُمید اور بددل کرنے کا باعث بنتا گیا۔ اس دوران میں ریاست میں جمہوریت کے ماتھے پر پے در پے دھبے لگائے گئے اور ''قومی مفادات اور ریاستی سلامتی'' کے نام پر انتہائی غیر جمہوری طریقے پر ریاست میں یکے بعد دیگرے حکومتیں تبدیل کی گئیں جس سے ساری ریاست میں لاکھوں عوام کے قلب وذہن بدگمانیوں اور شکوک وشبہات کا شکار ہوتے گئے۔

اس بے لطف اور بے راہ روسلسلے کا آغاز اگست 1953ء میں ہوا، جب اُس وقت کے ریاستی وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو دہلی کی ایما پر حکومت سے برخاست کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ شیخ صاحب کی غیر متوقع معطّلی اور

اسیری پر ریاستی مسلمانوں نے وسیع پیمانے پر مظاہرہ کر کے اس غیر آئینی اقدام کی مخالفت کی، جس کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ شہری گولیوں کا شکار بن گئے، جب کہ دوسری طرف جموں کے ڈوگرہ ہندوؤں نے شیخ صاحب کی برطرفی کے موقعے پر خوب جشن منایا اور نئے نامزد وزیراعظم بخشی غلام محمد کو جموں و کشمیر کا نجات دہندہ قرار دیا۔ اس سے قبل جموں میں متعصب انتہا پسند ہندو تنظیم پرجا پریشد نے پریم ناتھ ڈوگرہ کی رہنمائی میں شیخ عبداللہ کے خلاف ایک ایجی ٹیشن چلائی تھی۔ اس ایجی ٹیشن کے مطالبات میں ریاست کے لیے آئین ہند کی دفعہ 370 کو ختم کرنا، شیخ عبداللہ کو وزیراعظم کے بجائے وزیراعلیٰ کہلوانا اور ریاست کیلیے الگ پرچم کو ختم کروانا تھا۔ اسی غرض سے اس ایجی ٹیشن کو تین فتنہ ساز نعروں یعنی ایک پردھان (وزیر یعنی وزیراعلیٰ)، ایک ودھان (یعنی ایک ہی آئین سازیہ) اور ایک نشان (یعنی پرچم) کے مرچ مصالحے کی آنچ دی گئی تھی۔

شیخ عبداللہ کی برخاستگی کے فوراً بعد کشمیری عوام پر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ شیخ عبداللہ امریکہ کے ساتھ ایک سازش میں ملوث ہو کر کشمیر کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کی تیاریاں کر کے خود سلطانِ کشمیر بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ (1) جب امریکہ کے ساتھ اس نام نہاد سازش کے افسانے کو دنیا بھر میں عوامی ذرائع ابلاغ نے ایک اختراع قرار دیا تو ایک نئی ساز باز کے بعد شیخ عبداللہ کو سینکڑوں کشمیری سیاست دانوں اور سرکار مخالف لوگوں کے ساتھ کشمیر سازش کیس میں ملوث کیا گیا۔ اس مقدمے کی رو سے ان پر یہ الزامات عائد کیے گئے کہ وہ بیرونی طاقتوں کی مالی اور عسکری امداد کے بل بوتے پر ریاست جموں وکشمیر کی سرکار کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے۔ یہ الزامات ایک طویل عرصہ تک مقدمہ بازی کے گورکھ دھندے میں اُلجھتے رہے اور جب یہ چال بھی اُلٹی پڑی تو ریاستی سرکار کو کشمیر سازش کیس اور حضرت بل قتل کیس (2) اپریل 1964ء میں اُس

وقت داخل دفتر کرنے پر مجبور ہونا پڑا جب اس کاروائی پر خزانہ عامرہ کا کروڑوں روپے برباد ہو چکا تھا۔

ہم عصر کشمیری شاعروں میں جہاں وادی کے اکثر مسلم سخن وروں نے آزادی کے گیت گائے وہاں کشمیری الاصل غیر مسلم شاعروں یعنی پنڈتوں نے 1964ء میں ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک کا نہ صرف یہ کہ قطعاً ساتھ نہیں دیا بلکہ وہ اس تحریک کو غنڈہ گردی سے تعبیر کر کے ہندوستانی حاکموں کو مختلف فرضی ناموں سے مراسلے اور برقیے بھیج بھیج کر گمراہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایسی کوئی مثال موجود نہیں جس کی رو سے کشمیر کے غیر مسلم شعرا نندلال طالب، ماسٹر زندہ کول، دیناناتھ نادم، المست کشمیری، نندلال امباردار، دیناناتھ مست، پی این پشپ، امر چندولی، پریم ناتھ پریمی، تریلوکی ناتھ کندن، واسدیو ریہہ، ارجن دیو مجبور، سروانند پریمی وغیرہ نے تحریک کشمیر کے حق میں ایک بھی شعر تخلیق کیا ہو۔ طرہ یہ کہ پریم ناتھ بزاز نے جب اپنے اخبار ''ہمدرد'' کے ذریعہ اُس وقت کے سب سے دراز قد قائد تحریک شیخ محمد عبداللہ کے خلاف مخالفت اور نکتہ چینی کا بازار گرم کیا تو بزاز نے اس مطلب کی برآوری کے لئے ایک مقامی تُک بند میر عبدالعزیز (ایڈیٹر ہفت روزہ انصاف، راولپنڈی) کی خدمات بھی حاصل کیں جو زہر پاش، مرچ پاش اور نمک پاش کے فرضی ناموں سے ''ہمدرد'' میں شیخ عبداللہ اور تحریک آزادی کشمیر کے خلاف اپنی دشنام طرازی فکاہیہ منظومات کی شکل میں شائع کرواتا رہا۔

دورِ جدید کے کشمیری شعرا میں غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد کو تحریک آزادیٔ کشمیر کے نقیبوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

غلام احمد مہجور اگر چہ ساری عمر سرکاری ملازمت ہی سے وابستہ رہا اور اس تعلق سے وہ براہ راست اپنے وطن کے حال زار پر خامہ فرسائی کر کے سیاست

گری کے جرم کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا لیکن اُس نے اہل کشمیر کے درد اور حزن وملال کو ایک حساس تخلیق کار کی طرح خود اپنے دل میں محسوس کرلیا اور یہ شدید احساس اُس کی کئی انقلابی، سیاسی اور وطنی منظومات کی شکل میں ظاہر ہوا، جن میں اُردو نظم ''خطاب بہ مسلم کشمیر'' کے علاوہ اُس کی کشمیری نظمیں، باغبان اے مہربان، اک نیا گلزار ہو، نیا گلزار ہو، نیا کشمیر، اپنا باغ، گلشن وطن، گل لالہ سے خطاب، زندگی کا ساز، مزدور سے خطاب، اے بادصبا، آزادی، جنگی ترانہ، نغمۂ دہقان، اے بہادر کشمیری اور عہد و پیمان حضرت بل بھی شامل ہیں۔(3)

کلیات مہجور کے مرتب کے بقول ''مہجور کی کشمیری شاعری بھی ہماری قومی تحریک کے دوش بدوش نشوونما پاتی رہی ہے۔ کشمیر میں قومی تحریک کی حدت وحرارت تیز ہونے کے ساتھ ساتھ مہجور کی شاعری میں بھی شبنمی محسوسات ٹھنڈے پڑ گئے اور ان کی جگہ آتشیں خیالات نے لے لی۔ ایک ہمہ گیر قومی تحریک کو محض سیاسی نعرہ بازی اور چند اصولوں ہی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ کئی جمالیاتی قدروں اور تہذیبی عناصر کی بھی محتاج ہوتی ہے اور یہ ضرورت مہجور نے پوری کرلی''۔(4)

اس طرح ایس کموڈی کا یہ کہنا برمحل ہے کہ ''مہجور کی شاعری اجتماعی شعور کی وہ علامت ہے جس نے تحریک حریت کشمیر کو جلا بخشی اور ایک کشمیری کو ''نیا کشمیر'' حاصل کرنے پر آمادہ کرلیا''۔(5)

غلام احمد مہجور کا مشہور انقلابی ترانہ ''اے باغبان'' شخصی حکومت کے خلاف جہد آزادی کے دوران شیخ محمد عبداللہ عوامی جلسوں میں اکثر و بیشتر ترنم اور جوش بیان کے ساتھ گا گا کر محکوم اہل کشمیر کے دلوں میں جذبہ حریت کا تلاطم موجزن کرتے رہے۔ اس مشہور نغمے کو کیفی اعظمی نے اُردو میں یوں منتقل کیا ہے:

چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
کھلیں گل ہوں فدا بلبل تو وہ سامان پیدا کر

ابھی ویراں ہے پھلواری ابھی سونی ہے ہر کیاری
کہاں تک روئے گی شبنم بنا اشکوں کو چنگاری
کوئی ہلچل کوئی بادل کوئی طوفان پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر

جدا ہوں رنگ پھولوں کے جدا ہوں ڈھنگ پھولوں کے
کبھی کانٹا نہ جان ان کو رہیں جو سنگ پھولوں کے
نیا ہر ڈھب نیا مذہب نیا ایمان پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر

تری مشکل تری مشکل تری منزل تری منزل
سہارا دے کوئی تجھ کو تو پھر چلنے سے کیا حاصل
تو اپنا ہوش اپنا جوش اپنی آن پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر

تابش صدیقی کے بقول ''مہجور نے حب الوطنی کے موضوعات کو کشمیری شاعری میں داخل کیا۔ وطن کی مظلومیت پر آنسو بہائے۔ وطن کے پہاڑوں، ندیوں، چشموں اور مرغزاروں کے گیت گائے اور ان کے حسن کا ذکر کر کے اہل وطن کو وطن سے محبت کرنے کی تلقین کی۔ (6)

مہجور کشمیری میں شاعری کرنے سے پہلے سالہا سال تک اُردو میں سخن گوئی کرتا رہا اور اسی دوران اس نے برصغیر ہند و پاک میں آزادی کی جوالا کو اپنی آنکھوں کے سامنے بھڑکتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن ساتھ ہی اپنے شاندار ماضی اور بے مثال ورثے سے مسلمانانِ ہند کی چشم پوشی اس کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی

تھی۔ ''خطاب بہ مسلم کشمیر''، مہجور نے اقبال کی نظم ''خطاب بہ نوجوان اسلام'' کے اتباع میں لکھی۔ یہ نظم جو 6 جون 1924ء کے اخبار ''کشمیر'' میں شائع ہوئی، شاعر کے وطن پرستانہ جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے تاریخ کشمیر کے محرکات سے بھرپور احساس کی ترجمان ہے۔ مہجور کہتا ہے:

ترے اسلاف وہ تھے جن کے علم و فضل کے آگے
ادب سے جھکتے تھے دانشوران ہند و ایرانی
شہنشاہ معظم شاہ زین العابدین بڈشاہ (7)
کیا اکبر نے جس سے کسب آئین جہاں بانی
بخوبی یاد ہے اب تک سخن سنجان عالم کو
غنی کی (8) خوش بیانی اور صرفی (9) کی سخن دانی
وہ شاہنشاہ باتقویٰ وہ فخر تاج چغتائی (10)
وہ جس کی زندگی کا شغل تھا دیں کی نگہبانی
تیرے پیارے وطن کو قبہ اسلام کہتا تھا
گواہی کے لیے موجود ہیں احکام سلطانی

لیکن مہجور جیسے حساس شاعر کی ساری توقعات کے برعکس آزادی نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نام نہاد آزادی نئے نظام میں نئی بیماریاں لے کر آئی تھی، جواب ہمارے معاشرے کا ناسور بن چکی ہیں۔

1947ء کے بعد اگرچہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک عوامی حکومت کو برسر اقتدار لایا گیا لیکن اس حکومت کے کئی عاقبت نا اندیش کارندوں اور اربابِ اختیار نے آزادی کے نام پر داداگری اور زور زبردستی کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا کہ اہل کشمیر نے آزادی کا جو حسین خواب دیکھا تھا وہ رفتہ رفتہ استیصال، خویش پروری، اقربا نوازی، غریب دشمنی اور سیاسی جبر و استبداد کے شب خون میں

تبدیل ہو کے رہ گیا۔ مہجور کی طنزیہ نظم ''آزادی'' اسی دورِ ناہنجار کی بڑے تیکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم کو بلراج ساہنی اور پربھات مکرجی کی تیار کردہ فلم ''شاعر کشمیر مہجور'' کے لیے کیفی اعظمی ہی نے اردو کا منظوم روپ دیا تھا اور ایک مشہور بھارتی گلوکار منا ڈے اور اُس کے ہم نواؤں نے اسے فلم کے لیے گایا تھا، لیکن حکومتِ ہند کے احکامات کے تحت اس گانے کا ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے نشر کیا جانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مہجور کی اس معرکۃ الآراء نظم کے چند بند یوں ہیں:

آزادی ہمارے گھر آئی آزادی کا کیا کہنا
آتی تو نہیں تھی پر آئی آزادی کا کیا کہنا
یہ محلوں پر منڈلاتی ہے سونا چاندی برساتی ہے
بس کھنڈروں سے شرماتی ہے سونا چاندی
بھوکوں کو بہلائے کیسے پیاسوں پر چھلکائے کیسے
جنتا کو سمجھائے کیسے اوروں کی تجوری بھر آئی
سب روتے ہیں کچھ گاتے ہیں
سب کھوتے ہیں کچھ پاتے ہیں
پھل محنت کے لٹ جاتے ہیں

ریاست میں عوامی راج کے سیاہ کارناموں کو مہجور نے اپنی ایک اور نظم ''گل لالہ'' میں یوں بے پردہ کیا ہے:

اے گل لالہ! ذرا تو حال دل اپنا سنا
داغ دل لایا جہاں سے اُس جہاں کی کچھ بتا
کیا وہاں بھی قتلِ آدم کیلئے ہتھیار ہیں
کیا وہاں بھی عورتوں بچوں کے دامن تار ہیں

کیا وہاں بھی دور دورہ چور بازاری کا ہے
کیا وہاں بھی راج افلاس اور بے کاری کا ہے
کیا وہاں مومن ہے بیکس اور بے دیں ہے امیر
کیا وہاں زردار کے ہاتھوں میں مفلس ہیں اسیر
کیا وہاں مظلوم پر ظالم کا استبداد ہے
کیا وہاں بھی اہلِ دانش کا چمن برباد ہے
کیا وہاں بھی حق پرستوں کے لئے بیداد ہے
کیا وہاں بھی چاپلوسوں کا جہاں آباد ہے
کیا وہاں بھی بے خطا ہیں اور ہے ظلم و ستم
کیا وہاں بھی مجرموں کے ساتھ ہے لطف و کرم
کیا وہاں بھی دل ہی میں ہے شاعروں کے دل کی بات(10)

عبدالاحد آزاد کشمیری قوم کی حمیت اور آزادی کا اتنا بڑا عاشق تھا کہ اس قوم کی غیر پرستی اور غلامی کے حال سے اس کا دل تڑپ اُٹھتا تھا۔

یُس ڈیکہٕ الراوِ عرشس فرش ہیتھ وقتِ نیاز
سُے ڈیکہٕ درواز نی پیٹھ کیازِ تروُتھ تی پزیا

(جس جبین نیاز کا ایک سجدہ عرش وفرش میں بھونچال لاسکتا ہے، اُس جبین سے تو کیوں غیر کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرتا ہے)

آزاد کا یہ شعر پڑھ کر بے ساختہ اقبال کی یاد آجاتی ہے:

پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

آزاد نے اپنی نظم ''مناظرہ عقل وعشق'' میں کشمیر کی غلامی اور معاشی ابتری کی یوں تصویر کشی کی ہے:

سادہ منوش کاأشرِ ی کونہٕ کران افسری
وچھتہٕ پہنز ابترِی وچھتہٕ یہند کاروبار
(سادہ لوح کشمیری حکومت کیوں نہیں کرتے۔ دیکھ ان کی ابتری اور ان کا خستہ حال کاروبار دیکھ)

یہاں پھر شاعر مشرق یاد آتے ہیں، جنہوں نے کہا ہے:

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

عبدالاحد آزاد کی منظومات میں شکوۂ ابلیس، خودی، نالہ بڈشاہ، شکوۂ کشمیر، سرمایہ داری، نغمۂ بیداری، انقلاب، پیام انقلاب، دریا، وتستا (جہلم)، میرا وطن وغیرہ آزادی اور غیروں کی غلامی سے حصولِ نجات کے شدید جذبے سے سرشار ہیں۔

آزاد کے ایک قریبی دوست اور ''کلیات آزاد'' کے مرتب ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو نے اُس دور غلامی اور آزاد کے ردعمل کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

''عبدالاحد آزاد اپنے اوائل عمر ہی سے وطن کی کسمپرسی دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کے افلاس کے مناظر اور شخصی حکومت کے نیچے دبے ہوئے ہم وطنوں کی اُمنگوں کو دیکھ کر وہ تلملا اُٹھتا تھا۔ جذبات اُبھرتے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہوتا تھا۔ اُسے عوام کی کسمپرسی کے مناظر اور شخصی حکومت کے نقائص وطن کے چپہ چپہ پر کسی نہ کسی صورت میں نمایاں نظر آتے تھے۔ عوام اذیت کا شکار تو تھے ہی، سرکاری ملازم کا بھی یہی حال تھا۔ آزاد کا حساس دل یہ حال زار دیکھ کر روتا رہا اور وہ کشمیریوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتا رہا۔ ''مناظرہ عقل وعشق'' میں اُس نے کشمیریوں کی بے کسی اور بے بسی کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے''۔(11)

عبدالستار عاصی پیشے کے لحاظ سے ایک مزدور تھا۔ لہٰذا اُس کے کلام میں بھی مزدوروں اور محنت کشوں کے دُکھ درد کا اظہار ایک فطری عمل ہے۔ بقول مہجور، ''اگر عاصؔی کچھ دیر اور زندہ رہتا تو وہ یقیناً کشمیری مزدوروں میں انقلاب بپا کرتا''

عاصی کے یہ چند اشعار کشمیری قوم کو اُس انقلاب کا پیغام دیتے ہیں جس کی بدولت تغیرات زمانہ کے وہ خدوخال نظر آ سکتے ہیں جو زمانے کی نظروں سے صدیوں تک اوجھل رہے:

انقلابکی نعرہِ سیتن شال زن ظالم ژلن
لال نیرن عاصیا تئ سور بنہ بالن پلن
یاد تھووئی میانی کتھ اٗخر کرن ژیے راج چھُے
وقت آو نزدیک بالکل دین کلس ژے تاج چھُے
ہا مزدورو تھنہ کھوژکھ گگراین وزملن
چانہِ شمشیرٕ سیتئ ڈٔری یاوٕرُخ پھیرن جنگل الن

(نعرہ انقلاب سے ظالم گیدڑوں کی طرح بھاگ جائیں گے اور اے عاصؔی! چٹان پانی کی طرح بہہ جائیں گے اور ان میں مخفی لعل و جواہر ظاہر ہو جائیں گے۔ یاد رکھ کہ آخر تو ہی راج کرے گا اور اے کشمیری مزدور! اب وقت آچکا ہے کہ تاج تیرے سر پر ہوگا۔ تو بجلیوں اور برق و باراں سے نہ ڈر کہ تیری ہمتد ریاؤں کا رُخ موڑ کر رکھ دے گی)

عاصؔی نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے، لیکن اُس کا کلام زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ کشمیر کے مزدوروں اور محنت کشوں کا ترجمان یہ شاعر 1947ء کے فوراً بعد انتقال کر گیا۔

رحمٰن راہی نے اپنا پہلا مجموعہ کلام ''نوروز صبا'' جو 1958ء میں شائع

ہوا، کشمیر کی تحریکِ آزادی کے نام معنون کیا۔ اس مجموعے میں چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن سے شاعر کے اُن خیالات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے جو اس کے دل میں کشمیر کی آزادی کے لیے موجزن ہیں۔ گلستان سعدی سے ماخوذ ایک حکایت جسے راہی نے ''اس دور میں'' کے عنوان سے کشمیری نظم میں ڈھالا ہے ہم عصر کشمیر میں سرکاری پکڑ دھکڑ کے لامتناہی سلسلے پر ایک زبردست طنز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''آج کی بات'' اور ''اگر ہوش سنبھالے'' جیسی نظموں میں بھی آزادی کشمیر کی چاہت کا بیان واضح ہو جاتا ہے جو شاعر کی شعوری کوشش کا ماحصل ہے۔ تنہا انصاری مرحوم نے اپنی منظومات ''کشمیریوں کا ترانہ'' اور ''شہر آشوب'' میں بھی اہل کشمیر کی پسماندگی، استیصال اور سیاسی غیر یقینیت کا رونا رویا ہے۔

یہ مصنف ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں تقریباً دو سال تک سرینگر کے سنٹرل جیل میں 1958ء اور 1960ء کے دوران مقید رہا۔ زندان کے جان لیوا اور سر بمہر ماحول میں بے رنگ شب و روز گزارنے کے دوران میں نے کئی ایسی منظومات تخلیق کیں جو ایک پابہ جولاں انسان کے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آزادی کی فطری خواہش کا اظہار ہوتی ہیں۔ اس تعلق میں ''شمع اور شاعر''، ''شہید کو سلام'' اور ''زنداں نامہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں جو میرے کشمیری زنداں نامہ ''زنجورہ ہند ساز'' (ساز زنجیر) میں شامل ہیں، یہ مجموعہ 1963ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

میرے ایک اور مجموعہ کلام ''الہام'' میں بھی اسی قبیل کی کئی اور نظمیں مثلاً ''یہ میرا وطن''، ''نغمہ وطن'' اور ''ایک ملک ایک مسافر'' وغیرہ شامل ہیں۔

میرے اردو مجموعۂ کلام ''شبنم کا آتش کدہ'' میں ان حالات میں وقوع پذیر ظلم و ستم اور تشدد کے نتیجے میں انسانی جانوں کا تلف ہونا مرکزی موضوع ہے۔

غلام نبی عارض (1916ء - 1965ء) نے بھی کشمیری شاعری میں اپنی وطن پرستی اور آزادی پسندی کے گیتوں اور ترانوں کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو لکھتے ہیں کہ ''عارض مرحوم عبدالاحد آزاد کا بھانجا بھی تھا اور شاعری میں اُس نے آزاد سے بہت حد تک فکری اور ذہنی تربیت حاصل کی تھی۔ عارض نے جہاں اپنی شاعری میں مذہب و عشق کو خصوصی موضوعات کے طور پر ورطہ تحریری میں لایا ہے وہاں اس کے دل سے بھی آزادی کے متوالوں کی طرح ایک روشن مستقبل کے لیے آوازیں اُٹھتی رہی ہیں۔ عارضؔ کے بلوغت کے دور میں بھی کشمیر میں غلامی کا زمانہ تھا اور انسانی زندگی پر اس بدترین پابندی کے خلاف اس نے اپنی کئی نظموں میں غلامی سے سوکھے اور ویران کھیتوں کے لیے آزادی کی حیات بخش بارش کی تمنا کی ہے۔ لیکن عارض کے اس نوع کے کلام میں نعرہ بازی اور سطحیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ (12)

کشمیری زبان میں سیاسی اور انقلابی شاعری کی جن بنیادوں کو مہجور اور آزاد نے مستحکم کیا تھا، 1947ء کے بعد اگرچہ اُن پر کوئی نئی عمارت تعمیر نہ ہو سکی لیکن کشمیری زبان کے مخلص، قوم پرست اور آزادی پسند شاعر دبے دبے لہجے اور استعاروں اور کنایوں میں سیاسی بے راہ روی اور آزادی کے نام پر عوام کے استیصال کے خلاف برابر اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ اس تعلق میں بدقسمتی کا یہ پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ گنتی بھر کے چند شاعروں نے وقتی مفادات کے حصول کے لئے کے ساتھ ہی یہ سخن گو پرانی حکومت کی شدید نکتہ چینی اور نئے ارباب اختیار کی قصیدہ خوانی میں بھی پیش پیش رہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر جھوٹ کو سچ اور ہر صداقت کو باطل ثابت کرنے کی غرض سے ضمیر اور اظہار کے خلوص اور سربلندی کو خود ہی پامال کیا۔ لیکن جہاں ایک پوری قوم اور اُس کی کئی نسلیں استبداد اور استحصال کے خلاف قدم قدم پر

بغاوت کے لیے آمادہ ہوں، وہاں ایسے چند قلم کاروں کی ضمیر فروشی اور خود غرضی کے نشاں کاروانِ حریت کے قدموں تلے گرد راہ کے ناچیز ذرّوں کی طرح خود ہی بکھر جاتے ہیں۔

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں سامراجی سازش، غلام محمد راجپوری اور منوہر ناتھ کول، سماجی اور سیاسی تعلیمی حلقہ، سرینگر 1954ء

(2) اس نام نہاد مقدمے میں راقم بھی دو سال تک سرینگر کی سنٹرل جیل میں نظر بند رہا۔

(3) کلیاتِ مہجور، کلچرل اکادمی، سرینگر 1983ء؛ ص 266 تا 447ء

(4) ایضاً، ص 77

(5) شیرازہ، سرینگر، مہجور نمبر، کلچرل اکادمی سرینگر، اگست 1984ء؛ ص 100 تا 101

(6) پندرہویں صدی عیسوی کا مشہور فرمانروائے کشمیر جس کے دور میں ملک کشمیر میں ادب، فن، علم اور ثقافت کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔

(7) عہد عالمگیری کا ایک مشہور فارسی شاعر جو سرینگر کے محلہ راجوری کدل میں رہتا تھا۔

(8) حضرت شیخ یعقوب صرفی گنائی، ملک کشمیر کے ممتاز فارسی، عالم، فاضل اور مصنف جو مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں گزرے ہیں۔ ان کا مقبرہ سرینگر کے زینہ کدل علاقے میں ایشاں صاحب کے نام سے آج بھی معتقدین کے لئے فیض اور سکون کی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

(9) شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر

(10) ترجمہ غلام نبی خیال

(11) کلیات آزاد، مرتبہ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو، کلچرل اکادمی سرینگر، 1967ء ص: 77 تا 78

(12) کلیات آزاد



کشمیری صوفی شاعری اور دیگر شعراء کی ہم خیالی

کشمیری زبان کے سات سو سالہ طویل دورانیہ کی سب سے مالا مال، معتبر اور بے حد اثر انگیز شاعری صوفی شاعری ہی ہے۔

سرزمین کشمیر کے صوفی شاعروں کو دراصل ابتدا ہی سے اِسی فلسفۂ حیات نے متاثر کیا۔ جب انھوں نے اپنی اُن دو تاریخ ساز ادبی شخصیات کے محسوسات اور خیالات کا مطالعہ کیا یا اُن کا کلام سنا جنھوں نے چودھویں صدی میں اپنی شاعری کا آغاز ہی صوفیانہ فلسفے کی تبلیغ سے کیا تھا جس میں ریشی مت اور شیومت کے فلسفے کی جلوہ نمائی واضح اور نمایاں تھی۔ اُس سے بھی پیچھے کی طرف نظر دوڑائی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر کی وادی کو معنوی طور پر وجود میں لانے والا کشیپ ریشی خود بھی ریشی مت کا ایک بہت بڑا دانشور تھا اور اسے اپنی روحانی طاقت پر اس درجہ عبور تھا کہ حکایات کی رُو سے وادی کے مکینوں کو ایک آدم خور عفریت سے نجات دلانے کی خاطر وہ ایک ہزار سال تک تپسیا کرتا رہا۔

کشمیر کے جغرافیائی پس منظر کے حوالے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس وادی میں، جو قدرت کی ساری رحمتوں سے مالا مال تھی اور جہاں حق کے متلاشی ہر انسان کو روحانی اور قلبی سکون حاصل ہوتا تھا، لاتعداد صوفی، سنت، درویش، سادھو، ولی اور بزرگانِ دین سچائی کی جستجو میں سالہا سال تک قیام پذیر ہوئے

اور ایک عالم وجدان میں اللہ کی قربت کے حصول اور اس کی ذات کو اپنے ہی اندرون میں پانے کی سعادت حاصل کی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کشمیر کے صوفی شعرا کسی بھی شکل میں اردو کی صوفیانہ شاعری سے اثر پذیر نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی ہو سکتے تھے۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے شعراء تقریباً سو فیصد کی حد تک ان پڑھ اور نا خواندہ تھے، انھوں نے کسی مکتب کا دروازہ تک نہیں دیکھا تھا، لہاذا اُن کا کسی اور زبان کی تخلیقات سے کسی بھی طرح اثر پذیر ہونا ناممکن العمل ہے۔ یہ صوفی شاعر اگرچہ ظاہری علم کے نور سے محروم ہی تھے لیکن ودیعت الٰہی کی طرف سے انھیں جو من کی روشنی اور فکر و ذہن کی اندرونی تابناکی ورثے میں آئی تھی اس کے شعری ماحصل کو دیکھتے ہوئے ان کی بصیرتِ قلب کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اسے بجا طور پر وجدان الٰہی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی بدولت یہ شعراء اپنے جذبات کو حسین ترین صورت میں پیش کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔

اس سلسلے میں ہمیں کشمیری، اردو اور فارسی زبانوں کی صوفیانہ شاعری میں ان شعرا کی تخیلاتی ترسیل کی حسیت میں ایسی ہم آہنگی اور یکسانیت نظر آتی ہے جسے ایک معجزے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اپنی علمی کم مائیگی اور کتابی دنیا سے نابلد ہونے کے باوجود ان شعرا نے کشمیری کے شعری سرمائے کو اس طرح مالا مال کیا ہے کہ ان کی بیشتر منظومات کو بلاشبہ عظیم شاعری کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شمس فقیر کہتا ہے:

شنیاہ گژھتھی اوس میون اولۍ
امی ہا لولہ نارن زولیۍ

(میں نے خلاؤں سے پرے لامکان میں اپنا آشیانہ بنایا تھا۔ عشق کی آگ وہاں بھی پہنچی اور اسے خاکستر کر کے رکھ دیا)

کشمیر کے صوفی شاعروں کے حوالے سے دو حیرت انگیز باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر شاعر بالکل اُمّی اور ان پڑھ تھے جنھوں نے کبھی مکتب کا دروازہ تک نہیں دیکھا تھا۔ شمس فقیر پشمینہ سازی کے ایک کارخانے میں چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ سوچھ کرال اپنے آبائی پیشے یعنی مٹی کے برتن بنانے سے وابستہ تھا۔ رحیم صاحب کا گھرانہ اگرچہ پڑھا لکھا تھا مگر وہ خود ان پڑھ ہی رہا۔ صمد میر آرہ کشی کے علاوہ مزدوری بھی کرتا رہا۔ وہاب کھار پیشے سے آہنگر تھا۔ نعمہ صاحب سری نگر کے زیندار محلے میں قالینوں کے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ رحمان ڈار، مومن صاحب، کرم بلند، شاہ غفور، واز ہ محمود، رمضان بٹ گنستان، احمد ڈار، محمد کھار وعلی ھٰذا القیاس۔ یہ سبھی اگرچہ ظاہری دانش سے محروم ہی تھے لیکن ان کے شعور اور آگہی کو باطن کے علم نے روحانی اور فکری طور پر مالا مال کیا تھا۔

لیکن جب ان کی شاعری کا سرسری مطالعہ کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ نابغہ روزگار ہونے کی حد تک علم کی فضیلت سے بہرہ ور تھے۔ ان کے یہاں ایسی تلمیحات اور استعارات کی بھرمار ہے جس کی ودیعت صرف ایسے لوگوں کو ہوتی ہیں جنھوں نے اپنے وقت کی معتبر درس گاہوں اور دانش گاہوں میں کئی سال تک باضابطہ تعلیم حاصل کی ہو۔ کشمیری صوفی شعرا کے یہاں شاستر اور سنسکرت کی تراکیب کا برمحل استعمال اور استفادہ نظر آتا ہے جو واقعی حیران کن ہے۔ شمس فقیر نے پُران بھگوان، دھرم شاستر اور اوپدیش کا استعمال اپنے کلام میں بار بار کیا ہے۔ سنسکرت کے صحائف سے بشمول احد زرگر کئی ایسے شاعروں نے اسی طرح کی اصطلاحیں اور تلمیحات کا آزادانہ استعمال کیا ہے جن میں گیان، چھل کپٹ، یوگی، نرمل، پرلوک، مریادا، سدھی اور برہما وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ایسا لگتا ہے کشمیر کے ثقافتی ماضی کے مختلف ادوار میں جن فلسفوں اور عقیدوں کی یہاں پر آبیاری ہوئی جب یہ ملک بدھ مت، ہندو دھرم اور اسلام

کے فلسفہ اور طرز حیات کا گہوارہ رہا تو بعد میں صوفی شعرا نے بھی اپنے ماضی کے انھی عقیدوں اور مذاہب سے بالواسطہ ترغیب اور تحریک پائی۔ اور اسی کے زیر اثر صوفی شاعری میں یہ رنگِ اسلوب داخل ہوا۔ ان تہذیبی اور تمدنی اثرات نے اس نوع کی شاعری پر متوقع طور پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ جس طرح گل آفتاب اپنا چہرہ ہر وقت سورج کی طرف پھیرتا ہے، اُسی طرح تصوف انسانیت کا چہرہ صداقت کی روشنی کی طرف موڑتا ہے۔ کشمیری صوفی شاعروں میں جس انسانی سربلندی اور اقدار کی برتری کا سب سے زیادہ مظاہرہ نظر آتا ہے وہ یہی صداقت ہے۔ مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر صوفیاء کے بارے میں ''تزک جہانگیری'' میں ان دلچسپ حقائق کا اظہار کرتا ہے: ''اگر چہ وہ یعنی صوفی، ریشی اور فقیر مذہبی تعلیمات سے کماحقہ بہرہ ور نہیں ہیں اور نہ ہی انھیں دینی نزاکتوں کا علم ہے پھر بھی وہ سادگی اور صاف گوئی کے پیکر ہیں۔ وہ کسی کے خلاف قابل اعتراض زبان استعمال نہیں کرتے۔ وہ نفسانی خواہشات کو بس میں کیے ہوئے ہیں اور صرف ایک روحانی جستجو میں مصروف ہیں۔ وہ گوشت کا استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی شادیاں کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کھیتوں میں میوہ دار درخت اُگاتے ہیں تاکہ دوسروں کو اس کا فائدہ ہو۔ انھیں خود کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی''۔

ان شعراء میں دوسری اہم بات یہ دیکھی گئی ہے کہ ان کے یہاں جن داخلی محسوسات کو زبان دی گئی ہے ان کے ہم آہنگ کلام کا بعینہ تخیل دوسری کئی زبانوں میں بھی واضع طور پر نظر آتا نہیں ہے۔ ان کے کئی اشعار پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ شیخ ابراہیم ذوقؔ۔ مولانا رومی، امیر خسرو اور غالب کے ہیں۔ دراصل ایک دوسرے تک صوفیاء کے خیالات کی پراسرار ترسیل ان کے روحانی کمالات کی بدولت خود بخود زمان و مکان کی ساری حدود کو پھلانگ کر الگ الگ

اندازِ بیان میں بارِ دگر ظاہر ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ابھی شمس فقیر کے اس شعر کا ذکر ہوا کہ:

میں نے خلاؤں سے دور لامکان میں اپنا آشیانہ بنایا تھا کہ عشق کی آگ نے وہیں پہنچ کر اسے خاکستر کر دیا۔

اب ایک اردو شاعر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

آتش عشق کا یہ شب خوں نہیں تھا معلوم
جس نے سینے میں دہکتے ہوئے شعلے رکھے

شیخ نور الدین نورانی کہتے ہیں:

نفسی میون چھُ مُد ہوس تے
امی ہسی مونگنم کوتاہ بل
ساسن منز چھےُ اکھاہ لوش تے
نتہ امی ہیتی نم ساری تل

اس کا اردو ترجمہ جو نند لال طالب نے کیا ہے جو اس طرح ہے:

نفس میرا ہے بہت بد مست ہاتھی بے لگام
یہ توانا ہے بہت اور چاہتا ہے زور بل
اس کی زد سے اک ہزاروں میں بچے ہیں معجزہ
ورنہ اپنی زد میں لے آیا ہے یارو دل کے دل

شمس فقیر کا بھی یہی کہنا ہے کہ:

کم ذات زانھ نو سپدی یار
تس ناو چھی دپان نفس امار

(کم ذات جو کبھی آپ کا دوست نہیں بن سکتا، اس کا نام نفس امارہ ہے)

اور شیخ ابراہیم ذوق کا یہ مشہور شعر ہو بہو شیخ العالم اور شمس فقیر

کا عکاس دکھائی دیتا ہے:

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

حالانکہ شیخ نورالدین نورانی اور ذوق دہلوی کے ادوار میں صدیوں کی دوری ہے۔

احمد بٹواری کی مشہور نظم ''نےَ'' کا صرف یہی ایک شعر سن کر توجہ فوراً کہیں اور چلی جاتیہے۔ بٹواری کہتے ہیں:

ژور ژِہ ستیین ستھ سراخ کری نم یتھ بدنس
آوازِ شیر از حلقہ یندر از وزہ وان شش جہاتس

تو غیر شعوری طور پر توجہ مولانا رومی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے:

بشنو از نے چوں حکایت مے کند
وز جدائی ہا شکایت مے کند

لل دید کہتی ہیں:

کووہ چھک دِوان انہ نی بڑھ
ترکھ ہے چھکھ تہ اندری اژھ
شِو چھے اتھ تھی کنُ مو گڑھ
سیہزہ کتھہ میانہ کر تو پڑھ
اندھے کی طرح یوں نہ سکھی پھر ٹٹولتی
دانا ہے اگر اپنے ہی باطن کی سیر کر
تو جا کہیں نہ بس وہی شو کا مقام ہے
میرے سخن پہ بہر خدا اعتبار کر

اور شمس فقیر نے بھی اسی احساس کو یوں بیان کیا ہے:

ونئے بو سیر اسرار ینو آسکھ و بالی
میہ وچھ ہر شایہ سہٕ یار چھنو کانہہ موے تہِ خالی

اس فلسفۂ حیات کی بہت پہلے اس آیت کریم میں وضاحت ہوئی ہے کہ:

من عرف نفسه فقد عرف ربه

کشمیری یا اردو سے باہر بھی صوفیاء کا یہ فکری نظام ترسیل صدیوں کا احاطہ کرتے ہوئے قائم و دائم ہے۔ اصل میں صوفی شعرا ایک عجیب وغریب الٰہی قوت کے مالک ہیں اور خیالات کی یکسوئی ان کے فکر کا خاصہ ہے کیونکہ صوفی فلسفہ ایک ہی مدارِ تخیل کے اردگرد طواف کرتا ہے۔

مولانا رومی کا مشہور مصرعہ ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اور اس کے تقریباً پانچ سو سال بعد پنجابی کے ممتاز صوفی شاعر بابا بھلے شاہ کی کافی میں یہی بیان ہے:

مسجد ڈھاوے مندر ڈھاوے
ڈھیندا جو کجھ ڈھاوے
اک بندے نا دل نا ڈھاوے
رب دلاں وچ رہیندا

برصغیر کے صوفی شعرا کی ایک شہرہ آفاق شخصیت بابا فرید نے اپنے مریدوں سے کہا کہ اس کا خرقہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے اور وہ اس کی مرمت کرنا چاہتا ہے۔ انھیں اس غرض کے لیے ایک قینچی پیش کی گئی جسے انھوں نے یہ کہہ کر واپس کیا اور کہا کہ وہ قینچی نہیں چاہتے کیونکہ یہ کاٹتی ہے اور وہ دنیا میں کاٹنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آیا ہے لہٰذا انھیں سوئی اور دھاگہ چاہیے۔

اب مولانا رومی کا یہ شعر دیکھئے:

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

ممتاز کشمیری صوفی سخن گو احد زرگر کہتا ہے:

کافر سپدتھ کوُرم اقرار

یعنی میں پہلے کافر تھا اور اس کے بعد ہی میں نے ایمان لایا۔

حضرت امیر خسرو نے بھی اس باریک فلسفے کی اس طرح توضیح کی ہے:

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زُنار نیست

چند ناقدینِ ادب کا خیال ہے کہ صوفیانہ شاعری میں تخیلاتی ترسیل کی یگانگت ایک اتفاقیہ عمل ہے کیونکہ موضوعات کی مطابقت اور مماثلت دیگر شعرا کے یہاں بھی پائی جاتی ہے جس طرح دو مصور اپنے موقلم سے کبھی یکساں رنگ و روپ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس نظرئے کو رد نہیں کیا جاسکتا البتہ اس سلسلۂ عمل کو خاص کر تصوف کے پس منظر کے حوالے سے تعجب خیز ہی کہا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کشمیر اپنی انفرادیت اور قدرت کی کاری گری کے لحاظ سے صدیوں تک پیروں، فقیروں، سنتوں، سادھوؤں اور بھگتوں کے لیے عبادت الٰہی کا ایک پر سکون اور اہم مرکز رہا ہے جہاں فلک بوس پہاڑوں پر پھیلے ہوئے جنگلوں اور فطری مناظر کے خوش آئند شب و روز میں انھیں فیضان الٰہی حاصل ہوتا رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفۂ تصوف نے کشمیر میں کئی دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ موثر طور پر اپنی جڑیں مضبوط کرلی ہیں۔ جواب کشمیریت کے ایک تناور اور سایہ دار درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

سرزمین کشمیر نے اگرچہ لاتعداد صوفی شاعر پیدا کیے جن میں سے اکثر و

بیشتر کی تخلیقات زمانے کی دست برد کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہی صوفیانہ شاعری کشمیر کی سات سو سالہ ادبیات کا سب سے بیش بہا خزانہ ہے۔

کشمیری صوفیانہ شاعروں کی تعداد سینکڑوں میں ہے جن کا کلام نہ صرف یہ کہ خلط ملط ہوا ہے بلکہ اس نوع کی منظومات بار بار ایک دوسرے کے نام سے بھی شائع کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق و تلاش کی ضرورت ہے۔



اُنیسویں صدی کی اردو صحافت اور کشمیر

سرزمین کشمیر کے بارے میں جو تفصیلی اور وضاحتی تصانیف، سفرنامے، سماجی حالات اور دیگر توضیحی کوائف آج ہمارے پاس ضخیم تصانیف اور معتبر جرائد کی شکل میں موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ حصہ مغربی مستشرقین اور برصغیر کے اخبارات و رسائل نے ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں مغلوں کے حوالے سے شہنشاہ اورنگ زیب کے ہم سفر سر فرانکوئس برنیر اور اس کے بعد سینکڑوں مورخ، ماہر آثار قدیمہ، تحقیق و تلاش کے دیوانے کشمیر آکر یہاں سالہا سال تک قیام پذیر ہوئے اور انھوں نے وقت کا برمحل استعمال کرتے ہوئے اس خطہ فردوس بریں کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کر کے تاریخ، سفرناموں، تاثرات و خیالات کے بیش بہا خزینے ہمارے لیے محفوظ کر کے چھوڑ دیئے۔ ان میں برصغیر کے اخبارات و جرائد میں سفیرِ ہند امرتسر، دکن پنچ حیدرآباد، سرمور گزٹ ناہن، چودھوی صدی راولپنڈی، پنجابی اخبار، الوقت گورکھپور اور کئی اور رسائل قابل ذکر ہیں جن کے نسخے بدقسمتی سے آج موجود نہیں۔

مرحوم ڈاکٹر اکبر حیدری نے ان میں سے چند مجلوں کے عکس حاصل

کر کے پاکستان کی انجمن ترقی اردو کو بھیج دئے اور پھر انجمن نے ان میں سے نصف درجن رسالے ''اردو'' نام کے اپنے سہ ماہی جریدے میں شیرازہ بند کیے۔ لیکن ان میں کشمیر کے حوالے سے جو نگارشات اور اطلاعات مندرج ہیں، حیدری صاحب نے اپنے قلم کا استعمال کرتے ہوئے ان کا تفصیلی جایزہ نہیں لیا ہے جس کی بدولت اُس دور کے کشمیر کی تصویر نظروں کے سامنے آسکتی تھی۔

انیسوی صدی میں برصغیر میں اگر چہ اردو اخباروں کی تعداد بہت ہی کم تھی لیکن ان میں بھی وقتاً فوقتاً کشمیری عوام کی زبون حالی اور شاہی استبداد کے پنجے تلے دب کر ان کی بے بسی کا حال زیر تذکرہ لایا گیا ہے۔ اگر چہ اس حوالے سے کوئی مدلل اور تفصیلی اداریہ یا شذرہ ہماری نظروں سے نہیں گذرا۔ مدیران نے یا تو مختصر سی خبر استعمال کی ہے یا اسے کسی حد تک وضاحت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ البتہ یہ اتفاق قابل توجہ ہے کی ان سبھی اخباروں کی اشاعت مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1848-1925) کے دور میں ہی ہوئی اور اسی حکمران کے وقتِ شاہی میں کشمیر کے حالات کو بہت شہرت ملی۔ ڈوگرہ سلطنت کے بانی گلاب سنگھ نے تو اپنے مخالفوں کے ساتھ اس قدر بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک روا رکھا کہ وہ مسلمان حریفوں کو پکڑوا کر برسرِ عام ان کی کھال کھنچواتا تھا اور یہ دہشت نظارہ دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ پرتاپ سنگھ اس حد تک ظالم اور جابر نہیں تھا لیکن اس کی توہم پرستی نے اسے زیادہ تر اپنے ہی محل کا قیدی بنا دیا تھا کیونکہ علی الصباح جس شخص کا چہرہ وہ دیکھتا اگر اسے معلوم پڑتا کہ وہ مسلمان ہے تو وہ اسے نحوست سے تعبیر کر کے واپس محل میں لوٹتا پرتاپ سنگھ کے دور میں کئی اصلاحی کام بھی ہوئے جن میں کوہالہ سے بارہ مولہ تک کی جہلم ویلی سڑک خاص طور قابل ذکر ہے۔ اس نے کشمیر کا رابطہ گلگت اور لیہہ کے ساتھ قائم کیا اور اسی کے دور حکومت میں کشمیر میں زرعی زمین کی شیرازہ بندی عمل میں لائی گئی۔ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں کئی

مغربی تاریخ دان اور اصحاب قلم کشمیر آئے اور اپنے تاثرات کتابوں میں محفوظ کیے۔ ان میں خاص طور پر برصغیر کے مختلف علاقوں سے جن اخباروں اور جرائد میں ذکرِ کشمیر ہوتا رہا ان کی تعداد تو بہت زیادہ ہو گی لیکن ان میں سے چند ایک سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے۔

افغانوں اور سکھوں کے بعد ڈوگرہ حکام نے ریاست عوام خاص کر کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ ڈھائے ان کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ 1837 میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جموں کے گلاب سنگھ کو یہ کام تفویض کیا کہ وہ یوسف زئی قبیلے کی بغاوت کا سر کچلے۔ اس نے ہر پشتون کے سر کے لیے گلاب سنگھ کو ایک ایک روپے کی پیش کش کی۔ رنجیت سنگھ نے کئی عورتوں کی جان بخشی کی۔ باقی کو گلاب سنگھ کے حرم میں بھیج دیا گیا اور باقی ماندہ لاہور اور جموں میں کنیزوں کی طرح سرعام فروخت کی گئیں۔

1863ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ (1885-1830) نے سرحدی علاقوں یاسین اور ہونزہ پر فوج کشی کی تا کہ مسلمان باغیوں کو سبق سکھایا جائے۔ تمام مردوں کو قیدی بنایا گیا اور مندوری پہاڑی کے عقب میں یاسینی اور ہونزہ کی خواتین اور ان کے بچوں کو زخمی کیے جانے کے بعد زندہ جلایا گیا اور تقریباً دو ہزار یاسینی دیہاتی تہہ تیغ کیے گئے۔ لگ بھگ پانچ ہزار یاسینیوں کو سری نگر بیگار کے لئے لے جایا گیا اور ان کی عورتوں کو ڈوگرہ سپاہیوں کے حرموں یا زنانوں میں بھیج دیا گیا۔ اسی رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت کے بارے میں ''پنجابی اخبار'' (1856ء) کی بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار بالآخر کشمیر کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔ اس سے قبل اس کا ایک شذرہ یوں ہے:

''کوئی کشمیری ایسا نہیں جو گورنمنٹ کو یہ کہے کہ مہاراجہ صاحب سے ملک چھین لیا جائے اور بالفرض اگر گورنمنٹ کو درحالت اشد ضرورت ایسا ہی کرنا قرین

مصلحت ہو کہ مہاراجہ صاحب سے ملک لے لیا جائے کہ وہ عدل وانصاف نہیں کر سکتے تو کوئی بد عہدی کا اس پر جرم نہیں ہے۔ کیونکہ بر عہد کا ہماری گورنمنٹ میں یہ بات مفہوم ہے کہ ظلم ملک پر روا نہ رکھا جائے گا۔ گورنمنٹ کو خداوند کریم اور احکم الحاکمین کے سامنے ذمے واری ان لاکھوں روحوں کی ہے جو تعدی اٹھا رہی ہیں۔ حضرت سلامت مہاراجہ ساحب کا یہ فرض نہیں ہے کہ جو کوئی کوٹ پتلون پہن کر ان کی قلم رو میں جائے، آسمان پر چڑھا دیا جائے۔ جو وہ چاہے سو کرے۔ یہ بات تو آداب سلطنت سے بعید ہے۔ ہاں، اگر ہمارے معزز عہدہ داروں میں سے کوئی جائے تو معمولی اور باضابطہ مہمان داری مضائقہ ندارد، نہ کہ اس طور پر کہ دین ودنیا کی کچھ خبر نہ رہے۔ انگریز کیا آیا، ریاست میں گویا خدا آیا۔ قطع نظر اس کے اگر شامت اعمال سے مہاراجہ صاحب ملک کا روپیہ اسی طور بے جا صرف میں لانا ہی چاہتے ہیں۔ صرف اپنے ذاتی سلوک کے واسطے تو کریں۔ حوالہ بخدا۔ لیکن غریب رعایا نے کیا قصور کیا ہے کہ ان پر ظلم روا رکھا جاتا ہے یعنی کسی کو چابک مارے جاتے ہیں اور کسی کو ڈنڈے یا قلیل مزدوری پر انگریزوں کا کام ان سے لیا جاتا ہے۔ فرمایئے تو سہی، اس کے لیے کوئی انتظام مہاراجہ صاحب نے فرمایا ہے اور یہ امر داخلِ بدانتظامی ہے یا نہیں؟''

''سفیرِ ہند'' امرتسر سے جنوری 1880ء میں ابوسعید مولوی محمد حسین کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس کی 10 جولائی کی اشاعت میں ایک قاری نے کشمیر ہی کے حوالے یہ مراسلہ مدیر کو بھیجا جسے مولوی حسین نے من وعن شائع کیا۔ اس خط کا خلاصہ یہ ہے جو اس دور کے نظام کشمیر پر کسی حد تک روشنی ڈالتا ہے:

''ریاست کشمیر اور اس کے خاص معاملات

شہید عادتِ خویشم، ورا نمی بینم
کہ ما تمام فغانیم و یار پنبہ بگوش

پیارے ایڈیٹر (پنجابی اخبار)! اگر مجھے افسوس ہے تو اس امر کا ہے کہ میں نے یہاں کی متعصب کارروائی کی بنا پر آپ کے اخبار کے کالموں کے کالم سیاہ کرڈالے مگر ریاست کے کانوں پر انصاف پسندی کی جوں تک نہ ہلی۔ بلکہ نتیجہ برعکس ہمارے ظہور میں آیا ہے۔ سچ ہے:

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہر درویش بر جانِ درویش

اس مہاراجہ کے دور میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہر شعبے میں جو امتیازی سلوک روا رکھا گیا اس کی طرف بھی اس مراسلے میں نشان دہی کی گئی ہے:

"یعنی اس ہماری پر درد نالہ وزاری پر ریاست نے آگے سے زیادہ شیر ہو کر ایسے تعصب کے قہقہے اڑائے کہ باید و شاید۔ بلکہ اگر سچ پوچھو تو درّانی سلطنت کا انتقام لیا۔ خیر ہوا سو ہوا۔ مگر ہم کو بھی قسم ہے اپنی سچی شرم اور ہٹ کی جب تک ہماری آہ جگر سوز آسمان شگاف کچھ اثر نہ دکھلائے گی تب تک ہم بھی باز نہ آئیں گے۔ بقولے کہ:

کنگرۂ وصل او گرچہ نہ دارد کمند
نالۂ شب گیر را تار رسیدن دہم

پر ہم کو پورا پورا عمل درآمد ہے اور نالۂ شب گیر و آہ جگر سوز بھی کیسا، جیسا کہ اس بڑھیا کے حق میں کہا گیا ہے:

نیم شبے آہ زند پیرِ زال
دولتِ صد سالہ کند پائمال

مختصر اگر اس تمہید قائم کرنے سے کوئی خوشامدی سنگھ بہادر وہی پرانے سے پرانا جواب نذر کریں گے یعنی اہل اسلام کا فقط قحط میں کام آنا، پنڈتوں کا آرام پانا، مندر معبدوں کے لیے اہل اسلام سے بجبر و تعدی ہزار ہا روپیہ وصول

کرنا اور وہ روپے صرف اپنے ہی معبدوں پر خرچ کرنا، شاہی مسجدوں خانقاہوں کو ذخیرۂ بارود و غلہ بھر بھر کر ویران کرنا، سوداگروں سے فی صد پچاس روپے محصول لینا تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ خیر! یہ تو پرانا قصہ ہے۔ ایک اور نو ایجاد ستم سنئے کہ حضرات پنڈتوں نے سری مہاراج صاحب بہادر کے دل پر یہ نقش جمایا ہے کہ اسلامی رعایائے کشمیر حضور کے ہوا خواہ نہیں۔ دلیل یہ کہ انھوں نے قحط میں مر مر کر حضور انور کو بدنام کیا ہے۔ مختصر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور انور نے مسلمان اہل کار یک قلم بلاوجہ معزول کر دئے۔ مثل جناب میرزا عزیز الدین و میرزا سعد الدین وزیر وزارت و نائب وزارت ضلع شہر خاص وغیرہ۔ اگر چہ مسلمان اہل کار فی صد ایک بھی نہ تھا، ان کی جگہ حضرات پنڈتوں و ڈوگروں کو سرفراز کیا گیا۔ مثل دیوان ہیرانند وزیر وزارت ضلع مذکورہ و پنڈت ڈشمبر ناتھ جو نائب وزارت ضلع مذکورہ ہیں۔ ناظرین کو یہ بھی ملحوظ رہے کہ ملک کشمیر چھتیس پرگنوں پر منقسم ہے۔ چناں چہ کسی کشمیری شاعر کا قول ہے کہ:

شہر کشمیر مرز خوب و خوش است
پرگنائش تمام سی و شش است

جن پر حضرات پنڈت منصوب ہیں۔ صرف تین تحصیلوں پر مسلمان تھے، سو وہ بھی معزول کر دئے گئے۔ ان کے نام یہ ہیں: ملہ مہدو تحصیل دار پرگنہ پنچسہ، قدوس میر پرگہ چھراٹ، عمر شاہ تحصیل دار پرگنہ کوٹھار، اس تبیین سے ناظرین یہاں کے مسلمان اہل کاروں کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس قدر ہیں اور یہ کہ یہ وزیر صرف مسلمان ہونے کی بنا پر معطل کیے گئے۔ قیاس کرنا چاہئے کہ روئے زمین کے مسلمان اپنے دین فخر کریں اور کشمیر میں وہی دین و بالِ مال و جان ہے:

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نہ شد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بے جا سوختیم
۔راقم از سرینگر کشمیر

''پنجابی اخبار'' کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے بعد میں یا تو پیسے کے لالچ میں یا سرکار کے رعب کے نتیجے میں مسلمان دشمن پالیسی اختیار کی اور اخبار کو حکومت وقت کی تعریف وتوصیف کے لیے وقف کیا گیا۔اس کے بعد اس کی اشاعت میں بہت کمی واقع ہوئی۔

''دکن پنچ'' 1887ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا اور نے بھی وقت وقت پر کشمیر کے حال زار پر ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ کشمیر کے تعلق سے اگرچہ اس کے مالک پر کئی بار کشمیر کے دربار سے دھمکیاں بھی جاری کی گئیں مگر اس نے ہار نہ مانی اور اپنے قلم کو حق بیانی کے لیے وقف رکھا۔

اپنی 17 جولائی 1889 کی اشاعت میں اس نے ''کشمیر کے بارے میں انکشاف'' کے عنوان سے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے خلاف ایک انگریز اہل کار سر لیپل کا یہ زوردار شذرہ تحریر کیا:

''یہ شخص (پرتاپ سنگھ) ہرگز اس لائق نہیں تھا کہ اس کو مسند نشین کیا جائے۔اس شخص کے والد مجھ سے کہتے تھے کہ مجھ کو امید نہیں کہ میرے بڑے فرزند کا چال وچلن کبھی درست ہو سکے۔اس شخص کے دادا نے جموں کی ریاست کو قائم کیا تھا۔ یہ شخص ریاست کو کھو بیٹھے گا۔ یہ شخص بالکل عقل کا پتلا اور اپنے نوکروں کے ہاتھ میں ہے اور بدروش لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ یہ شخص اپنے جذبات کا غلام ہے اور بڑا وہمی اور خیالی آدمی۔اس شخص نے ایسی بدروشیاں کی ہیں کہ ان سبب سے اس کو درحقیقت مسند سے اتار دیا گیا ہے اور ریزیڈنٹ اس کونسل کا کارفرما ہے۔ میری اس شخص کے والد سے ملاقات تھی۔ انھوں نے

پیشین گوئی کی تھی کہ میرے والد نے جموں کی ریاست قائم کی تھی، میرا بیٹا اس کو کھودے گا۔ وہ پیشین گوئی پوری ہوتی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ مہاراجہ گلاب سنگھ بڑے بددیانت اور خونی ظالم تھے مگر انھوں نے اپنا وعدہ ہمارے ساتھ وفا کیا اور اپنی عمر بھر ہمارے دوست رہے اور انھوں نے بغاوت کے زمانے میں ہماری مدد کی۔۔۔ تیسرے مہاراجہ بڑے شرابی اور عیاش ہیں۔ جو خاندان شاہی کی دغا اور خون ریزی سے قائم رہے۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ خاندان اسی رسوائی کے ساتھ غارت ہو جائے جس طرح کہ اٹلی کا بورجیا والا خاندان غارت ہو گیا''۔

ان اخباروں کے مطالعے سے یہ حیران کن امر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخصی راج کے ظلم واستبداد کے باوجود سچ بات کہنے سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ آج کل اگرچہ کئی ممالک میں آمریت کی جگہ جمہوریت نے لی ہے لیکن ذرائع ابلاغ میں ایسی حق گوئی اور بے باکی شاذ ونادر ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ مندرجہ بالا تحریریں اس کی واضع مثالیں ہیں۔

منشی سراج الدین احمد علامہ اقبال کے گہرے دوست تھے۔ وہ کئی سال تک سری نگر کشمیر میں ریزیڈنسی میں میر منشی رہے۔ ادب کے ساتھ ان کا گہرا لگاؤ تھا اور وہ ادبی اور اور دیگر موضوعات پر علامہ سے متواتر طور پر خط وکتابت کے ذریعے تبادلہ خیال کرتے تھے۔

منشی صاحب نے اخبار ''چودھوی صدی'' راولپنڈی سے شائع کیا لیکن یہ کچھ وقت بعد ہی بند ہوا اور پھر اسے ایک ماہنامے کی صورت میں منظر عام پر لایا گیا۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں:

''اخبار میں اچھی اور معیاری کتابوں اور نئے اخبارات پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔ ایڈیٹوریل زیادہ تر کشمیریوں سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ 1885ء میں

کشمیر کے حکمران ہوئے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ انتظامیہ کے لیے ریاستی کونسل تشکیل دی اس میں کسی مسلمان ممبر کو شامل نہیں کیا گیا۔ اکثریت کے باوجود مسلمانوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ ان کے حقوق پامال کیے جاتے تھے اور وہ زیادتیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ''چودھوی صدی'' نے ان کی دبی ہوئی آواز کو بلند اور انتظامیہ، خاص کر سورج مل کے سخت گیر روئے کو تشت از بام کیا۔ اخبار افسر شاہی کے مظالم کی پرزور مذمت کرتا تھا اور اپنے اداریوں میں کشمیریوں کے حقوق کی ترجمانی زور و شور سے کرتا تھا۔ غرض یہ کہ اخبار ''چودھوی صدی'' ادبیات کے علاوہ تاریخ کشمیر کے ایک گم شدہ باب کے عینی مشاہدے کی دستاویز بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی اخبار کی 8 جون 1895 کی اشاعت میں ''کشمیر کے مسلمانو! تمہارا خدا حافظ'' کے عنوان تلے یہ شذرہ قلم بند ہے:

''جو واقعات سال گزشتہ میں ریاست کشمیر میں گذرے ہیں، ان کی کیفیت اگر مفصل بیان کی جائے تو کوئی شخص، سوائے ایسے چند لوگوں کے جن کو ایسا ہی سر اور دماغ قدرت نے عطا کیا جیسا کہ کرنل بار صاحب سابق ریذیڈنٹ کشمیر کو دیا گیا تھا، یقین نہ کرے گا کہ اس انیسوی صدی کے آخر میں، جب کہ انصاف اور نیکی اور تہذیب کے مدعی ہمارے ملک پر حکومت کر رہے ہیں، ایسے واقعات گذر سکتے ہیں۔

کرنل بار نے کشمیر کا ریزیڈنٹ ہونے کے زمانے میں ہم کو اب یاد نہیں ایک بھی ایسا کام یا فیصلہ کیا ہو جس میں وہ غلطی یا غلط کاری سے بچا رہا ہو۔ اس کے زمانے کا امتیاز یہی ہے کہ تمام ناممکن باتیں اس عہد میں ممکن تھیں۔ افسوس ہے کہ کرنل بار میں سوائے اس کے کوئی فضیلت نہیں تھی کہ وہ فاتح قوم میں سے تھا۔ انگلستان کی زمین پر پیدا ہوا تھا اور اس کے چمڑے کا رنگ سفید تھا۔ ایسا شخص ریاست کشمیر میں انگریزی سلطنت کا نائب تھا اور ریاست کشمیر پر حکمران بنایا گیا

کیونکہ کونسل ریاست پر حکومت کرتی ہے اور کونسل پر ریذیڈنٹ حکومت کرتا ہے۔ اس کی بے شمار غلط کاریوں نے کشمیر کونسل کے مسلمان ممبر کو آخر کار مجبور کردیا کہ وہ کونسل کی ممبری سے دست بردار ہوکر اپنے عہدے پر واپس آجائے۔ کشمیر کی ہندو کونسل نے مسلمان ممبر کے چلے جانے کے بعد جو ظلم اور تعدی مسلمانوں پر کی ہے اور جس بے رحمی اور ناخدا پرستی سے ایک ایک مسلمان کو چن چن کر کشمیر سے نکالا ہے اس کی دل شگاف کیفیت کہیں تو کس سے کہیں؟۔ سوائے خدا کے کوئی سننے والا نہیں:

سر کنم شکوہ اگر تابِ شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

اخبار کے اسی شمارے میں مدیر نے 1893ء کے اعداد وشمار کے مطابق مختلف مذاہب ماننے والوں کا کشمیر کی آبادی میں تناسب کا یہ نقشہ پیش کیا ہے:

صوبہ جموں	ہندو	631225 :	مسلمان	797459 :
صوبہ کشمیر	ہندو	68316 :	مسلمان	883099 :
لداخ	ہندو	182 :	مسلمان	2991 :
اسکردو	ہندو	64 :	مسلمان	110022 :
گلگت	ہندو	13 :	مسلمان	139 :
میزان:	ہندو	699800 :	مسلمان	1793710 :

سرکار کی طرف سے کشمیر اور جموں میں مسلمانوں کی آبادی کی رپورٹ مفید عام پریس، لاہور میں طبع کی گئی۔ یہ اعداد وشمار فراہم کرنے کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ صوبہ جموں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے قریب پونے دو لاکھ سے زیادہ ہے اور کشمیر میں تو نو لاکھ مسلمانوں کی تعداد میں ہندوؤں کی ساٹھ ہزار تعداد آٹے میں نمک ہے۔ ریاست کشمیر کے اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کو بے پناہ اور ان

کے حقوق کو ایک ہندو کونسل کے خطرناک ہاتھوں میں چھوڑ دیا ہے۔ ایک مسلمان ممبران کو دینے سے بھی دریغ ہے اور اس تمام زمانے میں نہایت خاموشی سے سینکڑوں مسلمانوں کو ظلم اور بے رحمی کا شکار ہوتے دیکھا ہے اور آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ ان پر کیا گذری ہے۔

23 جولائی 1895 کی اشاعت میں صفحہ اول پر یہ عبارت درج ہے:

'ہمارے آج کے اخبار کا بڑا حصہ ریاست کشمیر کے مسلمانوں نے لے لیا ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی حالت نہایت قابل رحم اور دردناک ہوگئی ہے اور تمام مسلمانوں کا، جو انگریزی سلطنت کے پر امن سائے میں رہتے ہیں، بہ لحاظ اسلامی اخوت کے فرض ہے کہ اپنے برادران کشمیر کی ہم دردی کریں۔ پس ہمارے دوست ہم کو معاف کریں گے اور کشمیر کے مسلمانوں کے حال کو دل چسپی اور دل سوزی سے پڑھ کر ان مصیبت زدوں کے حال زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر خداوند کریم سے ان کی بھلائی اور اس مصیبت سے نجات پانے کے واسطے دعا کریں:

یوں ہی گر روتے رہے ہم سب تو اے اسلامیان
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویران ہوگئیں

کشمیر کے ایک نام نہاد پنڈت مورخ گواشہ لال کول کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس نے اخبار ٹریبیون میں علامہ محمد اقبال پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف کشمیری مسلمانوں کو مسلح جدوجہد پر اکسایا تھا۔ اس شر آمیز خبر کی سارے لاہور کی صحافتی دنیا نے مذمت کی اور گواشہ لال کو ایک مفسد صحافی قرار دیا۔ چودھوی صدی اخبار اپنی مندرجہ صدر اشاعت میں اسی بدخو گواشہ لال کی ایک اور خود ساختہ خبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''ٹائیمز میں جو مضمون کشمیر پر چھپا ہے اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان پر

کس قدر سخت ظلم ہوتے ہیں اس کا بے تکا جواب دیتے ہوئے ٹریبیون لکھتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ صاحب کے وقت میں جو کشتیوں میں آدمی بھر کر ڈبو دینے کا الزام لگایا گیا تھا وہ کسی مایوس شدہ آوارہ گرد پنجابی مسلمان نے اپنی قوم کی عادت کے مطابق لگایا تھا۔ بلاشبہ پنجابی مسلمان شرافت اور نجابت میں بنگالیوں کو نہیں پہنچ سکتے مگر کشمیر میں جس شخص نے اس واقعے کی مخبری کی تھی وہ ایک کشمیری پنڈت صاحب تھے جو بنگالیوں کا ایک دوسرا نام ہے۔ یہی صاحب اس قصور میں کشمیر سے خارج کیے گئے تھے۔ بعد ازاں ان کو وطن میں آنے کی اجازت دی گئی۔ اب تک زندہ موجود ہے۔ کچہری میں وکالت کرتے ہیں۔ ان کا نام بھی کسی سے چھپا ہوا نہیں۔

اسی شمارے میں ایک طویل اداریہ تحریر ہے جس کا عنوان ہے ''گورنمنٹ کو کیا کرنا چاہئے؟ مسلمانان کشمیر کی حق تلفی کا اصلی سبب''

لکھتے رہے جنوں میں حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس طویل اداریئے کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کا ضرور باعث ہوگا:

''کاش ہم کو کوئی فراموشی کی دوائی کھلا دیتا یا نسیان کی بیماری ہو جاتی اور ہم بھول جاتے کہ ریاست جموں کشمیر میں چھ لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کا کوئی خبر گیران نہیں، کوئی پرسانِ حال نہیں، کوئی پناہ کی جگہ نہیں اور ان کے سر پر ہندو کونسل کے تعصب، ظلم اور بے رحمی کا آرا چل رہا ہے۔ فریاد کر کر کے تھک گئے ہیں مگر شامت اعمال ہے کہ ان کی کوئی فریاد بھی نہیں سنی جاتی۔ ہاں! اگر ہم یہ سب بھول جاتے تو کشمیر کا نام لینا چھوڑ دیتے اور بھول کر بھی کبھی یاد نہ کرتے یا یہ کہ کونسل خدا کا خوف کرتی اور ان ستم زدہ اور بد بخت مسلمانوں کا تعاقب اور شکار کرنا چھوڑ دیتی۔ تو ب ہم بھی خاموش رہتے لیکن

جب یہ سب کچھ جانیں اور سب کچھ دیکھیں اور سبب کچھ نہیں تو پھر کیونکر صبر ہوسکتا ہے۔ آخر پہلو میں دل رکھتے ہیں۔ جب اس میں درد ہو تو آہ کا نکلنا ضرور ہے۔ اگر اب کونسل معاف کرنے پر آتی تو مسلمانوں کا قصور شائد کچھ بڑا قصور بھی نہ تھا۔ قصور یہی ہے کہ مسلمان ہیں۔ نکالے سے سب نکلتے بھی نہیں۔ کونسل اپنی گذشتہ شش ماہی کی کوششوں سے، جو اس نے مسلمانوں کو ملک بدر کرنے اور کشمیر سے نکالنے کی کی ہیں، حساب کرسکتی ہے کہ اگر اسی نسبت سے ان کا اخراج ہوا تو اٹھارلاکھ مسلمانوں کے نکالنے کے واسطے کتنا لمبا عرصہ درکار ہوگا اور آج یا کل یہ حسرت اور ارمان قبر میں ساتھ لے جانا پڑے گا۔ ہماری صلاح مانیں تو ان گنہگاروں اور شامت زدوں کو معاف کردیں اور کچھ نہیں تو چین سے بیٹھنے ہی دیں:

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہیں، کافر نہیں ہیں ہم"

ان اخباروں میں اگر چہ کشمیر کے تناظر میں یہاں کے سیاسی کوائف اور واقعات کو ہی زیادہ توجہ کے درخور تصور کیا جاتا لیکن گورکھپور سے 1892 میں شائع ہونے والے "الوقت" نے اپنے 15 مارچ 1893 کے شمارے میں کشمیر میں ایک جان لیوا جاڑے کا حال یوں بیان کیا ہے:

"کشمیر میں امسال سردی ایسی سخت پڑی کہ بیان کرتے ہیں کہ سمت 1936 (1889) کے بعد سے یہ دوسرا موسم سرما کا ایسا کڑا ہوا ہے۔ کوچہ و بازار، درودیوار برف مجسم ہورہے ہیں۔ مکانوں کے صحن میں چھ چھ گز برف اونچی جم گئی ہے اور ایسا پاکیزہ برف کا فرش معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس پر سفید کپڑے پہن کر لیٹتے پھرے تو کیا مجال کپڑوں پر کہیں داغ تک پڑجائے یا میلا ہوجائے۔ دریائے جہلم 7 فروری کو ایک فٹ گہرا جم گیا تھا اور اس کے بعد تمام سطح بلوری

ہو رہی ہے اور بعض حصوں میں گز بھر سے زیادہ جما ہوا ہے۔ لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ پانی پینے کے لیے گلاس ہاتھ میں رکھا اور کھانا کھانے بیٹھے۔ جب پانی کی ضرورت پڑی تو دیکھا کہ گلاس جم کر قلفی ہو گیا ہے۔ حقہ تازہ کیا۔ چلم بھری گئی۔ دو چار ہی دم لگائے تھے۔ دفعتاً آواز بند ہو گئی۔ ہر چند کش لگاتے ہیں مگر آواز نہیں آتی۔ آخر معلوم ہوا کہ جہاں تک پانی ہے وہاں تک جما ہوا ہے۔ جائے ضرورت گئے، گرم پانی ساتھ لیتے گئے لیکن اگر بد قسمتی سے وہاں دیر ہو گئی تو پھر وہیں سے ہوں ہوں کر رہے ہیں کہ اور پانی آئے تو اٹھیں۔ کیونکہ لوٹین کا پانی تو برف کا ڈلا بن گیا تھا۔ غرضے کہ عجب شامت اور مصیبت ہے۔ اس تاریخ تک تھرمامیٹر بارہ درجے تک پہنچ گیا اور اگر سردی کی یہی کیفیت رہی تو انشااللہ صفر تک جا پہنچے گی۔ اس موسم کی سختی کی وجہ سے چھ سات واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ لوگ راہ چلتے سردی میں ٹھٹھر کے رہ گئے اور دیکھتے دیکھتے جان گئی"۔



ابھینو گپت

کشمیر میں سنسکرت کی دنیا کا گوہرِ نایاب

ہندوستان کی سب سے بڑی اور قدیم کلاسیکی زبان سنسکرت کو اس لحاظ سے ایک خاص فوقیت حاصل ہے کہ اس زبان کے ذریعے ہندو دھرم کے سبھی مذہبی اور عقیدتی صحیفے عوام تک پہنچے جن میں وید، اوپنشد، مہابھارت، رامائن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسے آکاش وانی یعنی آوازِ فلک بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دیوی دیوتاؤں کی بھی زبان رہی ہے۔

کشمیر کے خطہ ارضی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی مٹی نے سنسکرت کے عدیم المثال شاعروں، ادیبوں، ماہرین لسانیات و جمالیات، طنز نگاروں، مورخوں، محققوں، موسیقاروں، ڈراما نویسوں، طبیبوں، قانون سازوں، مذہبی علماء اور سیاست دانوں کو جنم دیا جن کے علمی تبحر نے دور و نزدیک پہنچ کر ان میں سے ہر ایک کو عالمی سطح پر اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔

کشمیر میں بالخصوص بودھوں اور ہندوؤں کے ادوار حکومت میں سنسکرت کے جن ممتاز فلسفیوں، تاریخ نویسوں، تحقیق کے ماہرین اور علمائے دہر نے اپنے علم و فن کے جوہر دکھائے اُن میں آنند وردھن (820-890)، کھیمیندر (990-1070)، جونہ راج (1411-1463)، کلہن اور سوم دیو (بارھویں صدی) اور سوم آنند، بلہن اور ناگ ارجن شامل ہیں جن کے جزوی حالات

زندگی بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہیں سے علم بلاغت، منطق، فلسفہ اور دیگر مختلف علوم کی تحقیق وتوضیح کا آغاز ہوا۔ کالیداس کے بارے میں بھی چند مورّخوں کا خیال ہے کہ وہ بھی کشمیر نژاد تھا۔ اس دعوی کی تصدیق میں انھوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس کے چند ڈراموں میں کشمیر کے زعفران اور کئی ایسے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو صرف کشمیر ہی میں پائے جاتے ہیں، لیکن دستاویزی حوالوں کی بنا پر یہ دعوی مدلل طریقے پر ثابت نہیں ہوسکا ہے۔

کشمیر میں تحریر کردہ سنسکرت کے قدیم ترین صحیفے "نیلہ مت پوران" کے مطابق سرزمینِ کشمیر پہلے پہل ستی سرنام کی ایک جھیل تھی جس میں جلد بھو نامی راکھشس رہتا تھا۔ وہ ہر صبح کنارے پر آکر مقامی آبادی میں سے کئی انسانوں کو پانی کے اندر گھسیٹ کر انھیں نگل جاتا تھا۔ اس عذاب سے نجات پانے کی خاطر انھوں نے ایک خدا دوست ریشی کشیپ سے فریاد کی کہ وہ انھیں اس بلا سے آزاد کرے۔ کشیپ ایک ہزار سال تک عبادت کرتا رہا۔ پھر اسے آسمانی آواز کے ذریعے ہدایت ملی کہ وہ وادی کے شمال میں بارہ مولہ قصبے کے پاس پہاڑ میں اپنے آہنی ترشول سے سرنگ نکال کر وہیں سے پانی کے نکاس کو ممکن بنائے۔ کشیپ کے اس اقدام سے جھیل کا سارا پانی شمال مغرب کے میدانی علاقوں کی جانب بہہ نکلا اور جلد بھو سطح آب پر نمودار ہوا لیکن جب اسے کشیپ نے قتل کرنا چاہا تو وہ بھاگتا ہوا دور ایک جگہ پہنچا اور وہیں پر زیر زمین چھپ گیا۔ دریں اثناء کشیپ کی حامی ایک دیوی نے مینا کا روپ دھار کر اپنی چونچ میں ایک کنکر لے کر جلد بھو پر پھینک دیا جس سے یہ دیو زمین میں دھنس کر ہلاک ہوگیا۔ اس کنکر کی جگہ ایک پہاڑی نمودار ہوئی جسے ہاری پربت یعنی مینا کا پربت کہتے ہیں۔ شہر سرینگر کے وسط میں اسی پہاڑی پر کشمیری پنڈتوں کا ایک مقدس مندر ہے جہاں

ہر روز علی الصباح کشمیری ہندو پوجا کی خاطر کئی سیڑھیاں چڑھ کر عبادت کرتے ہیں۔ اسے مقامی طور پر شارِکا دیوی مندر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کشیپ ریشی کے نام پر ہی اس خطے کا نام کشمیر پڑ گیا۔

اس دیومالائی حکایت کو یہاں اس مقصد سے بیان کیا گیا تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو سکے کہ کشمیر کے علم و آگہی کے ان اساتذہ نے بھی سنسکرت کو ایک دیومالائی زبان کی حیثیت میں اپنایا کہ ان کی تخلیقات کو بھی صحیفوں کی طرح مخصوص عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا اور پرکھا جائے۔ ورنہ وہ مروجہ زبانوں پالی اور پراکرت کو ہی ترجیح دیتے۔

کشمیر کی سرزمین مرکز علم و ادب بننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان بھر سے یہاں اہالیان فن اور اصحاب دانش جوق در جوق آئے کیونکہ انھوں نے اس خطے کی قدرتی خوبصورتی کے قصے ذوق وشوق سے سنے تھے جن کی رو سے کشمیر عبادت الٰہی کے لیے نہایت ہی پرُسکون اور اطمینان بخش جگہ تھی جہاں فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں اور دلکش باغوں اور بوستانوں کے آس پاس بقول علامہ اقبال: ''من خدارا دیدم آں جا بے حجاب''۔ ملک کے تپتے صحراؤں اور حدت سبھرے میدانی علاقوں کے برعکس انھیں کشمیر کی شاداب اور شگفتہ وادی میں روحانی طمانیت نصیب ہوئی جس کی بدولت انھوں نے اپنے فکری استدلال کے سہارے ادب لطیف کی وہ انمول قندیلیں روشن کیں جن کے نور سے ہند بھر کے دانشوروں اور طالبانِ علم کے اذہان منور ہو گئے۔

جب اشوکِ اعظم (304-232 BC) کے دور میں بدھ مت کشمیر میں وارد ہوا تو اس دھرم کے پیروکاروں نے جو تصانیف تخلیق کیں وہ پالی زبان کے برعکس سنسکرت ہی میں تحریر کی گئیں حالانکہ ہندوستان بھر میں پالی ہی بودھوں کی مسلمہ زبان کی حیثیت میں عوام الناس میں رائج تھی۔ اس زبان میں اگر کچھ

کتابیں لکھی گئی ہوں تو اب نہ ان کے آثار ملتے ہیں اور نہ ہی ان کا تذکرہ، لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آسکتی کہ بدھ مت کے اصلی صحائف کے ساتھ پالی یہاں نہ پہنچی ہو۔(1)

کشمیر چودھویں صدی عیسوی تک سنسکرت کے علماء و فضلاء کا مخصوص علاقہ رہا ہے۔ جارج گریرسن کہتا ہے کہ: ''تقریباً دو ہزار سال تک کشمیر سنسکرت کے علوم کا مرکزِ فیضان رہا جہاں تاریخ، شاعری، حکایات اور فلسفہ کی جولانیاں اہل فکر کی رہبری کرتی رہیں''۔ روایت ہے کہ اس دوران کشمیری خواتین بھی عام طور پر سنسکرت اور ایک اور قدیم زبان پراکرت ہی میں ایک دوسرے سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔ سنسکرت ان دنوں سارے کشمیر میں اتنی عام فہم تھی کہ اسلام کے کشمیر میں آنے کے بعد بھی قبرستانوں میں سنگ ہائے مزار پر کتبے اسی زبان میں کندہ کیے گئے۔ ممتاز دینی رہنما سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدوم نے اپنا وصیت نامہ سنسکرت زبان ہی میں قلم بند کروایا۔

اس طرح سے ہندوستان کی ملی جلی ثقافت اور تاریخی میراث میں کشمیر ہی کے سنسکرت عالموں نے اپنی فکرانگیز تخلیقات سے ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے علمی تبحر کا چرچا نہ صرف ہند بلکہ وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا تک پہنچا۔ اشوک اور کنشک کے ادوار حکومت میں مہایان بودھ فلسفے کی تعلیمات مقامی راہبوں، لاماؤں اور رضا کاروں کے ہزاروں میل کے سفر کی بدولت چین، کوریا، جاپان اور تبت تک پھیل گئیں۔

کشمیر کے سنسکرت قلم کاروں نے بالخصوص شاعری کے میدان میں اپنا کمال دکھایا کیونکہ کشمیر کے فطری حسن نے انھیں اس نازک صنفِ فن کی طرف راغب کیا۔ کشمیر کے حیات بخش سبزہ زار، گنگناتے ہوئے روپہلے آبشار، مخملیں چراگاہیں، صاف و شفاف جھیلیں ان کی سخن گوئی کو جلا بخشتی رہیں مگر اس کے ساتھ

ہی انھوں نے ملک کی ثقافتی دنیا کو ڈراما، رزمیہ، نغمہ، انشائیہ، افسانہ اور تدوین و ترتیب کے حوالے سے بھی شاندار ادبی سرمائے سے مالا مال کیا۔ اسی تناظر میں گیارھویں صدی کے شاعر بلھن نے کہا کہ: ''کشمیر میں شاعری ایک دل نشین مہک کے ساتھ یہاں کے زعفران کی طرح اگتی ہے''۔ کشمیر کے سنسکرت سرمائے سے ہندوستان کے شاہی درباروں میں حکمرانوں اور شہزادوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اس میں کالیداس کے ڈراموں پر مبسوط تجزیہ نگاری اور کیرالا کے واسدیو بھٹاٹری پر کشمیر کے رام کنٹھ کا خاص تبصرہ شامل ہیں۔

ابھینو گپت (950-1020 A) کشمیر میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس نے کئی علماء، صوفی اور ماہرین جمالیات پیدا کیے تھے۔ ابھینو گپت نے پندرہ اساتذہ سے فلسفہ اور فن میں خاطر خواہ تربیت حاصل کی۔ اس نے اپنی ستر سالہ زندگی میں پینتیس تصانیف تخلیق کیں جن میں سب سے ضخیم اور سب سے مشہور ''تانتر لوک'' ہے جسے تمام فلسفیانہ علوم کی اینسائی کلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بالخصوص کشمیر کے شیو فلسفے کی توضیح و تشریح بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ اس بے بہا تصنیف کا صرف اطالوی زبان میں ایک ترجمہ موجود ہے جسے رانیرو نولی (Raniero Gnoli) نے کیا تھا اور جس کا دوسرا ایڈیشن 1999ء میں شائع ہوا۔ اسی کتاب کے انتیسویں باب کو جان آر دوپوچے (Dupuche) نے انگریزی میں منتقل کیا۔ تانتر لوک کا اگرچہ کوئی انگریزی ترجمہ دستیاب نہیں لیکن شیومت کے ایک سرکردہ کشمیری عالم سوامی لکشمن جو نے اس کی تلخیص کی جسے اس نے اپنی انگریزی تخلیق **Kashmir Shaivism- The Secret Supreme** میں شامل کیا۔

ابھینو گپت ساری عمر بودھ مت سے متاثر رہا۔ ابھینو گپت اُس کا اصلی نام نہیں تھا بلکہ یہ لقب اسے اپنے ایک گمنام استاد نے دیا تھا جس اس کی شخصیت

میں صلاحیت اور قوت کے جوہر نظر آئے تھے۔ کشمیری مورخ پریم ناتھ بزاز کی رائے میں "ابھینو گپت شیو فلسفے کا عظیم ترین مبلغ اور سر برآوردہ ادبی نقاد تھا جس کی مشہور عالم تصنیف تانترلوک کو بجا طور پر وحدت الوجود کی بہترین تشریح کہا جاسکتا ہے۔ اس یادگار تخلیق میں 5,800 بند تھے اور اسے سینتیس ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (2)

ابھینو گپت کی ماں ایک یوگنی تھی اور اس کے بیٹے کے بارے میں خدا دوست اہل دل نے پیشین گوئی کی تھی کہ اسے رحم مادر ہی میں بھگوان شیو کی شکل و صورت عطا کی گئی تھی۔ ابھینو گپت کی والدہ ہوملا کا اس وقت انتقال ہوا جب وہ صرف دو سال کا تھا۔ چونکہ اسے ماں کے ساتھ بے حد جذباتی وابستگی تھی لہٰذا اس نے اس صدمے کے بعد دنیوی معاملات کو تیاگ کر روحانیت کی دنیا میں اپنے آپ کو مستغرق کیا۔ والد نرسم گپت نے بھی شریک حیات کی جدائی کے بعد ایک سادھو کی زندگی کا رنگ اختیار کیا۔ ابھینو گپت اپنے باپ ہی کو اپنا پہلا گورو مانتا ہے جس کی بدولت اسے گرامر، دلیل اور ادب کے شعبوں میں ابتدائی تربیت حاصل ہوئی۔ ابھینو گپت تمام عمر غیر شادہ شدہ رہا۔ اس کے بقول اسے روحانی نجات اس کے سب سے زیادہ چہیتے استاد شمبھوناتھ کی نگہداشت میں ہی نصیب ہوسکی۔ اسے مذہبی علوم، جمالیات، فلسفہ اور تنقید کی اصناف پر ید طولی حاصل تھا۔ جمالیات کے موضوع پر اس کی تصانیف "ابھینو بھارتی" اور "لوچنا" خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ خود ابھینو گپت نے بنارس میں اپنی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے ایک شاگرد دمٹاچاری نے بھی اپنے فن سے جمالیات اور شعریات میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ابھینو گپت کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت تھی۔ وہ ان سے اکثر کہتا: "تم شہد کی مکھیوں کی طرح کام کرو جو کئی پھولوں سے رس حاصل کرکے اس سے اپنا شہد تیار کرلیتی ہیں اور یہ کہ صرف عظیم اساتذہ سے ہی تربیت

حاصل کرو پھر جو کچھ تم نے سیکھا ہو اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ"۔(3)

ابھینو گپت کے حلیہ، رہن سہن، روزمرہ اور دیگر مصروفیات کے بارے میں جنوبی ہند کے دکن دیس سے آئے ہوئے ایک طالبِ آگہی کرشن بجوانے اپنی ایک کتاب میں، جو اَب ناپید ہے، گپت کی زندگی کے دلچسپ واقعات پیش کیے ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ: "ابھینو گپت جی انگور کے باغ میں منڈپ پر، جس کا فرش سنگِ بلور کا تھا اور جس کے ارد گرد مختلف پھولوں کی کیاریاں دھوپ اور دیپ کی خوشبو سے مہک رہی تھیں، قیمتی موتیوں کے جالر سے سجے ہوئے شامیانے کے نیچے آسن جمائے بیٹھے تھے۔ اس جگہ چندن کی خوشبو چاروں اور پھیل رہی تھی۔ بجوا مزید کہتا ہے کہ: "محفلِ ادب جمی ہوئی تھی۔ ساز و آہنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اُن کے سامنے ان کے مشہور شاگرد کھیم راج وغیرہ زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے تھے۔ ابھینو اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے جاتے تھے اور شاگرد اِن ارشادات کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ ابھینو گپت جی کے دونوں طرف دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ایک عورت کے ایک ہاتھ میں شیو رس کا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں کنول کا پھول تھا۔ دوسری عورت کے ایک ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور دوسرے ہاتھ میں انار کا پھل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابھینو گپت کی آنکھیں خمار اور مستی سے سرشار تھیں۔ ان کے ماتھے پر بھسم کا تلک اور کانوں میں رُودر کے دانے آویزاں ہوتے تھے۔ ان کی لمبی داڑھی سینے پر لٹک رہی تھی۔ سر لمبی جٹاؤں سے بھرا تھا۔ رنگ گورا تھا۔ یکھش دھوپ یعنی ایک قسم کی بوٹی کا رس گلے پر ملنے سے ان کا کنٹھ نیلے رنگ کا ہو گیا تھا۔ وہ جنیو یعنی زنار بھی ڈالے تھے۔ سفید ریشم کا فقیری چولا پہنے تھے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں مالا یعنی تسبیح لٹک رہی تھی۔ بائیں ہاتھ سے سریلی تان میں ستار بجایا کرتے تھے"۔(4) ابھینو

گپت کے اس روزمرہ سے قطع نظران کی عالمانہ خدمات اور فلسفے کی عمیق دنیا میں غوطہ خوری کے بعد ان کی عطا کی ہوئی دین انہیں کشمیر کے ممتاز سنسکرت عالموں اور فاضلوں میں ایک ارفع مقام عطا کرتی ہے۔

ابھینو گپت کی وفات کے بارے میں دینا ناتھ شاستری ہی کا کہنا ہے کہ:

''وہ ایک دن اپنے بارہ سو شاگردوں سمیت ذاتِ عالی پرم شیو کی صفات گاتے گاتے وسطی کشمیر کے دیہات من گام کے نزدیک بھیرو غار کے دہانے تک پہنچے اور نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو کر ذات حق سے واصل ہوئے۔(5)

ابھینو گپت شاعری، موسیقی دینیات، درس وتدریس، تنقید، فلسفہ اور مذہبیات کا نابغہ روزگار عالم و فاضل تھا۔ اگرچہ اس نے تین درجن کے قریب تصانیف قلم بند کی ہیں لیکن آج یہ بیش بہا سرمایہ کہیں موجود نہیں ہے۔ اس کے پسندیدہ موضوعات میں مذہبی رسومات، عقیدتی منظومات، فلسفیانہ نکتے اور فلسفۂ جمالیات خاص طور قابل ذکر ہیں۔

شیومت کی رو سے بھگوان شیو اور پاروتی میں جسمانی اور روحانی قوت (شکتی) مکمل طور پر موجود ہے۔ اسی شکتی کو اگر کوئی بھی بندۂ خدا اپنی روحانی صلاحیتوں سے بروئے کار لاسکے تو وہ روحانیت کی اُس منزل کو پالیتا ہے جہاں اسے اپنے اندر ہی یہ شکتی بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ بھگوان کو اپنے من میں واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔ ابھینو گپت کا عقیدہ ہے کہ رحمتِ الٰہی سے سرشار عابدوں کو کئی چیزوں یعنی پتھر، لوہا، سونا وغیرہ سے بنائی گئی مورتیوں کی پوجا ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔ البتہ دنیا کی لذت پا کر بھی انسان نجات حاصل کرنے کے اہل ہوسکتا ہے جس کی خاطر اسے گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا اختیار کرنے یا دنیاداری سے کنارہ کش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ کہ ابھینو گپت نے انسان کو نیکی کی راہ پر چلتے ہوئے دین کے ساتھ دنیا کو بھی اپنانے کا درس دیا ہے۔ اُس کے فلسفۂ

حیات کالبِ لباب یہی کچھ ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے مفکروں، منطقیوں اور فلسفہ دانوں کے لیے جو مقام اصحاب دانش و بینش کی نظروں میں طے پایا ہے اُس میں ابھینو گپت کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اس کا ہم پلہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے دنیا کے اس عظیم مفکر پر سارے ہندوستان اور خاص کر کشمیر کو فخر حاصل ہے۔

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں اردو، پہلا حصہ، عبدالقادر سروری، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1981ء ص 104-105

(2) سٹر گل فار فریڈم ان کشمیر، کشمیر پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی، 1954ء، ص29

(3) تانتر اور کشمیر کے ابھینو گپت کی تعلیمات: فلسفہ اور روحانیت۔ لنڈا جانسن، یوگا انٹرنیشنل، جنوری 2004

(4) ابھینو گپت، پنڈت دینا ناتھ شاستری، مشاہیر نمبر، ہمارا ادب، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1976ء، ص136-137

(5) ایضاً ص137

(مطبوعہ: اردو دنیا، نئی دہلی، جولائی 2016ء)

☆☆☆

کشمیر کا کھیمندر

سنسکرت طنز ومزاح کا بادشاہ

کھیمندر سرزمین کشمیر میں پیدا ہوا۔ اپنے وطن مالوف سے اُسے اس قدر محبت تھی کہ ایک جگہ اس شاعر اعظم نے اپنی ایک نظم میں وطن کا موازنہ فردوس بریں سے کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی جنت کی ساری رعنائیاں بھی حسن کشمیر کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ یہ کلام یوں ہے:

''کشمیر منڈل نے، جو بہتری کرنے والے ممالک میں سرفہرست ہے
اور جو علماء سے آباد اور دل نشین ہے
اسی نے اندر دیوتا کا غرور خاک میں ملا دیا
سورگ کو یہ گمان تھا
کہ بس وہی ہر طرح کے لطف، عشرت اور دیوتاؤں سے آباد ہے
لیکن قدرت کی شفا بخش نعمتوں
اور دولت سے مالا مال ملکوں میں سرفہرست ہو کر
اور کشمیری عالموں کی روایات سے بھرپور
کشمیر منڈل نے سورگ کے اس گھمنڈ کو پاش پاش کر دیا''۔

ان اشعار سے کالیداس کا وہ کلام یاد آجاتا ہے جس میں اس نے بھی اپنے وطن اُجین کو جنت کا ایک حصہ کہا ہے اور جسے اُجین کے رہنے والوں نے

اپنے ثواب سے بھرے اعمال کے معاوضے کی شکل میں حاصل کیا ہے۔ چند مورخوں کا خیال ہے کہ کالیداس بھی دراصل کشمیر نژاد تھا۔ اس دعوی کی حمایت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کالیداس نے زعفران کے پھولوں کی، جو صرف کشمیر ہی میں پائے جاتے ہیں، جو تصویر کشی کی ہے وہ ایک کشمیری ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال اس وقت ہمارا موضوع کھیمیندر کی ممتاز ادبی، فنی اور عالمانہ شخصیت ہی ہے۔

سنسکرت کے سرکردہ تحقیق کار برج موہن چترویدی کہتے ہیں: ''کشمیر کی خوبصورتی اور نعمتوں اور عورتوں کے حسن کا تذکرہ بلہن اور کلہن نے بھی اپنی تخلیقات میں کیا ہے مگر کھیمیندر کا اس نوع کا تذکرہ خود بخود اور براہ راست دوسروں کو مات دیتا ہے۔ وتستا (جہلم) دریا کا ذکر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کی جائے پیدائش اسی دریا کے کنارے کسی جگہ تھی۔ اگر چہ اس نے اپنے جنم کے حوالے سے کسی جگہ کی نشان دہی نہیں کی ہے البتہ گمان غالب یہ ہے کہ کھیمیندر نے خانگی زندگی کو خیر باد کہہ کے اپنے آخری ایام ترپیور پہاڑی کی چوٹی پر گذارے ہیں۔ وہیں پر اس نے ''دش اوتار چرت'' تخلیق کی۔ اس کے آخری اشلوک میں شاعر نے اس کے وقت کی طرف اشارہ کیا ہے جو اعداد کے مطابق 1065 بنتا ہے''۔ (1)

سنسکرت ادب کا ممتاز نقاد آنندوردھن کہتا ہے کہ شاعری میں ارفع واعلیٰ مقام حاصل کرنے کی تگ ودو میں چند سخن گو ہی ایسے ہوتے ہیں جنھیں مہا کوی کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ والمیکی اور ویاس بے شک بڑے شاعر تھے البتہ انھیں زیادہ تر ریشیوں کی حیثیت میں مانا جاتا ہے مگر بھاس، کالیداس، بھان بھٹ اور بھوبھوتی کے بعد کھیمیندر ہی کو مہا کوی کہلائے جانے کا افتخار حاصل ہے۔

کھیمیندر کا سال ولادت 990ء کے آس پاس مانا جاتا ہے جبکہ اُس نے

1065 عیسوی میں انتقال کیا۔ اس نے ایک خوشحال گھرانے میں دسویں صدی کے اخیر پر جنم لیا۔ اس کے والد کا نام پرکاشیندرا اور دادا سندھو تھا۔ اس وقت کشمیر میں جو علوم رائج تھے کھیمیندر نے ان سبھی کا بغور مطالعہ کیا اور اس طرح وہ ریاضی، علم نجوم، فلکیات، طب، جراحی، سیاست، شیومت، بودھ مذہب حتیٰ کہ فحاشیات کا بھی نابغۂ روزگار دانشور بن گیا۔ اس کے مشاغل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اسے نغمات، ناولوں اور خوبصورت شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے کھیمیندر کے بارے میں مزید تفصیلات بہم کی ہیں۔ کھیمیندر کے بارے میں جسے وہ کشمیر میں سنسکرت شاعروں کا تاج کہتے ہیں، صوفی لکھتے ہیں: ''وہ سری نگر میں جھیل ڈل کے کنارے اُس جگہ پیدا ہوا جہاں آج نشاط باغ ہے۔ اس کا باپ پرکاشیندرا ایک امیر اور پڑھا لکھا شخص تھا جو شیومت کا زبردست پیروکار اور ابھینو گپت کا شاگرد تھا جس نے کشمیر میں شیوازم کی بنیاد کو استوار کیا۔ کھیمیندرا اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے ایک تھا۔ اس نے کئی اساتذ کے ہاں شیومت کا علم حاصل کیا جن میں گنگاک سب سے قابل تھا۔ پچیس سال کی عمر میں کھیمیندر نے شادی کی۔ اس کے یہاں سومیندر نام کا بیٹا پیدا ہوا۔ راجہ اننت نے کھیمیندر کو شہزادے کلاچ کی تربیت کرنے پر مامور کیا''۔(2)

کشمیری مورخ محمد دین فوق نے اگرچہ راجہ اننت کے بارے میں مفصل اطلاعات فراہم کی ہیں تاہم وہ کھیمیندر کے بارے میں خاموش ہیں۔ راج اننت دیو اپنی کم فہمی اور نادانی کی وجہ سے سارا اقتدار اپنے لالچی اور ہوس پرست مصاحبوں کے ہاتھوں میں دے گیا جو علی اعلان عوام کو دن دہاڑے لوٹنے لگے اور ملک میں ایک طرح کی خانہ جنگی پھیلنے لگی۔ فوق لکھتے ہیں کہ: ''اننت دیو نے جالندھر کے راجہ کی چھوٹی لڑکی شری متی سے شادی کر لی تو اس رانی کا قدم کشمیر

کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ شری متی نہ صرف حسن ظاہری میں بے نظیر تھی بلکہ زیور علم وادب اور فہم وفراست میں بھی اس سے بھی بڑھ کر آراستہ پیراستہ یگانۂ دہر خیال کی جاتی تھی۔ اس نے بڑی حکمت عملی سے بے سمجھ راجہ کو راہ راست پر لایا اور وہ بھی خواب خرگوش سے جاگ کر عدل وانصاف اور رعیت پروری کی طرف متوجہ ہوا''۔(3)

ابھینو گپت کے اس شاگرد یعنی کھیمیندر نے جو دین کشمیری ادبیات کو عطا کی وہ عدیم المثال ہے۔ دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ کھیمیندر سماجی طنز ومزاح کا موجد بن گیا۔ اس لحاظ سے آٹھ ابواب پر مشتمل اس کی تخلیق ''سمے ماترکا'' روزمرہ کے گھومتے پھرتے حکیموں، بھکارنوں، دکاندار لڑکیوں، سادھوؤں، چوروں اور سماج کے دیگر نچلے پائے کے طبقات کی زندگی کے دلچسپ اور ظریفانہ بیانیہ کی ایک نادر مثال ہے۔ کھیمیندر کی تخلیقات میں رامائن منجری، بھارت منجری، برہت کتھا منجری، نرم مالا اور سمے ماترکا خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کی ایک اور قابل ذکر تخلیق ''اوچتیہ وچار چرچا'' کو ادبی تنقید کی دنیا میں ایک بے بدل کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ کھیمیندر کے تخلیقی کارناموں کی تعداد چالیس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ کچھ تحقیق کاروں نے یہ تعداد چونتیس بتائی ہے۔ اُس پر مہا ریشی ویاس کا اثر نمایاں جسے وہ اپنا استاد مانتا تھا۔ اس نے جس صنف ادب میں کمال حاصل کیا تھا وہ ہے طنز ومزاح جو بظاہر اس کا محبوب موضوع رہا ہے۔ شاریکا منشی نے ان الفاظ میں کھیمیندر کے فن اور علمیت پر روشنی ڈالی ہے: ''وہ اننت راجہ کے دور میں ادبیات کا نابغہ روزگار تھا۔ اس کی تخلیقات کا تعلق مختلف موضوعات سے ہے جن میں اوتاروں کی زندگی کا حسن سلوک، فن خطابت اور اس کے دور کے سماجی اور اقتصادی مسائل شامل ہیں۔ اس نے کلاسیکی مسوادات کی تلخیص کی، سنسکرت کے حروف تہجی، وزن اور اعراب

پر مفصل بحث کا آغاز کیا اور نئے شاعروں کی سرپرستی کرتے ہوئے کھیمیندر نے انھیں ایک ضابطہ عمل دیا جسے سارے ملک کے نوآموز شاعروں نے بسر وچشم قبول کیا"۔(4)

تجزیہ کاروں کے بقول کھیمیندر پر گوتم بدھ کا گہرا اثر تھا جس سے متاثر ہوکر اس نے بدھ کی مختلف زندگیوں کے حالات قلم بند کیے۔ کھیمیندر کا یہ قول بہت حد تک گوتم بدھ ہی کے فلسفے کی عکاسی کرتا ہے: "کچھ لوگ مال و دولت کی وجہ سے مغرور ہیں لیکن انھیں اچھی صفات کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ ایک برتن اگرچہ پانی سے لباب لب بھرا ہوتا ہے لیکن جب اس کی رسی ٹوٹ جاتی ہے تو وہ دھم سے کنویں میں گر جاتا ہے"۔

کشمیر میں تقریباً چودھویں صدی تک، جب یہاں اسلام متعارف ہوا، بودھوں اور ہندوؤں کے ادوار اقتدار میں سنسکرت کا اثر زندگی کے کئی شعبوں پر کسی نہ کسی طرح حاوی رہا ہے۔ اس دوران فنون لطیفہ کے مختلف فلسفیانہ نکتوں کا احاطہ کرنے کی غرض سے اسی کلاسیکی زبان کا سہارا لیا جاتا رہا۔ ادبیات، فلسفہ، گرامر، تحقیق وتنقید، دینیات، شعریات اور دیگر علوم کے حوالے سے کشمیری سنسکرت دانش وروں نے دنیا کے فکروذہن کو مالا مال کیا۔ کلہن پنڈت کی اولین تاریخ کشمیر "راج ترنگنی" اس سلسلے کا سنگ میل کہلائی جائے گی۔

کلہن پنڈت کی طرح کھیمیندر نے بھی اپنی تخلیقات میں وطن مالوف کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں قلم بند کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کشمیر کو پونچھ، راجوری وغیرہ سے ملانے والی مغل روڈ کو کھیمیندر نے نمک کی سڑک کا نام دیا ہے کیونکہ صدیوں تک اسی راستے سے پنجاب کی کانوں سے نمک کشمیر میں لایا جاتا تھا۔ اس عہد ساز دانشور کے زمانے میں کشمیر اُون کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جب شمالی کشمیر کا قصبہ پٹن اس تجارت کے فروغ کی خاطر بھیڑوں اور مویشیوں کی

بہت بڑی منڈی بن چکا تھا، کھیمیند رنے اس صنعت کا تفصیلی ذکر ''نرمامالا'' اور ''سمے ماترکا'' میں کیا ہے۔(5)

کھیمیند رکو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔اس کی یہ بھی وجہ ہے کہ اس نے خاص کر جو مزاحیہ اور طنزیہ کتابیں لکھیں ان میں اس نے سہل اسلوب میں اپنے تیکھے خیالات کا اظہار کیا۔اس کے ڈراموں کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔للت رتن مالا برہت کتھا سے لی گئی ایک کہانی پر مبنی ہے۔کنک جانکی کا پس منظر رامائن کا ایک باب ہے اور چترا بھارت بھی مہابھارت کے ایک قصے سے ماخوذ ہے۔

کھیمیند رکی ادبی فن کاری اور علمی مہارت کے بارے میں انیسویں صدی تک بہت کم معلومات مہیا تھیں۔1871ء میں اس کی گم شدہ کتابوں میں سے پہلی تخلیق کا پتہ چلا۔پھر کم از کم اٹھارہ دیگر تخلیقات بھی دریافت ہوئیں۔

کھیمیند را اور کلہن دونوں نے ہندوؤں کی کائستھ ذات کا بھرپور مذاق اڑایا ہے کیونکہ یہ طبقہ عوام دشمن تھا اور محض اپنے مفادات کا نگہبان تھا۔لوگوں سے جو جزیہ وہ وصول کرتے تھے اس کا بیشتر حصہ ان کی جیبوں میں جاتا تھا۔ان دونوں مصنفین نے اسی لیے انھیں لالچی، بے ایمان۔اخلاق باختہ اور مغرور کے خطابات سے نوازا ہے۔

کھیمیند رنے اپنی ''نرمامالا'' میں، جو راجہ اننت کے عہد میں لکھی گئی، انھی کائستھوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے سرکاری عہدوں کا ناجائز استعمال کر کے عوام کی نجی زندگی میں دخل اندازی کرتے ہیں اور ان کی نقل وحرکت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس ناقابل قبول طریق کار نے کائستھوں کو لوگوں کی نظروں میں قابل نفرین بنایا ہے۔اُکالا نام کے بادشاہ نے تو ان کے اقتدار کو کچلنے کی غرض سے کئی اقدام کیے لیکن اس کے بعد اس طبقے نے پھر سر اٹھایا اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے از سر نو عام انسانوں کو ستانا شروع کیا۔

کشمیر میں بودھ مت کو اشوک اعظم (304-232 BC) نے متعارف کیا جو کشان راجوں کے عہد تک پھلتا پھولتا رہا۔ یہ اس زمانے میں عام لوگوں کا پسندیدہ مذہب بن گیا تھا۔ اس کی بدولت ذات پات کی بدعت ختم ہو چکی تھی، صرف برہمن لوگ اپنی بڑائی کو کسی حد تک قائم رکھے ہوئے تھے۔ بودھ دھرم چونکہ ذات پات کی فرقہ بندی کو تسلیم نہیں کرتا لہٰذا نچلے طبقے کے لوگ مثلاً چمار، رات کے پہرے دار اور کشتی باش حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس اس دور میں ڈوم اور ڈومنیا اعلیٰ عہدوں پر فائز تھیں۔ راجہ چکرورمان کے دور میں تمام درباری عہدے ڈوموں ہی کے قبضے میں تھے اور ڈومنیاں راجہ کی منظور نظر رانیاں بنائی جاتی تھیں۔ (6)

چودھویں صدی عیسوی میں سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ کے دور بادشاہی میں سنسکرت اور فارسی کا چلن رہا اور بڈشاہ نے کشمیر کے سنسکرت ادیبوں، فلسفیوں، شاعروں، تحقیق کاروں اور مورخوں کے کارناموں میں سے کئی ایک کو فارسی میں منتقل کروایا جن میں مہابھارت بھی شامل ہیں۔ بدقسمتی سے یہ پیش بہا علمی خزانے وقت کے ہاتھوں لٹ چکے ہیں۔ دراصل بڈشاہ نے اپنے متقدمین سنسکرت ادباء اور شعراء کے عدیم المثال تخلیقی سرمائے کا چرچا سنا تھا اور اس نے خود بھی ان میں سے کئی ایک کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ابوالفضل فیضی کے بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے کا علامہ اقبال نے بھی ذکر کیا ہے اگرچہ علامہ کو یہ ترجمہ پسند نہیں آیا تھا۔ 11 اکتوبر 1921ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں انھوں نے اس حوالے سے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے: ”اگر وقت نے اجازت دی تو میں نے گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے فیضی کے ذریعہ کیا ہوا گیتا کا فارسی ترجمہ دیکھا ہوگا۔ کوئی شخص ان کی تحریر کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن میرا

خیال ہے کہ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کرتے وقت اس کے متن اور طرز نگارش کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ فیضی گیتا کی روح کو سمجھ نہیں پائے''۔(7)

بڈشاہ کی علم دوستی کے پیش نظر یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے عہد میں کشمیر کے بلند مرتبہ سنسکرت عالموں اور قلم کاروں کی تحریروں سے بھی چیدہ چیدہ فن پارے فارسی میں منتقل کیے گئے ہوں کیونکہ اُس وقت فارسی درباری زبان تھی اور ہر سطح پر اس کی آبیاری بھی کی جاتی تھی۔ اگر ایسا ہے تو زمانے کی دست برد نے ہم سے یہ عظیم سرمایہ بھی چھین لیا ہے۔

کھیمیندر کی اصناف سخن میں طنز و مزاح کو زیادہ فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ اس فن کی تخلیق میں ید طولی رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے دور کی خاص کر طوائفوں اور بد قماش عورتوں کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر اسے نقادوں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے کیونکہ ایسی تحریروں میں فحش نگاری کا عنصر نمایاں ہے اور وہ بھی کھیمیندر نے بازاری زبان کا استعمال کر کے ورطہ تحریر میں لایا ہے۔ مثلاً:

''اس کی گفتار میں شہد کی مٹھاس، دل میں خنجر، ایک طوائف کلہاڑی کی تیز دھار جیسی ہوتی ہے جو دم زدن میں اپنے یاروں کو برباد کر سکتی ہے''۔

''اگر چہ وہ ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے، وہ اپنا چہرہ خوبصورت بناتی رہتی ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتی ہے کہ وہ سولہ سالہ دوشیزہ ہے، غالباً اس نے کوؤں کے ساتھ امرت پیا ہوگا''

''وہ ایک عقاب کی طرح اپنے شوہر کو ٹالتی ہے اور دوسرے درخت سے حظ لیتی ہے جو اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ وہ فطرتاً ایک بدفطرت مخلوق ہے۔ وہ ایک ناگن کی طرح ہے اور کسی کی وفادار نہیں ہوسکتی''۔

''اس کے کئی دل، کئی زبانیں، کئی ہاتھ اور مردوں کو پھسلانے کے کئی گر آتے ہیں۔ اس میں صداقت نام کی کوئی بات نہیں اور ایک طوائف کو پہچاننا ممکن نہیں''۔

کہا جاتا ہے کہ عظیم انسان، خاص کر اہل فکر و دانش، ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہی مثال پیش کی جاتی ہے جو اس کہاوت کو درست ثابت کرتی ہے۔ کھیمیندر کی ایک مختصر نظم یوں ہے:

''ایک نجومی ہزاروں میل اوپر آسمان کی طرف نگاہیں لگائے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ چاند سولھویں ہالہ میں کب داخل ہوگا، لیکن اسے اپنی بیوی کا کچھ بھی پتہ نہیں جو نیچے اپنے عاشقوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے''۔

شیخ سعدی نے 'گلستان' میں ہو بہو ایسی ہی ایک حکایت بیان کی ہے جسے سرقہ کہا جاتا اگر یہ باور نہ کیا جاتا کہ دنیا کے ممتاز دانشوروں کے محسوسات فاصلوں، زمانوں اور زبانوں کی سرحدیں پھلانگ کر ایک دوسرے کے ذہن میں سماتے ہیں اور ہم رنگ اور ہم معنی تخلیقات کو جنم دیتے ہیں۔

کھیمندر نے اپنے اردگرد رہنے والے عام انسانوں کو اپنے موضوعات میں ترجیح دی ہے جن کی خامیوں اور خوبیوں کو اس نے بعینہ اپنے قلم میں مقید کر لیا ہے۔ ان خامیوں کی نشان دہی بجائے خود ان دنوں ایک انقلابی عمل کا درجہ رکھتی تھی جب تقریر بازوں نے ہر شعبہ حیات کے لیے خود ساختہ معیار قائم کیے تھے۔ کھیمندر نے نہ صرف ایسی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کی بلکہ اس نے خود سماج کے لیے ایسے اقدار متعین کیے جو عوام پرور تھے۔ ''اس نے ادب میں ترقی پسند خیالات کو اُس وقت پوری طرح ابھارا جب زندگی کی قدریں آمرانہ احکام کے تحت کچلی جا رہی تھیں۔ اس طرح کھیمندر کی شخصیت میں قاری کو پیغمبر اور شاعر کا امتزاج صاف نظر آتا ہے''۔(8)

مجموعی طور پر کھیمیندر کو مورخوں اور تجزیہ کاروں نے کشمیر میں فنون لطیفہ کی دنیا میں طنز و مزاح کا بے مثال خالق اور بے تاج شہنشاہ مانا ہے۔

حوالہ جات:

(1) کھیمیندر، برج موہن چترویدی، ترجمہ چمن لال رینہ، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، 1989ء، ص45-44

(2) کشمیر، کیپٹل پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، 1996، جلد اول، ص60

(3) تاریخ کشمیر، فرید بک ڈیپو نئی دہلی، 2011 ص261-260

(4) آن دی امپارٹنس آف کلچرل ہیری ٹیج، وتستا۔

(5) اے ہسٹری آف کشمیر، پرتھوی ناتھ کول بامزئی، میٹروپالٹن بک کمپنی، نئی دہلی، 1962ء، ص226

(6) ایضاً، ص18

(7) بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ، صلو چودھری، ملینیم آفس، 67 تھیٹر روڈ، کلکتہ، 2013ء، ص14

(8) کے، این، دھر، گلمپسز آف کشمیری کلچر، ویویکانند کیندر، کنیا کماری، جون 1984ء

☆☆☆

کلہن

کشمیر کا اولین مورّخ

آج سے ایک ہزار سال قبل تک کشمیر کی تاریخ کے اوراق پر مطلوبہ مواد کی عدم موجودگی اور واقعات کا شیرازہ بکھرنے کی بنا پر ناشناسی کی گرد جمی ہوئی تھی اور اہل کشمیر اپنے ماضی سے قطعی نابلد تھے۔ اس لحاظ سے کلہن پنڈت کو ہندوستان کا اولین مورخ اور سرکردہ شاعر کہا جاسکتا ہے۔جس نے گیارھویں صدی عیسوی میں ''راج ترنگنی'' کے نام سے پہلی تاریخ رقم کی جو کئی دیگر سنسکرت تاریخ دانوں کے برعکس زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ کر ہم تک آ پہنچی ہے۔

اس طرح سے کلہن کو کشمیر کی تاریخ میں وہی درجہ حاصل ہے جو قدیم یونان میں وہاں کے پہلے تاریخ نویس ہیروڈوٹس کو **The Histories** لکھنے کے لیے دیا گیا ہے جس نے ساری دنیا میں یونان کے ازمنہ قدیم کی تاریخ سب سے پہلے قلم بند کرنے کا سہرا اپنے سر باندھا۔

کلہن کا باپ چنپک ،راجہ ہرش (1089-1107) کے دور میں دوارپتی یا سرحدی گذرگاہوں کا کمانداز تھا۔کلہن نے بچپن میں ہی اپنے ملک کشمیر کے بارے میں دلچسپ واقعات اور حالات سنے تھے اور اس کے دل میں یہ خواہش بار بار جاگتی تھی کہ وہ خود ہی ان حالات اور ماضی کے کوائف کو قلم بند کرے۔راج ترنگنی کی شروعات ان حالات سے ہوئیں جو کلہن نے سنے تھے لیکن جن کی

تواریخی اعتبار سے کوئی سند موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے بھی ہیروڈوٹس کے اس قول کے مطابق سنی سنائی حکایات کو ورطۂ تحریر میں لایا کہ ''تاریخ افسانوی ادب کے سوا اور کچھ نہیں''۔ کلہن نے شہرہ آفاق راج ترنگنی 1148ء اور 1150ء کے درمیان تقریباً دو سال میں مکمل کی۔

جب راجہ سسل (1127) کی وفات کے بعد جے سمہا نے حکومت سنبھالی تو کلہن کو درباری شاعر بنایا گیا۔ اس طرح اسے راج ترنگنی مکمل کرنے کا موافق ماحول میسر ہوا۔

ایک روایت کے مطابق کلہن نے اس کے علاوہ 'جے سمہا بھودایا' عنوان کی ایک طویل نظم بھی لکھی جس میں اس نے اپنے مربی اور سرپرست بادشاہ جے سمہا کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کتاب کا مسودہ اگرچہ محفوظ نہیں رہ سکا ہے لیکن اس کے چند ابیات 'رتنا کتھا سرسم یویوکایا' میں نقل کیے گئے ہیں۔

اگرچہ کلہن اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا ہے لیکن حقائق اور تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا برہمن تھا۔ اُس کی علمی صلاحیتوں کا اظہار راج ترنگنی میں اسی اعلیٰ پائے کے انداز میں ہوتا ہے جو عالم و فاضل کشمیری پنڈت برہمنوں کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ برہمنوں کے تئیں اس نے اپنی تاریخ میں ہمدردی اور یک جہتی کا جو بھرپور مظاہرہ کیا ہے اُس سے بھی اس کے ایک صالح برہمن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں جونراج نے بھی تمام شکوک وشبہات کو ختم کر دیا ہے جب وہ اپنی 'ودتیا راج ترنگنی' میں کلہن کو 'دوجا' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ کلہن شوِ کا پرستار تھا اور اس لئے اس نے راج ترنگنی کے ہر حصے کی ابتدا میں بھوان شوِ اور اس کی رفیقہ گوری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

راج ترنگنی کے بارے میں خوش قسمتی سے کلہن نے خود واضح طور پر کہا ہے کہ اس نے یہ کتاب لوکا کے عہد کے 4242ویں سال یعنی 49-1148ء

عیسوی میں لکھنی شروع کی اور اگلے سال اسے مکمل کیا۔

کلہن نے بنیادی طور پر راج ترنگنی شاردا رسم الخط میں لکھی اور اسے ساتھ ہی دیوناگری خط میں کیا گیا لیکن اس وقت کے خطاط یا نقل نویس ان دونوں رسوم خط سے پوری طرح واقف نہیں تھے لہازا 'راج ترنگنی' کے اوّلین مسودات میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

راج ترنگنی کا شاردا میں تحریر کردہ قدیم ترین مسودہ غالباً کشمیر سرکار کے تحقیقی کتب خانے میں موجود ہے۔ دوسرا مسودہ جسے پنڈت گنہ کاک نے تیار کیا تھا اور جس پر پنڈت صاحب رام نے حواشی تحریر کیے تھے، خدا جانے موجود ہے بھی یا نہیں؟

راج ترنگنی کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کلہن نے کشمیر کی وادی میں تقریباً ہر جگہ بغور دیکھی ہے۔ اس لیے وہ نہائت اطمینان اور یقین کے ساتھ یہاں کے مقامات، قصبوں اور دیہاتوں کے نام لیتا ہے اور مقامی حالات و واقعات کے بارے میں اپنے شاعرانہ بیان کو تکرار کے ساتھ دوہراتا ہے۔ وہ سرزمین کشمیر کی مدح سرائی یوں کرتا ہے: "یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کے لوگ زیادہ تر دوسری دنیا یعنی آخرت کا خوف کھاتے ہیں۔ جہاں زمستان کے دنوں میں گرم حمام موجود ہوتے ہیں۔ جہاں دریاؤں کے کناروں پر بیٹھنے کی آرام دہ جگہیں ہیں۔ جہاں ندی نالوں میں نجس حیوانات دکھائی نہیں دیتے اور وہ کسی بھی قسم کے خطرات سے پاک ہیں۔ جہاں اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہاں کے باشندے گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکتے، سورج کی تمازت والی کرنیں گرمی کے دنوں میں بھی اپنے اندر ایک حلاوت اور ٹھنڈک رکھتی ہیں۔ اونچے اونچے رہائشی مکان، زعفران، یخ جیسا ٹھنڈا پانی، انگور اور اس طرح کی نعمتیں جو جنت الفردوس میں بھی مہیا نہیں ہو سکتیں"۔

راج ترنگنی آٹھ ابواب یا ترنگوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ گونند خاندان کے راجاؤں، مقامی حکمرانوں، اشوک اور اس کے جانشینوں کا حال بیان کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں اُن کشمیری حکمرانوں کے قصے درج ہیں جن کا گونند خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تیسرے باب میں گونند خاندان کی بحالی کا ذکر اور کئی حاکموں کا حال مندرج ہے جن میں پرورسین کو تاریخی طور پر موجود شخصیت کی حیثیت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ چوتھی ترنگ میں کارکوٹ خاندان کی تاج پوشی کا ذکر ہے۔ کارکوٹ خاندان کے راجگان کو اُتپالا حاکموں نے تخت سے سبک دوش کر دیا جس کے کوائف راج ترنگنی کے پانچویں حصے میں درج ہیں۔ کتاب کے چھٹے باب میں ویرادیو اور ابھنیو کے وارثوں کا حال بیان ہوا ہے۔ ساتویں کتاب کا آغاز لوہارا سلطنت کے راجہ سام گرام راجہ کی تاج پوشی اور اس کا اختتام ہرش کی وفات سے ہوتا ہے۔ آٹھویں ترنگ، جو ساری کتاب کے تقریباً نصف حصے کے برابر ہے لوہارو خاندان کی بحال شدہ حکمرانی اور اُ کالا سسل اور سسل کے بیٹے جے سمہا کے احوال پر مبنی ہے۔

کلہن نے راج ترنگنی لکھنے کی غرض سے قلم اٹھاتے وقت ہی اپنے ہم عصر اور ماقبل شاعروں اور وقائع نگاروں کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب کے بارے میں اعتذار کے لہجے میں کہا ہے کہ: ''میری غرض و غایت کو ذہن نشین کیے بغیر میری اس تصنیف کو محض اس لیے بالائے طاق نہ رکھیں کہ اس موضوع پر میرے پیش رو بھی خامہ فرسائی کر چکے ہیں''۔

یہ اظہار کلہن کی متانت اور حق گوئی کی دلالت کرتا ہے۔ پرتھوی ناتھ پشپ نے اس اعتذار کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ کلہن سے پیشتر چند ایک کشمیریوں نے تاریخ لکھنے کی سعی بھی کی تھی لیکن ان کی تصانیف کا کینواس محدود اور پیش کش سطحی تھی۔ ویسے بھی کلہن نے

اپنے جن پانچ پیش روتواریخ نویسوں یعنی سرورت، کھیمیندر، ہیلا راج، پدم مہر اور چھیولا کر کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی کی کوئی تصنیف ہم تک نہیں پہنچی ہے۔

کلہن کی دیانت داری دیکھئے کہ کھلے بندوں اپنے پیش رؤں کے تئیں احسان مندی کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔ ''میری غرض وغایت سنے بغیر میری اس تصنیف سے محض اس لیے منہ نہ موڑئے گا کہ اس موضوع پر میرے پیش روقلم اٹھا چکے ہیں''۔(1)

کشمیر میں اگرچہ سنسکرت زبان میں تذکرہ نویسوں اور وقائع نگاروں کی کوئی کمی نظر نظر نہیں آتی مگران کی نگارشات کوجدید میزانیہ کے لحاظ سے تاریخ نویسی کی کسوٹی پر پرکھنا غالباً مناسب نہیں ہوگا کیونکہ یہ سبھی قلم کار اپنے اپنے عہد کے تاریخ نویس نہیں بلکہ یادداشتیں قلم بند کرنے والے لوگ تھے۔ظاہر ہے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ تاریخ نویسی کا کوئی واضح اور ٹھوس تصور موجود نہیں تھا۔ایسی تخلیقات میں مبالغہ آمیزی اور رنگ سازی کے مناظر ضرور شامل ہوں گے۔ یونان کے کئی یادداشت نگاروں کا بھی یہی حال ہے اور کلہن کی راج ترنگنی کو بھی تاریخ نویسی کے مقررہ ضوابط کی رو سے تاریخ قرار نہیں دیا جاسکتا۔حالانکہ کلہن نے خود اپنی اس کاویہ یعنی طویل نظم کو ''بادشاہوں کا دریا'' کا نام دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیر کے سنسکرت نگاروں کا تعلق ہے کلہن اُن سبھی میں بہر حال افضل ترین مقام کا مالک ہے اور تذکرہ نویسی میں اس کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

کلہن کی زندگی کے بارے میں وضاحت کے ساتھ تفصیلات کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے البتہ اس ضمن میں چند حوالے جونراج کے یہاں موجود ہیں جو کلہن کے تین سوسال بعد منظر عام پر آیا۔لیکن اس خودستائی کے عمل سے دور رہنے کے باوجود کلہن کا نام زندہ رہا اور اس کی ادبی حیثیت میں بھی کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔

کلہن کی تاریخ نویسی کے سلسلے کو جونراج نے تسلسل بخشا جس کے بیان کردہ حالات اگرچہ واضح اور مثبت ہیں مگر اس کے یہاں کلہن جیسے عظیم فن کار کا عظیم تخیل نظر نہیں آتا۔

کلہن کا زمانہ کشمیر کا دورِ ابتلا تھا جس میں غیر یقینی صورتِ حال، بے راہ روی، بدکرداری اور تذبذب کا غیر انسانی ماحول ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے الفاظ میں: ''یہ سازشوں اور قتل و غارت کا زمانہ تھا جس میں بھائیوں اور قرابت داروں کے ساتھ مخاصمت اور دشمنی کا بازار گرم تھا۔ وزراء اور امراء اقتدار کی سرکشی میں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان تھے۔ بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ ایک راجہ جو اُچل کا جانشین راڈھا عرف سانکا کہلایا جاتا تھا، صرف ایک رات کو چند گھنٹوں تک ہی اپنا تخت سنبھال سکا۔ اُس کے چچیرے بھائی سالنہا کو فقط آٹھ ماہ تک راج کرنا نصیب ہو سکا۔ بادشاہ ایک یا دوسرے کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں بن کے رہ گئے تھے۔ ملک میں کوئی قانون یا قانون کی پاسداری نہیں تھی۔ حکمران بے تحاشا شراب پیتے تھے اور اُن کے وزیر اور مشیر جاہل اور ظالم تھے جنھیں اپنی مادرِ وطن سے ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہیں تھا۔ مسخرے اہم عہدوں پر فائز کئے گئے تھے اور انھوں نے وزارت کی کرسیوں پر بھی قبضہ جمالیا تھا۔ بزدل اور احمق نوجوان کماندار بنائے گئے تھے''۔

بارہویں صدی کے اوائل میں اہل کشمیر نے اس امید پر ووپا دیو کو اپنا راجہ چن لیا کہ وہ اس بے ہنگم صورتحال میں کوئی بہتری لائے گا، لیکن اُس نے بھی اپنی احمقانہ حرکتوں سے اپنے حامیوں کی توہین کر کے انھیں مایوس کر دیا۔ اسے پتھروں کے بھاری بھرکم چٹان دیکھ کر ایک عجیب سی ذہنی تسکین ہوتی تھی اور اس نے اپنے وزراء کو یہ احمقانہ حکم دیا کہ وہ حیوانوں کا دودھ پلا کر چھوٹے چھوٹے پتھروں کو بڑی چٹانوں میں تبدیل کر دیں (2)۔

ان تواریخی حالات سے ظاہر ہے کہ کلہن جیسا حساس مؤرخ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس نے راج ترنگنی میں یہ حالات پیدا کرنے والوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے، لیکن اس شہر آشوب میں اس نے ایسے واقعات بھی درج کیے ہیں جو واقعاتی طور پر اور اعداد و شمار کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتے، بلکہ یہ آج ہمیں نا قابل اعتبار نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں پر ایسے دو واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

کلہن کہتا ہے کہ ''شاندار بادشاہ اشوک نے سرینگر شہر کی بنیاد ڈالی جس میں مال و دولت سے بھر پور چھیانوے (96) لاکھ گھر تعمیر کیے گئے''۔ کیا یہ بیان بحث طلب نہیں ہے کہ ہزار سال قبل سرینگر شہر میں چھیانوے لاکھ مکانات تعمیر کیے گئے جن میں ظاہر ہے کروڑوں لوگ رہتے ہوں گے جب کہ موجودہ شہر سرینگر کی کل آبادی تیس لاکھ کے قریب ہی بتائی جاتی ہے۔

اسی طرح کلہن نے مہر کل راجا کے وقت کا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب اُس نے چندر کوہل کی صفائی کا کام شروع کرنا چاہا تو اس کے بیچوں بیچ موجود ایک چٹان نے اس میں رُکاوٹ ڈالی۔ راجا نے اس رُکاوٹ کو دور کرنے کے لیے تپسیا کی اور دیوتاؤں نے خواب میں آکر اس سے کہا کہ اس چٹان کے اندر ایک پاکباز ذی جان رہتا ہے اور اسے صرف ایک باکردار اور با عصمت عورت ہی ہٹا سکتی ہے۔ راجا یہ سن کر فوراً حرکت میں آگیا اور اس نے پہلے اونچے خاندانوں کی خواتین کو پتھر ہٹانے کا حکم دیا، لیکن اسے یہ دیکھ کر نہایت دُکھ ہوا کہ ان میں سے کوئی یہ کام سرانجام نہیں دے سکی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے ملک میں کوئی عورت اپنی عصمت لٹائے بغیر نہیں جی رہی تھی۔ بعد میں ایک کمھارن چندراوتی کے ہاتھوں یہ چٹان فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ایک ناراض اور دل برداشت راجا نے تین کروڑ عورتوں کو مع اُن کے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں

کے تہہ تیغ کرواڈالا۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس وقت کشمیر کی آبادی کا ایک حصہ تین کروڑ خواتین اور اُن کے کروڑوں رشتہ داروں پر مشتمل تھا، یقین نہیں آتا۔

کلہن نے چونکہ اپنے وطن مالوف کشمیر کی زندگی کے ہر پہلو کا نہائت باریک بینی سے بھر پور مطالعہ کیا تھا لہازا وہ یہاں کے واقعات اور کوائف کا تفصیلی ذکر کرتا ہے جن میں اس ملک کا جان لیوا زمستان، سیلاب اور برفانی طوفان وغیرہ کا حال شامل ہے۔

راج ترنگنی کے جو تراجم وقتاً فوقتاً دوسری زبانوں میں کیے گئے اُن کی تفصیل سوم ناتھ در نے آرسی پنڈت کے ترجمہ سے نقل کر کے یوں درج کی ہے:

''راج ترنگنی کے ایک حصے کا پہلا ترجمہ سلطان زین العابدین (1420-1470) کے حکم سے فارسی میں کیا گیا اور اس کا نام ''بحر الاسمار'' یا ''کہانیوں کا سمندر'' رکھا گیا (3)۔ شہنشاہ اکبر نے جب کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تو 1594ء میں عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ وہ اس ترجمہ کو مکمل کرلے۔ ابوالفضل نے اپنی تصنیف ''آئین اکبری'' میں کشمیر کی اس قدیم تاریخ کا خلاصہ شامل کرلیا اور اس کے لیے کلہن کو ماخذ قرار دیا۔ شہنشاہ جہاں گیر کے عہد حکومت میں ملک حیدر نے 1617ء میں راج ترنگنی کا مختصر ایڈیشن فارسی میں پیش کیا۔ فرانسس برنیر (1665) نے اپنی کتاب ''بہشتِ ہند'' میں راج ترنگنی کے اس ترجمہ کا حوالہ دیا جو حیدر ملک نے کیا تھا۔ اسی طرح ایک صدی بعد پادری ٹائی فن تھالر نے اس کا مختصر خلاصہ کیا'' راج ترنگنی کا بہتر متنی مواد ''مور کرافٹ'' کو حاصل ہوا تھا۔ مور کرافٹ 1823ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اجازت سے سرینگر آیا اور اس نے قدیم شاردا نسخے سے دیوناگری مسودہ تیار کرلیا۔ یہی مسودہ راج ترنگنی کے اُس ایڈیشن کی بنیاد بن گیا جو 1835ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی

کے زیراہتمام کلکتہ سے شائع ہوا۔

اس دوران ڈاکٹر ہوریس ہے مین ولسن نے کشمیر کی ہندو تاریخ پر اپنے اُس انشائیے کی اشاعت سے شہرت حاصل کی تھی جس میں راج ترنگنی کے پہلے چھ ابواب کی تنقیدی تلخیص شامل کی گئی تھی۔ اس نے پہلی بار یورپی مورخین کو کلہن کی اس اہم تصنیف سے متعارف کیا۔

اصل سنسکرت متن پر مبنی راج ترنگنی کا پہلا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی کے اہتمام سے 1852ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ کار اے ٹرویر نام کا ایک فرانسیسی ادیب تھا جو کلکتہ سنسکرت کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا، یوگیس چندر دت کا ترجمہ ''راجگانِ کشمیر'' کلہن پنڈت کی سنسکرت تصنیف راج ترنگنی کا ترجمہ کلکتہ میں 1879ء اور 1887ء کے درمیانی عرصہ میں شائع ہوا (4)۔

اُنیسویں صدی کے اخیر پر پنڈت دُرگا پرشاد نے بھی راج ترنگنی کا اپنا ایڈیشن سامنے لایا جسے بمبئی کے نرنائے پریس نے طبع کیا تھا۔ اس کے بعد آریل سٹاین نے 1900ء میں اس کتاب کا انگریزی نثر میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح اُردو میں مکمل ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ نے دو جلدوں میں کیا جسے چنار پبلشنگ ہاؤس نامی ایک غیر معروف اشاعتی ادارے نے غیر قانونی طور پر سرینگر سے شائع کیا۔ اس پر تاریخ اشاعت درج کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

جواہر لال نہرو نے راج ترنگنی کے رنجیت سیتارام پنڈت کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں اس کشمیری مؤرخ کے فن، اظہارِ فن اور واقعات و حالات کی تصویر کشی کے بارے میں اس طویل اقتباس میں کہا ہے کہ ''یہ تاریخ بھی ہے اور ایک نظم بھی۔ حالانکہ شاعری اور تاریخ کا سنگم معیوب ہے خصوصاً ترجمہ میں اس طرح کے امتزاج سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ہم شاعری کی لَے اور موسیقی کا استحسان نہیں کر سکتے اور وہ بھی کلہن کی اس زبان کو جو اعلیٰ، عمدہ اور مترنم

ہے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی داستان ہے اور اکثر و بیشتر یہ خوشگوار داستان نہیں ہے کیونکہ یہاں درباری سازشوں، قتل و غارت، بغاوت، خانہ جنگی اور ظلم و استبداد کی بہتات ہے۔ یہ آمریت اور فوجی ظلم و جبر کی داستان ہے۔ یہ عوام کی نہیں بلکہ راجاؤں اور شاہی خاندانوں اور اشراف کی داستان ہے۔ پھر بھی کلہن کی یہ تصنیف راجاؤں کی مصروفیات کے بیانِ محض سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ سیاسی، سماجی اور کسی حد تک معاشی معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہاں ہم قرونِ وسطیٰ کا زرّہ بکتر دیکھتے ہیں۔ چمکتے اسلحہ سے لیس جاگیردار بہادروں کو دیکھتے ہیں۔ سازشوں اور جنگوں کو دیکھتے ہیں۔ خواتین پردے کے پیچھے ہی نہیں بلکہ کونسلوں اور میدانوں اور لیڈروں اور سپاہیوں کی حیثیت سے بھی بہت اہم کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بعض موقعوں پر ہم انسانی رشتوں اور محبت و نفرت، عقیدت اور ہمدردی سے انسانی محسوسات کے قریبی منظر دیکھتے ہیں۔ ہم سُیا کی تکنیکی کارگزاریوں اور آبپاشی کے طریقہ کار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دور دراز ملکوں میں للتادتیہ کی جنگی فتوحات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میگواہن کی اُن قابل ستائش کوششوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اُس نے عدم تشدد کو پھیلانے کے لیے کیں اور جس کے لئے وہ معرکہ آرائیاں بھی کرتا رہا۔ مندروں اور وہاروں کی تعمیر اور بداعتقادوں کی تخریب نیز اُن کی جائیداد کی قرقی کا نظارہ بھی دیکھتے ہیں اور پھر یہاں قحط بھی پڑتے ہیں، سیلاب بھی آتے ہیں اور آگ کی وارداتیں بھی رونما ہوتی ہیں جن کے باعث آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ لقمہ اجل بن جاتا ہے اور جو بچ جاتے ہیں وہ مصیبت کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

کلہن کشمیر کو ایک ایسا ملک قرار دیتا ہے جو بغاوت میں لطف محسوس کرتا ہے، لیکن ان بغاوتوں اور انقلابوں کو فوجی حکمران اور مہم جو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں'' (5)۔

نہرو کے ان خیالات کے تناظر میں کلہن نے ملکِ کشمیر کے بارے میں جو یہ لافانی خیال ظاہر کیا ہے اُس کا مفہوم رنگ بدل بدل کے وقت وقت پر اہلِ کشمیر کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''کشمیر ایک ایسا ملک ہے جسے فوج کے ذریعہ نہیں بلکہ پیار اور روحانی شفقتوں کی بدولت ہی جیتا جاسکتا ہے''۔

حوالہ جات:

(1) ہمارا ادب، مشاہیر نمبر 77-1976ء، کلچرل اکادمی سرینگر 1978ء، ص430 تا 431

(2) سٹرگل فار فریڈم اِن کشمیر، پریم ناتھ بزاز، کشمیر پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی 1953ء؛ ص40 تا 41

(3) دورِ بڈشاہی کا نامکمل ترجمہ راج ترنگنی اور اُس وقت کے ایسے دیگر تراجم کا اب کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

(4) کلہن، سوم ناتھ در، ترجمہ مجید مضمر، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، 1992ء؛ ص10 تا 12

(5) راج ترنگنی یعنی بادشاہوں کے دربار کی عظیم داستان، ترجمہ رنجیت سیتارام پنڈت، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1977ء



بلہن پنڈت

کشمیر میں سنسکرت کا گاتا جائے بنجارا!

کشمیر میں بودھوں اور ہندوؤں کے ادوارِ اقتدار میں، جو اشوک اعظم کے دور میں تیسری صدی قبل مسیح سے چودھویں صدی عیسوی تک جاری رہا، سنسکرت علم و ادب اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں ایسے نابغہ روزگار اہالیانِ فکر و دانش پیدا ہوئے جنھوں نے سارے ہندوستان میں اپنی دھاک بٹھا دی اور اس دیوتاؤں کی زبان میں ہر صنف میں ایسے شاہ کار تخلیق کیے جو آج ہندوستان کلاسیکی ادبیات میں اعلیٰ و ارفع مقام رکھتے ہیں۔

کشمیر کو پہلے پہل ''شارداديش'' بھی کہتے تھے۔ بلہن پنڈت نے اس ملک کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا ہے: شاعری اور زعفران شاردا کی دو ایسی خوبصورت اشیاء ہیں جو میں نے کہیں اور نہیں دیکھیں''۔(1)

پی این کاوٹھیکر لکھتا ہے کہ: ''کشمیر ادبی دنیا کی مایہ ناز شخصیات سے بھرا پڑا ہے اور اگر ان کی دین کو نظر انداز کیا جائے تو کوئی ادبی تجزیہ مکمل نہیں کہلائے گا۔ کشمیر کے سرکردہ قلم کار اس ملک کے ہمالائی پہاڑوں، وتستا (دریائے جہلم)، چمکیلے تالابوں اور خوبصورت مرد و زن کو، دیکھ کر فیضان حاصل کرتے تھے''۔(2)

بلہن (گیارہویں صدی عیسوی) کی جائے پیدائش اگرچہ اس کا محبوب کشمیر ہی تھا لیکن وہ بیرون کشمیر سالہا سال تک سفر میں رہا۔ راجہ ہرش

(1089-1101) کے دور میں وہ کشمیر سے سفر پر روانہ ہوا اور شمالی ہندوستان میں متھرا، قنوج، الہٰ آباد، کاشی اور ایودھیا میں قیام کرنے کے بعد مغرب میں سوراشٹر پہنچا۔ اس کے بعد وہ جنوبی ہند میں اس تاریخی جگہ پر پہنچا جہاں سری رام نے اپنے مصاحبوں کے لنکا پہنچنے اور وہاں راون کو شکست دینے کی خاطر پتھروں کا پل باندھا تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ: "راجہ کلش کے دور حکومت میں بلہن کشمیر چھوڑ کر کرناٹک دیش کے راجہ پرماڑی کے پاس چلا گیا تھا۔ وہاں راجہ نے اسے اپنے یہاں ملک الشعرا کے منصب سے نوازا۔ یہ بھی حکایت ہے کہ اس راجہ کے حکم سے صرف بلہن ہی کو پہاڑوں پر سفر کرتے وقت ہاتھی پر سوار ہونے کی اجازت تھی اور بس وہی ایک سر پر شاہی چھتری رکھنے کا مجاز تھا۔ ان عنایات کے باوجود بلہن اس کرم فرمائی کو راجہ ہرش کے دربار کی شان اور احترام کے برعکس نہایت کم تر تصور کرتا تھا"۔ (3)

بلہن کو ان سفری کارکردگیوں کی بنا پر ملک میں ثقافتی یک جہتی کا علم بردار کہا جاتا ہے۔ وہ اگر ایک راجہ کا درباری شاعر بنایا گیا مگر اس نے کسی دوسرے راجہ کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لایا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں مختلف راجوں کے درمیان مخاصمت اور دشمنی کا دور دورہ تھا اور درباری شعرا اور دانشور اپنے مربیوں کی حمایت میں مخالف فریق پر کیچڑ اچھالنا بھی ایک فرض منصبی تصور کرتے تھے۔ بلہن اس سیاسی آلودگی سے اپنا دل و دماغ آلودہ کرنے سے ہمیشہ باز رہا اور اس طرح سماج اور اقتدار کے ایوانوں میں اُس کی عزت و توقیر بڑھتی گئی۔

بلہن کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ سفر میں تھا تو گجرات میں ایک علاقے کے بادشاہ ورسیمہا اور اس کی رانی ستارا کی بیٹی ششی کلا سے ملا۔ جب ششی کلا جوان ہوئی تو اس کے والدین کو اس کی تعلیم و تربیت کا فکر لاحق ہوا۔

دریں اثنا انھیں معلوم ہوا کہ بلہن نام کا ایک ممتاز کشمیری شاعر اور عالم گجرات میں موجود ہے۔ اس نے فوراً بلہن سے رابطہ کر کے اسے دربار میں بلایا اور شہزادی کا اتالیق مقرر کیا۔ اس دوران دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور بالآخر انھوں سے خفیہ طور پر گندھارو اطریقے سے شادی کرلی اور ایک دوسرے کی صحبت میں ہنسی خوشی دن گزارتے گئے۔ آخر یہ راز کھل ہی گیا اور بادشاہ کے خاص اہل کاروں نے اسے یہ خبر سنا کر اسے بے حد دکھی کر دیا۔ بادشاہ نے اس اقدام کو اس حد تک دل آزار اور قابل ملامت سمجھا کہ اس نے بلہن کو فوراً پھانسی پر چڑھانے کا حکم دیا۔ جب بلہن کو تختۂ دار تک لے جایا گیا تو اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی اور یہ بھی کہ وہ اپنے محبوب دیوتا کا نام لے۔ بلہن موت سے نہیں ڈرتا تھا لہٰذا اس نے ایک عالم سرمستی میں ایک شعر پڑھا جس کے معنی یوں ہیں:

مجھے اگر کچھ یاد ہے
تو وہ بس جانِ حیات ششی کلا ہے

بادشاہ کو جب اس عشق کی شدت کا احساس ہوا تو اس نے بلہن کی سزائے موت منسوخ کر کے ششی کلا سے باضابطہ اس کی شادی کروائی اور داماد کو دولت، دیہات، ہاتھی، گھوڑے اور تحفے تحائف دئے۔ بلہن نے بعد میں ششی کلا کے ساتھ ہوئے تمام واقعات کو واضح طور پر بیان کرنے کی خاطر پچاس بندوں پر ایک مختصر شعری مجموعہ تخلیق کیا۔ جس کا ترجمہ کئی یورپی زبانوں میں ہوا جن میں فرانسیسی بھی شامل ہے (4)

بلہن اور اس کے عشق کی کہانی کو دوسری جگہ یامنی پوران تلک نامی شہزادی سے منسوب کیا گیا ہے جس کے لیے جب راجہ نے بلہن کو اس کا استاد مقرر کیا تو اس جوان اور حسین جوڑے کو جسمانی طور الگ رکھنے کے لیے راجہ نے

یہ چال چلی کہ اپنے بیٹی کو کوڑھ کی مریض اور بلھن کو اندھا جتلا کران کے درمیان ایک پردہ حائل کردیا تاکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آتش عشق میں سلگ نہ جائیں۔ایک شبِ چاردہ کو بلھن یوں گنگنانے لگا:

کنول کے پھول کی زندگی ضائع ہی ہوگی
اگر اس نے چودھویں کا چاند نہ دیکھا ہو

شہزادی، جو پردے کے پیچھے نہاں تھی، یہ سن کر حیران رہ گئی کہ اس کا معلم چاند کودیکھ سکتا تھا۔اس نے فوراً یہ کہہ کر شعر کو مکمل کیا:

چاند کی زندگی بھی بے کار ہے
اگر اُس نے کنول کے پھول کو چھوا نہ ہو

دونوں نے یہ شعر سن کر پردہ ہٹایا اور پھر وہ ایک دوسرے کے عشق میں محو اور مگن ہو گئے۔ کئی تنقید نگاروں نے یہاں یہ سوال پوچھا ہے کہ نویں سے کم از کم بارہویں تک کشمیر میں سنسکرت کا احیاء اور ترویج بام عروج تک پہنچ چکا تھا۔اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ بنارس میں سنسکرت کی تعلیم دینے والے اداروں میں یہ سلسلہ چلا آرہا تھا اور غالباً اب بھی اس کا عمل جاری ہے کہ جب کوئی شاستری وہاں سے فارغ التحصیل ہوتا تو کشمیر کی طرف تین بار جھک کر یہاں کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔اس حوالے سے بلھن کے باہری علاقوں میں جانے کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ وہ تعلیم پانے کے لیے نہیں بلکہ تعلیم دینے کی غرض سے سفر کرتا رہا۔مثال کے طور پر کرناٹک کے راجہ وکرم نے اُسے شاہی شاعر مقرر کیا اور سنسکرت زبان پر اس کی غیر معمولی قدرت اور مہارت سے متاثر ہوکر اسے 'ودیاپتی' یعنی علم وفن کے مالک کا خطاب دیا۔بلھن نے اپنے خاندان اور وطن، کشمیر، کے بارے میں اپنی خودنوشت سوانح حیات ''وکرمانک دیو چرتر'' میں خود ہی تعارف اپنا تعارف کرایا ہے۔ یہ دراصل چالوکیہ راجوں کے حالات پر مبنی

ایک بیانیہ بھی ہے جو بلہن نے 1085 میں تحریر کیا۔ڈاکٹر ٹی، این، گنجو نے اس تخلیق سے یہ دلچسپ اقتباس نقل کیا ہے جسے پڑھ کر قارئین بھی محظوظ ہوں گے:

''پرورسین پور (سری نگر) میں تعلیم کے فروغ کی خاطر بے شمار مرکز اور مدرسے ہیں۔ ان میں پڑھنے والی نازک لڑکیوں کی کردھنیا کام دیو کے پیچھے پڑے ہوئے بھگوان شنکر کو بھی ڈراتی ہیں۔اس شہر کے دریا وتستا کے کنارے بنے ہوئے اونچے مکانوں کی کھڑکیوں پر علم وادب کا مباحثہ خوب ہوتا ہے۔اس کو سن کر دیوتا ان پر پھول برساتے ہیں۔ کشمیر میں ودیا کی دیوی سرسوتی خود ہی مدھومتی ندی کے روپ میں رہتی ہے کشمیر کے ادب کی عظمت کا بیان کہاں تک کیا جائے کیونکہ کم کم ،کیسر اور شاعری آپس میں سگے بھائی ہیں اور سوائے کشمیر کے دونوں ساتھ ساتھ کہیں نہیں اُگتے۔

''پرورسین پر کے بیچوں بیچ بہتی وتستا ندی کے دونوں کناروں پر حسین دوشیزائیں پانی کے سنان کوٹھوں (کشمیری: سرانہ کٹھُ یعنی نہانے کا کمرہ) میں اپنی چھاتیوں پر لپے ہوئے چندن اور کیسر کو دھوتی ہیں۔ یہاں کی عورتیں جاڑے میں ناؤ کی بنی ہوئی نہانے کی کوٹھریوں میں نہا کر اپنے جسم کو گرمانے کے لیے کیسر کا لیپ چڑھا کر بکریوں کے اون کے رؤوں سے بنے کستوری خوشبو والے توس یعنی پشمینہ کے شال اوڑھتی ہیں۔ یہاں کے لوگ ناچنے گانے کے بڑے شوقین ہیں، راجہ کشیم گپت کے کشیم گوری شنکر مندر کے دالانوں میں حسین اور نازک اداؤں والی دوشیزائیں روز ہی جمع ہوتی ہیں۔ ان کے رقص کو دیکھ کر جنت کی حوریں بھی بھونچکی رہ جاتی ہیں''۔(5)

بلہن کی سوانح حیات میں پہلی بار کسی سنسکرت قلم کار کی داستان زندگی کا بیان ہے۔اس کے کئی ہم عصروں نے اس طرف توجہ نہیں دی ہے جس کی وجہ سے اس دور کے تاریخی واقعات پر گم نامی کا پردہ پڑ چکا ہے۔ کلہن کے برعکس جس نے

اپنی تاریخ میں زیادہ تر راجوں مہاراجوں کی نجی زندگیوں، جنسی بے راہ رویوں اور عیاشیوں ہی کی داستانوں سے اپنی راج ترنگنی کو آراستہ کیا ہے، بلہن نے اہل کشمیر پر یہ احسان تو کیا ہے کہ انھیں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کا سامان مہیا کیا ہے۔اس بیانیہ کی بدولت قاری کو گزرے ہوئے کشمیر کے سماجی، ثقافتی اور دیگر حالات زندگی کے گونا گون پہلوؤں سے بہت حد تک آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔ مثلاً اس کا یہ بیانیہ ہمیں اس وقت کے دلچسپ کوائف سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ بلہن کی جائے پیدائش اور خاندانی پس منظر سے یوں معلومات فراہم کرتا ہے: ''پرور پرسین سے تیس کوس کے فاصلے پر جیون (موجودہ زیون) کا گاؤں ہے۔ یہاں پر ایک اونچا چتیہ (ایک قسم کا بدھ مندر) ہے۔ یہاں ناگوں کے راجہ تکشک سے منسوب صاف پانی کا یک چشمہ ہے جو بے بدن کل جگ کے ماتھے کو کاٹنے کے لیے چاک کے مانند ہے۔اس کے پاس ہی بغل میں ساری خوبیوں سے بسا ہوا کھون مش (کھون موہ) گاؤں ہے جہاں کوشک گوتر کے برہمن رہتے تھے جن کو مہاراجہ گویاب دتیہ نے مدھیہ پردیش سے لاکر بسایا تھا۔ یہاں پر مکتہ کلش نام کا رئیسِ دانش گاہ ہے جو چاروں ویدوں کا ماہر ہے۔مکتہ کلش کا بیٹا راج کلش ہے۔اس نے لوگوں کی آسائش کے لیے جگہ جگہ پر انگوروں کے باغ، پانی پینا کے لیے سبیلیں لگوائیں۔اس کا بیٹا جشیٹ کلش ہے۔ وہ سدب اور فلسفہ کا زبردست عالم ہے۔اس نے سنسکرت کے سبب سے بڑے گرائمر دان پامتی اور پتنجلی کے مہاباش پر تبصرہ لکھا ہے۔اس کے صحن میں طلبا اور طالبات کی بڑی بھیڑ جمی رہتی ہے۔

''موریہ بادشاہ اشوک نے سری نگر راجدھانی کی داغ بیل ڈالی۔اس سے پہلے پران ادھشتھان (پاندریٹھن) ہی کشمیر کی راجدھانی تھی۔اشوک نے نئی راجدھانی آج کے بادامی باغ کے آس پاس ہی بنوائی اور یہاں پر اشوک

بٹارک وہار بھی تعمیر کیا۔اس کے علاوہ موجودہ براڈوے سینما کے پاس سورن وہار (موجودہ سونوار) کو تعمیر کیا اور گوپادر (شنکر آچاریہ) کے شمال میں بھکشو وہار (بچھوارہ) بھی تعمیر کیے گئے۔ اس طرح سری نگر کا پھیلاو نوپر (ناؤپورہ) اور راجانک واٹکا (رعنا واری) تک ہوا اور مغرب میں سری نگر مکشکا سامن (مائسمہ) تک ہوا۔ اس سرحد کے آگے راجہ پرورسین ثانی کے ذریعے بنائی گئی سری نگر کی سرحد آتی ہے جس کا پھیلاو گنجا وہار (گوجوارہ) تک ہے۔ پرور پرسین میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں پارک اور باغ نہیں ہیں۔ ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں تالاب نہیں ہے۔ چاروں طرف پھل پھول اور سایہ دار درخت لگے ہیں۔ پرور پر کے لوگ جیٹھ اور اساڑھ کے سورج کی تپش کو انگور کا رس پی پی کر دور کر لیتے ہیں"۔(6)

بلہن قدیم سنسکرت شعرا میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہمیت کا ل ہے کہ اس نے اپنے پیارے وطن کشمیر کی جی بھر کے تعریفیں کی ہیں۔اس مناسبت سے اگر یہاں پر مشہور فرانسیسی سیاح، مورخ اور طبیب فرنکویس برنیر (1620-1688ء) کے سفر نامۂ کشمیر کا ایک طویل مگر بے حد رنگین اقتباس پیش کریں تو ان دونوں کشمیر نوازوں کے عشق کشمیر کا تقابلی لحاظ سے تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ قاری اس زمانے کے کشمیر کی ایک دیدہ زیب تصویر آنکھوں کے سامنے لا سکتا ہے۔ برنیر مغل بادشاہ اورنگ زیب کے وقت میں کشمیر آیا۔ وہ اس جنت ارضی کے بارے میں یوں اپنے تاثرات بیان کرتا ہے:

"جہاں تک کشمیر کا سوال ہے وہ اب جھیل نہیں بلکہ ایک خوبصورت اور حسین ملک ہے۔اس میں متعدد پہاڑ اور پہاڑیاں ہیں۔اس کی لمبائی نوے میل اور چوڑائی اور عرض دس میل ہے۔وہ پہاڑیاں جو کشمیر کے اردگرد ہیں ان کی بلندی اوسط درجے کی ہے۔وہ سرسبز درختوں سے بھری ہوئی ہیں اور جابجا چراگاہیں ہیں

جہاں گائیں، بھیڑیں، بکریاں اور گھوڑے، تیتر، خرگوش اور سینگ والے ہرن یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جن کا شکار ہوتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں یہاں سانپ، ریچھ، شیر اور چیتا وغیرہ بہت ہیں کم ہیں۔ اس لیے یہ خوبصورت ملک بے ضرر اور معصوم ہے۔ پہاڑیوں کی برف سے ڈھکی ہوئی دودھیا چوٹیاں کوہِ اولمپس کی طرح منور ہیں۔ ان پہاڑیوں میں سے بے شمار ندیاں اور چشمے زوروشور سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نہریں اور چشمے ایک مصنوعی ڈھنگ سے وادی تک پہنچادی جاتی ہیں اور لوگ ان سے اپنے دھان کے کھیت سینچتے ہیں۔ یہ سب چشمے اور نہریں پھر ایک ساتھ مل کر ایک دریا بن جاتے ہیں جس طرح ہمارے ملک میں دریائے سین ہے۔ اس ملک کو سرسبزو شاداب بنانے میں ان دریاؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس خوبصورت اور قابل تعریف ملک میں ہمیں جو گاؤں دکھائی دیتے ہیں اُن میں ترکاریاں، انگور، دھان، گیہوں، زعفران اور دیگر چیزوں کی کاشت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک فرانس کے میوہ جات مثلاً سیب، ناشپاتی، آلوچہ، خوبانی اور اخروٹ کے پیڑوں سے جن میں لاتعداد پھل لگے ہوئے ہیں یہ سارا علاقہ بھرا ہے۔ خربوزہ، تربوزہ، چقندر، ساگ پات اور ترکاری جن سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں یہاں کے باغیچوں میں کثرت سے اگتی ہے۔۔۔ خوش قسمتی سے میرے قیام کے دوران یہاں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ اس مشاعرہ میں شعرائے کشمیر اور بادشاہی شاعروں نے شرکت کی۔ اس مشاعرہ کے سننے میں میں نے بڑے شوق سے حصہ لیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے جیسے ہی کشمیر میں جلوس فرمایا کشمیر کے شاعر اور بادشاہی شاعروں نے مل کر کشمیر کی تعریف میں قصائد کہے اور بادشاہ کے سامنے پیش کیے۔ بادشاہ نے ان قصائد کو بڑی دلچسپی سے سنا اور شاعروں کو انعام واکرام سے نوازا"۔ (7)

بلہن نے سنسکرت میں جو نغمے لکھے وہ اس نے "چوراپنچ شکا" نامی پچاس

بندوں پر مشتمل مجموعے میں مرتب کیے۔ اس تخلیق کے بارے میں کہا گیا گیا ہے کہ اس میں تخیل کی بلندی، فن کارانہ کمال اور تغزل کی کارفرمائی نے اسے ایک پراثر مجموعہ شعر بنا دیا ہے۔ یہ وہی مجموعہ کلام ہے جو بلہن نے اس وقت قید خانے میں لکھا جب بادشاہِ وقت نے اسے شہزادی کے ساتھ خفیہ عشق بازی کی پاداش میں سزائے موت سنائی تھی۔

بلہن کی ایک اور تصنیف ''کرن سندری'' ہے جو ایک ڈراما ہے جو چانکیہ خاندان کے بھیم دیو کے بیٹے کرن راج اور راج کماری کی داستان عشق ہے جسے شاعر نے رومانوی نغمات سے بھی آراستہ کیا ہے۔

تجزیہ کاروں اور ماہرین فن کی رو سے بلہن کی خودنوشت سوانح ایک بہترین تصنیف ہے جس پر کوئی اختلافی رائے موجود نہیں۔ اس میں وہ اپنی ذات کے بارے میں اٹھارویں بند میں کشمیر کی راجدھانی کا ذکر کر کے پھر کشمیر کے راجوں کی تفصیلات اور بعد میں اپنے آباواجداد کی کہانی بیان کرتا ہے۔ بلہن نے یہاں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن مقدس دریا گنگا کے کنارے گذارنا چاہتا ہے۔

بلہن نے اس کتاب میں گہری عقیدت اور بھرپور محبت کے ساتھ پرور پور کے شہر کا ذکر کیا ہے جسے اب پامپور کہتے ہیں اور جو دریائے وتستا کے کنارے واقع ہے جہاں انگور کے باغات تھے اور موسم گرما میں سورج کی معتدل اور خوش کن شعاعیں چمک اٹھتی تھیں۔ اس کے بقول سنسکرت کے بڑے بڑے عالم یہیں پر رہتے تھے گویا یہ ان کے لیے تقدس کی جگہ تھی جنھوں نے گورو برہس پتی کو علومیات میں پیچھے چھوڑا تھا۔ یہ شہر دیوی سرسوتی کے مسکن کیلاش پربت کے سائے میں موجود تھا۔ بلہن یہاں پر یہ بھی بتاتا ہے کہ اس شہر کے لوگ کس قدر علم و دانش سے مالامال تھے کہ ہر گھرانے میں سنسکرت اُتنی ہی آسانی

سے بولی جاتی تھی جتنی کہ وہ اپنی مادری زبان کا استعمال کرتے تھے۔(8)

بلہن کی دیگر تصانیف میں ایک مہا کاویہ، ایک ناٹک وغیرہ بھی شامل ہیں۔بلہن کو ازمنہ وسطیٰ کے عظیم شعرا میں گنا جاتا ہے جب کشمیر سارے ہندوستان میں سنسکرت ادبیات اور خاص کر شعریات کا سب سے بڑا گھوارہ تھا اور کے کلاسیکی سرمائے میں بلہن پنڈت نے اپنے قلم کی موشگافیوں سے خاطر خواہ اضافہ کیا جس کی بنا پر وہ ہزار سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہندوستاں کے برگزیدہ سنسکرت لکھاریوں کی صفِ اول میں اپنے مرتبہ پرشان اور آن سے براجمان ہے۔

حوالہ جات:

(1) بلہن، پی این کاوٹھیکر، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، 1995ء، ص 1

(2) ایضاً

(3) راج ترنگنی

(4) بلہن کے بارے میں یہ کہانی کاوٹھیکر نے بیان کی ہے، ص (44-43) لیکن بلہن کا ایک جرمن مترجم جارج بہلر اس داستان کو محض ایک مفروضہ قرار دے کر کہتا ہے کہ ایسا محض شاعر کی زندگی میں رنگ آمیزی کی خاطر کہا گیا ہے۔(خیال)

(5) ہمارا ادب، مشاہیر نمبر، 77-1976، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1978، 263

(6) ایضاً ص 262,264,265

(7) ٹریولزان دی مغل ایمپائر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، 1916ء، ص 424-422

(8) یہاں پر بلہن نے مادری بولی کی نشان دہی نہیں کی ہے کہ کیا وہ کشمیری تھی یا کوئی اور زبان جو اب ناپید ہو چکی ہے۔



سوم دیو کی کتھا سرت ساگر

دنیا میں کہانیوں کا اوّلین مجموعہ

قدیم ہندوستان میں جو ادب پہلی بار زیر بحث لایا گیا وہ عوامی ادب تھا۔ یہ ادب ہندو حاکموں کے مختلف ادوار میں مندروں میں دیوتاؤں اور دیویوں کے لیے ترنم سے گائے جانے والے نغمات کی شکل میں وجود میں آیا۔ جس طرح زمانۂ جاہلیت میں عربستان میں شاعری پہلے پہل اُس تحریک کے نتیجے میں شروع ہوئی جو عرب کے بدوی قبیلوں کو لق ودق صحراؤں میں سفر کرتے ہوئے اونٹوں کے گلے میں باندھی ہوئی گھنٹیوں کی مترنم آواز سے ملی جسے عربی شاعری میں حُدی کا نام دیا گیا۔

ہندوستان چونکہ ہندو ملک ہے اور یہاں ہندودھرم کے دیوی دیوتا صدیوں سے پوجے جاتے ہیں، لہٰذا اس ملک کی لوک شاعری بھی انھی کی شان میں قصیدہ خوانی یا بھجن یا پرارتھنا کی شکل میں موزون ہوتی رہی اور عام عقائد کے مطابق دیوی دیوتاؤں کی شان میں کسی بھی گستاخی کا کوئی امکان باقی نہیں رکھا گیا۔ شیو، برہما اور شنکر وغیرہ جیسے طاقت ور دیوتا انسان کے لیے ناقابل تسخیر قوتیں بن گئیں اور انھی کی شان میں سنسکرت زبان میں لاکھوں اشعار تخلیق کیے گئے جو قدیم ہندوستان میں مذہب داروں اور مندروں کے پجاریوں کی کلاسیکی زبان بن گئی۔

ہندوستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں کہانیاں سنانے کا شوق ایک فن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہند میں ہی پارس کے باشندوں نے یہ فن سیکھ لیا اور اسے عربستان کی سرحدوں کے اندر تک پہنچایا۔ مشرق وسطیٰ سے داستان گوئی نے قسطنطنیہ اور وینس کی وادی تک کا سفر کیا اور پھر یہ انگلستان اور فرانس تک جا پہنچی۔ اگر چہ ان کہانیوں نے ہر ملک میں وہاں کی مقامی زندگی اور حالات کی جزئیات کو اپنے اندر سمو لیا، لیکن ان میں جو ہندوستانیت کا امتزاج تھا، وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔

ہندوستان میں یہ بے شمار کہانیاں سالہا سال تک سینہ بہ سینہ کہی اور سنی گئیں اور بعد میں سب سے پہلے گناڈیہ نے انھیں ایک مقامی بولی پشاچی میں جمع کرلیا اور اپنے مجموعے کا نام برہت کتھا رکھا جو اب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک کشمیری شاعر پنڈت سوم دیو نے اس گنج گم گشتہ کی باقی ماندہ امارت سے استفادہ کرکے گیارہویں صدی عیسوی میں کتھا سرت ساگر کے نام سے ایک ضخیم کتاب قلم بند کرلی، جس میں اس نے لوک کہانیوں کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا۔ روایت ہے کہ سوم دیو کی کتھا سرت ساگر دُنیا کی اولین لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ تھا جس میں اس کشمیری قلم کار نے لاکھوں اشعار پر مبنی ہزاروں کشمیری لوک کہانیوں کی شیرازہ بندی کی تھی۔ حاکمِ وقت نے سوم دیو کی جمع کردہ کہانیوں کے اسلوب پر تنقید کی جس سے دل برداشتہ ہوکر سوم دیو نے اپنی کہانیوں کے اس بہت بڑے ذخیرے کو نذرِ آتش کردیا۔ بعد میں اس حادثہ سے جو کچھ بچایا گیا، اُسے پھر دوسرے ہاتھوں نے از سرِ نو مرتب کرکے کتھا سرت ساگر کو مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچایا اور بعد میں اسی صورت حال میں اس کی اشاعت ہوئی۔

موجودہ کتھا اٹھارہ جلدوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نثری حصے کے علاوہ بائیس ہزار اشعار درج ہیں۔ ان میں تین سو پچاس سے زیادہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا حجم ہومر کی الیاڈ اور اوڈیسی دونوں کو ملا کر بھی ان سے دوگنا بن جاتا ہے۔ ایک تاریخ دان کے مطابق اس کا سال تحریر 1050ء بتایا گیا ہے۔ یہ عرصہ کھمیندر کے بعد کا تیس سال کا عرصہ بتایا جاتا ہے۔

سنسکرت کے قدیم شاہ کاروں میں والمیکی کی رامائن، ویاس کی مہابھارت، وشنوشرما کی پنچ تنتر، اسوگھوس کی بدھ چرت، کالی داس کے ڈرامے شکنتلا، میگھ دوت، رگھوونش، کمار سمبھو وغیرہ، وشاکادت کا مشہور ڈراما مدرا راکھشس، بانہ بھٹ کا ہرش چرت، سوم دیو کی کتھا سرت ساگر، جے دیو کی گیت گووند اور کلہن کی راج ترنگنی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ عظیم کتابیں چوتھی صدی قبل مسیح سے بارہویں صدی عیسوی تک یعنی سولہ سو سال کے عرصہ دراز کے دوران لکھی گئیں۔

سوم دیو کشمیر کے راجہ اننت کا درباری شاعر تھا۔ اُس کی کتھا سرت ساگر کو دنیا میں کہانیوں کی سب سے ضخیم کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں جو ابواب ہیں اُنہیں لمبکھ بھی کہا جاتا ہے، جنہیں پھر ترنگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتھا سرت ساگر میں مہم جوئی، شہزادوں کی زندگی، شہروں، سیاسی سازشوں، لڑائیوں، جادو اور دغابازیوں اور چالبازیوں، حیوانوں، پرندوں، سادھوؤں، جواریوں اور طوائفوں کی داستانوں کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ الغرض یہ کہانیاں زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتی ہیں۔

کتھا سرت ساگر کی بنیاد اگرچہ فرضی طور پر برہت کتھا ہی پر رکھی گئی ہے لیکن برہت کتھا یا تو ایک فرضی تخلیق ہے یا وہ زمانے کے ہاتھوں ضائع ہو چکی ہے۔ سوم دیو کی کتاب لوک ادب کے نہایت قریب ہے، لیکن اس نے اپنی فنی

صلاحیتوں اور زبان و بیان پر خاصا عبور رکھنے کی بدولت اسے ایک نادر و یکتا تخلیق کا درجہ دیا ہے۔ اس دور میں اس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی کہانیوں کی اور کوئی کتاب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

کتھا سرت ساگر بیانیہ شاعری پر مبنی ہے، جسے آسان مگر شستہ نظم میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس میں کئی کہانیاں ہیں لیکن سوم دیو نے مرکزی داستان کی جزئیات کو اوّل تا آخر برقرار رکھا ہے۔ ان کہانیوں میں مزاح کے دوش بدوش غم کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ شار کا منشی کی زبان میں "ان کہانیوں میں شاندار معیار اور دل نشین اندازِ بیان موجود ہے" (1)۔ لوک ادب تحریر کرنے والوں نے دنیا بھر میں ان کہانیوں سے استفادہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

اس قسم کی تخلیقات میں کم و بیش ایک ہی طرح کے دیو مالائی اور انسانی موضوعات پر داستانیں قلم بند کی جاتی تھیں۔ جس طرح پورانوں میں شامل کہانیوں کا تعلق جادو، موسیقی، سماجی رشتوں، مذہبی سرگرمیوں، شجاعت اور جنگ وجدل اور دیوتاؤں اور انسانوں کے تئیں محبت کے اظہار کے ساتھ ہے، اُسی طرح سوم دیو کی کتاب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کہانیاں دراصل بھگوان شیو نے پاروتی کو سنائی تھیں۔ پھر یہ کہانیاں پشپادت نے کان لگا کر سن لیں جس نے بعد میں گناڈیہ کے نام سے جنم لیا۔ اُسے شہنشاہ سالی واہر کے دربار میں ایک معزز درباری مقرر کیا گیا اور یہیں پر گناڈیہ نے یہ کہانیاں بارِدگر پشاچی بولی میں ورطہ تحریر میں لائیں۔ واسو بھاگ نے ان میں سے کئی کہانیاں اخذ کر کے انھیں پنچ تنتر نامی کہانیوں کے ایک اور مجموعہ میں شامل کر لیا۔ واسو بھاگ کی کہانیوں کا تذکرہ جاپانی، لاؤس اور سیامی کہانیوں کے مجموعوں میں بھی ملتا ہے۔

یہ پنچ تنتر کی کہانیاں جنھیں بعد میں وشنو شرما نے اپنی زبان و بیان میں

مرتب کرلیا بجائے خود ایک فسانہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جس کا نام امرشکتی تھا۔ اس کے تین مجہول بیٹے تھے۔ امرشکتی نے عالم بے بسی میں اپنے درباریوں سے کہا کہ مجھے ان احمقوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی راستہ دکھاؤ۔ ان میں ایک نہایت عقل مند درباری تھا جس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شہزادوں کو مذہبی تعلیم نہیں دی جانی چاہیے، بلکہ انھیں فہم و فراست کے علم کی روشنی سے منور کیا جانا چاہیے۔ اس درباری نے بادشاہ سے کہا کہ اس کام کو وشنو شرما نام کا ایک دانشور ہی انجام دے سکتا ہے۔ وشنوشرما کو طلب کیا گیا اور پھر اُس نے چھ ماہ کے اندر پنچ تنتر مرتب کر کے نافہم شہزادوں کو اسے غور سے پڑھنے اور اس میں درج کہانیوں کے مثبت پہلوؤں کو ذہن نشین کرنے کی ہدایت کی۔ امرشکتی کو یقین نہیں آتا تھا کہ محض ایک کتاب تین جاہل نوجوانوں کی اس طرح ذہنی رہنمائی کر کے انھیں عقل سالم اور دانش کامل سے مالا مال کرسکتی ہے۔

پنچ تنتر کی کہانیاں چرند و پرند کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ مشہورِ عام کہانی بھی شامل ہے جس میں ایک بار مگرمچھ نے ایک بندر سے دوستی گانٹھ لی اور وہ اسے ایک لذیذ میوہ کھلاتا رہا۔ ایک دن مگرمچھ نے یہی میوہ اپنی بیوی کو کھلایا تو اسے اس کی لذت اس قدر بھا گئی کہ جب اسے پتہ چلا کہ بندر روز یہی میوہ کھاتا ہے تو اُسے خیال آیا کہ پھر بندر کا کلیجہ میوہ چکھ چکھ کے بے حد لذیذ بن چکا ہوگا۔ اُس نے مگرمچھ سے فرمائش کی کہ وہ اسے بندر کا کلیجہ نکال کے کھلا دے ورنہ وہ خودکشی کرے گی۔ مگرمچھ نے چاروناچار اس فرمائش کو پورا کرنے کی غرض سے ایک روز بندر سے کہا کہ وہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو جائے تاکہ مگرمچھ اسے گہرے تالاب کی سیر کرا سکے۔ جب یہ دونوں تالاب کے بیچوں بیچ پہنچے تو مگرمچھ نے اسے اپنی بیوی کی خواہش کے بارے میں بتا کر کہا کہ میں تمھیں اسی جگہ میں ڈبو کر تمہارا کلیجہ نکال کر اُسے کھلا دوں گا۔ ہوشیار بندر نے اپنی موت

اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی تو اس نے مگرمچھ سے کہا، ''بھائی تم تو میرے جگری دوست ہو، میرا کلیجہ کیا میری جان بھی تمہاری بیوی کے لیے حاضر ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ میں اپنا کلیجہ اُسی درخت پر چھوڑ آیا ہوں جس پر میں رہتا ہوں، اگر تم نے پہلے بتایا ہوتا تو میں اُسے ساتھ لے کر آجاتا'' مگرمچھ نے اس پر بھروسہ کیا اور اسے واپس کنارے کی طرف لے جانے لگا۔ بندر نے فوراً کنارے پر چھلانگ لگائی اور درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچائی۔ اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک خونخوار اوانجانے شخص پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

کتھا سرت ساگر میں شہزادہ نرواہن دت چھبیس بیویوں کو جیت کر جادوگروں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں ایک کہانی کے اندر ایک اور کہانی کا خاکہ شامل ہے جس کی وجہ سے اس میں الف لیلیٰ جیسی دلچسپی اور انہماک کا عالم موجود ہے۔

کتھا سرت ساگر کی اوّلین کہانیوں میں وہ داستان بے حد دلچسپ ہے جس میں وارارروچی نام کا ایک شخص گھر سے باہر جاتا ہے تو کئی معزز ہستیاں اس کی خوبصورت بیوی اُپاکوشا پر ڈورے ڈالتی ہیں۔ اُپاکوشا ان سبھی عاشقوں کو یہ پیغام بھیجتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص وقفے کے بعد اُس کے شبستان میں آئے اور اپنی جنسی خواہش پوری کر لے۔

اس طرح اپاکوشا چالاکی سے ہر ایک نام نہاد عاشق کو مادرزاد ننگا کر کے چراغ کے دھوئیں کی کالک اُس کے منہ پر ملتی ہے اور انھیں اسی حالت میں الگ الگ الماریوں میں بند کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہیرانے گپتا نام کا ایک سوداگر بھی وہاں آ کے اُس رقم کی واپسی سے بہ آواز بلند انکار کرتا ہے جو اُس نے وارارروچی سے اُدھار لی تھی۔ وارارروچی کی واپسی پر اپاگوشا الماریوں کو کھول کر ان بدکردار مردوں سے یہ گواہی بھی دلواتی ہے کہ ہیرانے گپتا نے بہ بانگ دہل قرض لوٹانے

سے انکار کیا۔ وارارو چی خود صاحبِ اختیار تھا، لہٰذا اُس کے حکم سے ان سبھی مردوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں اور انھیں سزائیں بھی دی گئیں۔ کہانی نگار کے بقول اس کہانی کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی بھی شخص غلط کاری سے خوش حال نہیں ہوسکتا۔

سوم دیو شیو کا پجاری ایک برہمن تھا۔ اُس کا اصلی نام سوم تھا اور دیو اُس نے برہمن ہونے کے حوالے سے اپنے نام کے ساتھ جوڑا تھا۔ این ایم پینزر کے خیال میں کتھا سرت ساگر 1070ء کے آس پاس یا اُس کے اڑھائی سو سال بعد تخلیق کی گئی ہوگی۔

النکار شاستر سے قطع نظر جس میں کشمیر نے نام کمایا تھا، اُس زمانے کے کشمیر میں سوم دیو، کھیمیندر، دامودر گپت، بلہن اور کلہن آسمان ادب کے روشن ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان عظیم تخلیق کاروں نے اپنے فن کے میدان میں بہت بڑے معرکے سر کیے اور عظیم المرتبت قلم کاروں کی صفوں میں اپنی جگہ بنائی۔

ڈاکٹر کے ایم پانیکر کا یہ کہنا درست ہے کہ "کشمیر میں دورِ قدیم سے لے کر چھٹی صدی عیسوی تک سنسکرت میں جو بھی ادب تخلیق کیا گیا وہ ناپید ہے"۔

اگرچہ آٹھویں صدی اور اس کے بعد کی تخلیقات پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دور کشمیر میں تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور ایک سنہرا دور رہا ہوگا۔ راج ترنگنی میں بھی کلہن نے کئی ایسے پیش رو شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس سے پہلے سنسکرت کی کلاسیکی زبان میں ادب کی گوناگوں اصناف میں اپنی فن کاری اور تخلیقی مہارت کے گل و گلزار کھلائے۔ پانیکر کے بقول اُس دور میں کشمیر کے ایک حکمران واسونند نے فحش کاری پر سمر شاستر کی ایک مشہور کتاب تصنیف کی، اگرچہ یہ تصنیف بھی زمانے کی ستم رانیوں کا شکار ہوکر ضائع ہوچکی ہے۔(2)

کتھا سرت ساگر کا پہلا انگریزی ترجمہ سی ایچ ٹانے نے کیا جو 1880ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمہ کے بارے میں جیمز میلنسن کا کہنا ہے کہ ''یہ اس قدر واضح اور برمحل ہے کہ اسے پڑھ کر ہر کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اس کتاب کو پھر سے زیر ترجمہ لانے کی کیا ضرورت ہے'' (3)۔ جیمز میلنسن نے خود بھی کتھا سرت ساگر کا ترجمہ کیا ہے۔ بعد میں اس عدیم المثال تخلیق نے این ایم پینزر کو بے حد متاثر کیا اور اس نے بھی 1927ء میں دس ضخیم جلدوں میں **Ocean of Stories** کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔

حوالہ جات:

(1) آن دِی امپارٹنس آف کشمیری کلچرل ہیری ٹیج، وتستا ویب سائٹ

(2) وتستا سالنامہ، کشمیر سبھا کلکتہ۔ جلد 32، 99-1998ء

(3) کلے سنسکرت لائبریری، کتھا سرت ساگر۔ یونیورسٹی پریس دِی جے سی فاؤنڈیشن۔ نیویارک 06-2005ء

☆☆☆

آنندوردھن

ازمنہ وسطیٰ کے کشمیر کا شہنشاہِ بلاغت

کشمیر میں سنسکرت کی ادبیات اور ثقافت کا دور دورہ آج سے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل مقامی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر حاوی رہا۔ اس دوران سنسکرت نے یہاں ایسے عظیم المرتبت علماء وفضلاء پیدا کیے جنھوں نے اپنی فکر اور قلم سے دنیائے تمدن کو آباد کیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے لاتعداد اصحاب علم و دانش اپنی تخلیقات اور تحریریں کشمیری ماہرین ہی کو نظر ثانی کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ٹی این رینہ کے بقول: ''چنانچہ گیارھویں صدی میں ابوریحان البیرونی نے بھی اپنی چند تصانیف ترتیب دیں اور انھیں کشمیری عالموں کے پاس بھیجا تاکہ ان سے شرف قبولیت حاصل ہو''۔(1)

آنندوردھن اسی زمانے کا ایک منفرد قلم کار تھا جسے ادبی دنیا میں فن بلاغت کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی مشہور کتاب ''دھنیہ لوک'' میں فصاحت و بلاغت کے علم پر ماہرانہ انداز میں مبسوط اور جامع بحث کرنے کی بنا ڈالی ہے۔ ٹی، این، رینہ ہی لکھتا ہے کہ: ''آنندوردھن کا نام سنسکرت علم وادب کے اُس شعبے کے ساتھ قریبی طور وابستہ ہے جسے النکار شاستر کہا جاتا ہے۔ بہرحال ہم اسے عام اصطلاح میں فنِ بلاغت کہہ سکتے ہیں۔ ملک بھر میں اس فن کے سولہ سرکردہ استادوں اور عالموں میں سے

چودہ کا تعلق کشمیر سے رہا ہے''۔(2)

چودھوی صدی عیسوی تک کشمیر میں زیادہ تر سنسکرت ہی کا بول بالا رہا جسے بودھ اور ہندو حکمرانوں نے سرکاری اور حکومتی سرپرستی سے نوازا۔اس دوران کئی سنسکرت تاریخ دانوں اور قلم کاروں کو درباروں میں عزت بخشی گئی اور وہ درباری سرگرمیوں سے پوری طرح واقف ہوتے رہے۔ان سرگرمیوں میں سب سے زیادہ غلبہ جنسی آوارگی، خباثت اور رزالت کا ہی دور دورہ تھا۔سماج میں ہر طرح کی بے راہ رو سرگرمیوں، بے راہ روی، درباروں میں سازشوں کی بھرمار، تخت و تاج کے لیے قتل وغارت کا تسلسل، توہم پرستی کی بنیاد پر خانہ جنگی اور اسی طرح کی حیوانی درندگی کا دور دورہ تھا۔کلہن نے راج ترنگنی میں اُن آبرو باختہ درباری رقاصاؤں، حسین داشتاؤں اور کنیزوں کا بار بار ذکر کیا ہے جو دن رات شراب اور نشے میں ڈوبے ہوئے مہاراجوں اور راجوں سے دل برداشتہ ہو کر اپنی نہ مٹنے والی جنسی شہوت اپنے محافظوں اور نوکروں سے ہی مٹاتی تھیں۔راج ترنگنی میں ہی ایک ظالم راجا مہراکل کا وہ ہیبت ناک واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے ملک میں کوئی عورت کنواری نہیں رہی ہے تو اس نے تمام کی تمام عورتوں کو تہہ تیغ کرنے کا حکم دیا جن کی تعداد کلہن نے حیران کن طور پر لاکھوں سے کہیں زیادہ بتائی ہے۔اگر چہ یہ بھی تاریخی روایت ہے کہ مہراکل خود زنا کاری کا رسیا تھا۔

انسانی معاشرے میں بدنظمیوں، بداخلاقیوں اور بدانتظامیہ کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ راجے مہاراجے بجائے خود انسانیت اور مذہبی عقیدت کے پرستار نہیں تھے۔وہ محض توہم پرستی اور غیبی دیوتاؤں کے نادیدہ خوف میں مبتلا تھے مگر یہ خوف بھی اب ان کی نفسانی خواہشات پر غالب آچکا تھا۔

لہٰذا اوقت کے قلم کاروں نے بھی اپنی تخلیقات میں اس دور ابتلا کے

واقعات کا مزہ لے لے کر تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اگر کلہن کی راج ترنگنی ہی پر نظر ڈالی جائے تو اس کے صفحات شاہی جنگ وجدل اور عورت کے لیے خون ریزی کے بازار گرم کیے جانے کے تکلیف دہ واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

درباروں کے منظور نظر شاعر اور دانشور انسانی زندگی کے اس شرمناک پہلو کی رنگا رنگیوں سے خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور انھی حقیقی داستانوں کو انھوں نے اپنی تخلیقات میں نمایاں اور واضح طور پر پوری تفصیلات کے ساتھ مزے لے لے کر قلم بند کیا۔

آنند وردھن کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اس کی ہر تحریر میں بھی جنس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ ذکر موجود ہے خواہ وہ کسی حکایت کی شکل میں ہو یا اسے ایک فلسفیانہ انداز بیان میں لکھا گیا ہو۔

بقول عنبر بہرائچی ''آنند وردھن عبقری حیثیت کا مالک تھا'' (3) جس کا زمانہ 860 اور 890ء کے آس پاس بتایا جاتا ہے۔

بہرائچی ہندو دیومالا کے پس منظر میں وردھن کے فلسفے کی یوں تشریح کرتا ہے: ''قدیم ہندو اساطیر میں خدائے مطلق کی تین صفات یعنی خلاقی، ربوبیت اور قوت فنا کی تجسیم تین دیوتاؤں یعنی برہما، وشنو اور مہیش میں کی گئی۔ یوں قدیم ہندو مذہبی تصورات میں بھی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے عقیدے کو اس شکل میں قبول کیا گیا۔ وشنو جی نے خود اپنی خواہش سے نرسنگھ کا روپ اختیار کر کے کشپ اور اس کے راکششوں کو مار کر سیدھے سادے عام لوگوں کو ان کے مظالم سے نجات دلائی تھی''۔ یہاں نرسنگھ روپ والے بھگوان وشنو کے خوبصورت ناخنوں کو ہلال کی خوبصورتی پر فوقیت دیتے ہوئے انھیں غم زدہ اور پریشان حال انسانوں کے غموں کو کاٹنے والا بتایا گیا ہے۔ نیز دھونیہ لوک کی شرح کرنے والوں اور اس کے قارئین کی حفاظت کرنے والا بتایا گیا ہے۔ (4) یہاں پر ناخنوں سے

غموں کو کاٹنے والے بتانا ترکیبی لحاظ سے غیر مانوس اظہار بیان لگتا ہے۔

آنند وردھن کی تحریروں میں جمالیاتی حسیت کی توضیح وتشریح موجود ہے مگر اس اظہار بیان سے بھی اس نے جمالیات کو جنس زدہ بنا دیا ہے اور ایسا اُس نے اپنے پیش رؤوں یا ہم عصروں کی تقلید کرتے ہوئے کیا ہے۔ جن کے یہاں جنسی جبلت کا غلبہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا کئی دیگر سنسکرت علما اور فضلا کی طرح آنند وردھن کے اعصاب پر بھی ایک یا دوسرے روپ میں عورت ہی سوار رہی ہے۔ اپنی اس تخیلاتی اپج کو اظہار کی شکل دیتے وقت وہ اس طرح کے تمثیلی اسلوب کا سہارا لے کر لغوی اور مجازی معنی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کی ایک حکایت میں ایک پنڈت سے کہا جاتا ہے: ''پنڈت جی مہاراج! گوداوری دریا کے کنارے رہنے والے پاگل شیر نے آج اُس کتے کو مار ڈالا ہے۔ اب آپ آزاد ہو کر گھومئے پھریے۔ گوداوری کے کنارے کوئی خوبصورت جگہ کسی نوجوان عورت کے اپنے عاشق سے ملنے کا مقام ہے۔ اس جگہ کی خوصورتی کے سبب ایک مذہبی پنڈت جی شام کی عبادت کے لیے ادھر آجاتے ہیں حالانکہ ادھر رہنے سے ظاہر ہے کہ اس سے اس بدکردار عورت کے کام میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ وہ پنڈت جی ادھر نہ آئیں۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سیدھے انھیں منع نہیں کرسکتی اس لیے وہ اس مقام پر ایک خونخوار شیر کی موجودگی کی اطلاع دے کر سادھو مہاراج کو ڈراتے ہوئے وہاں آنے سے روکتی ہے۔ وہ سادھو مہاراج کو اطلاع دے رہی ہے اور کہتی ہے کہ سادھو مہاراج! وہ کتا جو آپ کو روز تنگ کیا کرتا تھا اُسے گوداوری کے کنارے جھاڑیوں میں رہنے والے شیر نے مار ڈالا ہے۔ یعنی روز آپ کے گھومنے پھرنے میں رکاوٹ ڈالنے والے کتے کے مرجانے سے آپ کے راستے کے رکاوٹ ختم ہوگئی ہے اور اب آپ

بے خوف ہو کر گھومیں پھریں۔ وہ بدکردار عورت جانتی ہے کہ سادھو مہاراج کتے سے ڈر جاتے ہیں۔ جب انھیں یہ معلوم ہوگا کتے کو شیر نے مار ڈالا ہے اور وہ شیر یہیں جھاڑیوں میں رہتا ہے تو وہ یقیناً ادھر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اسی لیے وہ سادھو مہاراج کو بے خوف ہو کر گھومنے پھرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لیکن بین السطور وہ یہ بتانا چاہتی ہے کہ ادھر بھول کر بھی قدم نہ رکھنا ورنہ آپ کی خیر نہیں۔

اس کے لغوی معنی مثبت ہے کہ وہ سادھو کو ممکنہ خطرے سے آگاہ کرتی ہے لیکن مجازی معنی مختلف ہیں کہ اس کے عاشق کے ساتھ اس کی بدکاری کا راستہ کھلا رہے اور وہاں کوئی دوسرا قدم رکھنے کی جرات نہ کر سکے۔

اسی طرح آنند وردھن ایک اور جگہ یہ کہانی سناتا ہے: ''کوئی راہ گیر رات میں کہیں پر آرام کرنا چاہتا ہے۔ دفعتاً اُس کی نظر کسی نوجوان عورت پر پڑتی ہے جس کا خاوند کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ راہ گیر اس عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس سے تنہائی میں وصل کا خواہاں ہے۔ یہ نوجوان عورت بھی راہگیر کی خواہش سمجھ لیتی ہے اور وہ اس سے جسمانی ملاپ سے پہلے اسے کہے دیتی ہے: ''اے مسافر! دن میں تم میری اور میری ساس کی سونے کی جگہیں دیکھ کے رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میرے بجائے میری ساس کے بستر میں گھس جاؤ اور صبح جب اٹھو گے تو رُسوا ہو جاؤ گے''۔

اب آنند وردھن کے اسی قبیل کے چند خیالات سے محظوظ ہو کر اس عالم دہر کو الوداع کہیں مگر ان تحریروں میں فضائل اور فلسفۂ طیبہ تلاش کرنے کی زحمت نہ کریں:

☆ دونوں طرف ڈھلے ہوئے پستان اور رانوں کے لمس سے زیادہ مرجھایا ہوا، کمر میں رابطہ نہ ہونے کے سبب سبز، مرجھائی ہوئی بانہوں کے

پھیلانے اور لڑکھنے سے منتشر نیلوفر کے پتوں کی یہ سیج دبلی پتلی فراق زدہ خوب رو کے دکھ کا اظہار کر رہی ہے۔

☆ محبوب کو سو بار چوما جاتا ہے۔ ہزار بار گلے لگایا جاتا ہے اور رک کر ہم بستری کی جاتی ہے۔ پھر بھی اسے اوب نہیں لگتی ہے۔

☆ ناراض، خوش، ہنستی ہوئی، روتی ہوئی، چاہے جس شکل میں پکڑی گئی منچلی عورتیں اپنے عاشق کا قلب چرا لیتی ہیں۔

☆ عاشق نے معشوقہ کے پستان نئی نئی بیل سے چوٹ کی جو بہت نرم ہوتے ہوئے بھی سوتوں کے دلوں کو بہت ناگوار گذری۔

☆ اُس دوشیزہ کی ابھری ہوئی اور سنگ مرمر کی طرح سخت چھاتیاں گویا کسی مہاراجے کے شاندار محل کے سب سے اونچے دو گنبد۔ انھی کو پستان کہیں تو کیا کہنا!(5)

آنند وردھن پر قلم اٹھانے سے پہلے تحقیق کے حوالے سے جو مواد انگریزی یا اردو میں مطلوب تھا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُس کی اپنی تخلیقات دھنیہ لوک کے سوا اس کی کوئی اور تصنیف موجود نہیں۔ ان پر اگر کسی محقق نے خامہ فرسائی کی بھی ہے تو وہ تحریریں بھی سنسکرت ہی میں ہیں جن سے ہم واقف نہیں۔ البتہ دھنیہ لوک کا اردو میں تجزیہ عنبر بہرائچی نے اسی (80) صفحات پر مشتمل ایک کتابچے میں کیا ہے جس میں بھی انھوں نے چند سنسکرت عالموں کی تحریروں سے ہی استفادہ کیا ہے کیونکہ عنبر سنسکرت جانتے ہیں لیکن یہاں دیکھنے میں آیا ہے کہ انھوں نے کئی جگہ سنسکرت کے الفاظ اور تراکیب کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انھیں جوں کا توں رکھا ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بھی سنسکرت سے پوری طرح واقف نہیں تھے؟ آنند وردھن کی شخصیت اور فن کو پرکھنے میں یہ کتابچہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔ تاہم اس سے ہم نے

کہیں کہیں کم وبیش استفادہ کیا ہے۔

حوالہ جات:

(1) مشاہیر نمبر۔ کلچرل اکادیمی، سری نگر، 1976، ص269

(2) ایضاً، ص268

(3) دھونیالوک، مترجم عنبر بہرائچی، قومی کونسل برائے اردو، نئی دہلی، 2013ء، ص1

(4) ایضاً، ص4-3

(5) یہ کلام پڑھ کر کشمیری شاعر رسول میر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے:

یم قبہ سینکی ڈیشہ ونین دُبہ پھران دل

انارِ شیرین کونہ دوپستان دپان چھی



یارانِ وطن جو چلے گئے

(اس مقالاتی سلسلے میں اُن چند کشمیری قلم کاروں اور صحافیوں پر سوانحی اور تحقیقی مضامین شامل کیے گئے ہیں جو 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں نا نہاد ''عوامی راج'' کے بعد پاکستان یا پاکستانی کشمیر کی طرف ہجرت کر گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ یہ احباب اب ہم میں موجود نہیں البتہ انھوں نے یہاں کے سرکاری استبداد سے تنگ آ کر جلاوطنی اختیار کی اور پھر وطن سے دور دنیا کو خیر باد کہہ کر چلے گئے۔ خیالؔ)

☆ غلام رسول طاؤس بانہالی

طاؤس بانہالی سے میرا غائبانہ رابطہ کم وبیش چالیس سال پر محیط رہا۔ اس کے بعد جب میں 1986ء میں پہلی بار پاکستان گیا تو وہاں میرا قیام سرزمین کشمیر کے ایک مخلص اور دوست نواز صحافی اور دانشور مرحوم خواجہ عبدالصمد وانی کی قیام گاہ واقع راولپنڈی میں رہا۔

وانی صاحب کا گھر اہل دانش اور اصحابِ بینش بالخصوص اہلِ کشمیر کی آماجگاہ تھا۔ وہیں پر طاؤس صاحب سے دوبدو میری ملاقات ہوئی اور میں نے پہلی ہی ملاقات میں انھیں ایک بیباک، لااُبال، مست قلندر اور ابدی مسکراہٹوں میں لپٹے ہوئے شاعر کے روپ میں دیکھا۔

راولپنڈی ہی میں انھوں نے مجھے ایک تصویر عنایت کی جس میں ان کے ساتھ مسعود کشفی بھی ہیں۔ اس تصویر کی پشت پر طاؤس نے یہ شعر رقم کرتے

ہوئے یہ تحفہ مجھے بخشا اور کہا کہ غالباً میرے جانے کے بعد یہ شبیہ اور یہ شعر آپ کو میری یاد دلاتے رہیں۔ یہ شعر یوں ہے:

گُلستانوں آبشاروں لالہ زاروں کا خیال
دل نے تو پل پل کیا ہجرت کے ماروں کا خیال

1947ء کے بعد نومولود پاکستان اپنے وجود کے کھنڈرات سے حیاتِ نو کی جزئیات کو چُن چُن کر اپنی نئی ساخت کو تشکیل دے رہا تھا اور وہاں معاشی طور پر خاص طور دانشوروں اور قلم کاروں کے لیے روزگار کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ یہ ملک بہت حد تک اور سالہا سال تک سیاسی نظام کو استحکام بخشنے ہی کی طرف متوجہ رہا اور اس طرح سے وہاں کی معیشت بھی دھیرے دھیرے آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

وادیٔ کشمیر سے منقسم کشمیر کی سرحد کے اُس پار ہجرت کرنے کا فیصلہ خاص طور پر اُن لوگوں نے کیا جو ریاستی حکومت کی سیاست کاری سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور سرکاری عتاب کے خدشات سے خوفزدہ ہو کر انھوں نے اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

اس وقت آزاد کشمیر جسے کشمیر پر قبائلی حملے کے نتیجے میں مہاراجہ ہری سنگھ کی سلطنت سے بزورِ بازو چھین کر ریاست سے الگ کیا گیا تھا، ایک ایسا پہاڑی علاقہ تھا جس کی آبادی کا اکثر حصہ پہاڑی اور گوجری قبیلے کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ کشمیری مہاجرین کو یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا ہوگا کہ ریاست کے اُس پار والے کشمیر میں کشمیری زبان بولنے والا شاذونادر ہی کوئی بندۂ خدا موجود تھا۔ اس نو آباد خطے میں نہ تو ترقی کی کوئی منصوبہ بندی شروع ہوئی تھی اور نہ ہی وہاں پر کشمیری مہاجروں کے لیے خاطر خواہ رہائش، روزگار اور معاشی آسودگی کی کوئی صورت موجود تھی۔

بہر حال جب یہ یارانِ وطن مظفر آباد پہنچے جو اُس علاقے کا صدر مقام تھا تو پہلے پہل انھیں بے پناہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کے لیے اُس وقت باعزت روزگار کے دروازے کھل گئے۔ جب وہاں ایک سرکاری نشریاتی ادارہ آزاد کشمیر ریڈیو کے نام سے قائم کیا گیا۔ احمد شمیم، طاؤس بانہالی، آزر عسکری، تحسین جعفری، مسعود کشفی، جی ایم مفتی، مظفر پنجابی اور کئی دوسرے کشمیری دانشور اسی ادارے کی بدولت اپنی شناخت کو برقرار رکھ سکے اگر چہ کئی اور اصحاب نے صحافت کا پیشہ اپنانا ہی مقصد حیات بنایا جن میں میر عبدالعزیز، عبد الصمد وانی اور روزنامہ آفتاب سری نگر کے مدیر ثنا اللہ بٹ مرحوم کے برادر محمد صدیق بٹ نمایاں طور پر شامل ہیں۔

طاؤس بانہالی وادیٔ کشمیر کے فلک بوس برفانی پہاڑوں میں گھرے قصبہ بانہال میں موضع کسکوٹ میں 28 نومبر 1933ء کو پیدا ہوئے ان کے والد خواجہ احمد خان اس موضع کے زمیندار تھے۔

بقول عبدالقادر سروری طاؤس کے والد بھی بڑے بدلہ سنج تھے اور قصہ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں طاؤس کے چھوٹے بھائی کو بھی شعر وسخن سے لگاؤ تھا۔ (1)

طاؤس 1947ء میں پاکستان چلے گئے۔ اس سے قبل انھوں نے 1945ء میں ایک غنائیہ ''وقت کا لٹیرا'' لکھا تھا جس پر اربابِ حل وعقد نے ان کی سرزنش بھی کی تھی۔ 1961ء میں وہ ریڈیو پاکستان میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور دو سال بعد انھوں نے پاکستان ہی میں اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کرلیا۔

اپنے یوم انتقال یعنی 20 ستمبر 2000ء تک طاؤس اپنے وطن سے دوری

کا رونا روتے رہے۔ غلام احمد نازؔ کولگامی نے علامہ اقبال کی اسرارِ خودی کا جو منظوم کشمیری ترجمہ کیا ہے اور جسے اقبال اکادمی پاکستان نے 1969ء میں شائع کیا اس کے پیش نامے میں بھی طاؤسؔ کو گھر سے دور ہونے کا کرب ستاتا ہے اور وہ مہجورؔ، رسول میر اور آزادؔ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اقبالؔ کا یہ شعر بھی گنگناتے ہیں:

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم ویکیم

اسی طرح تحسین جعفری کے کشمیری مجموعہ کلام ''پوشہ تھر'' کے پیش لفظ میں بھی اس غمِ وطن کی نوحہ خوانی یوں کرتے ہیں: ''ہجرت کا سلسلہ چالیس سال گذرنے کے باوجود آج بھی جاری ہے جس کا ثمر غالباً یہی دردِ مشترک ہے جو گوجری شاعر رانا فضل حسین۔ احمد شمیم اور ان درجنوں شاعروں کو لاحق ہے جو ہجرت کا یہ دُکھ سہہ سہہ کر جی رہے ہیں۔ بقولِ غلام نبی خیالؔ صاحب:

کأشر زبو چھم تالس لجمڑ ونہ کس پرمس کوتاہ چوم
وَتہِ وَتہِ پھیر تھ بیہِ گرہِ سمہِ ہوتمہِ گرہِ کتہِ ین کالی میتو

کشمیر سے دوری کی وجہ سے احمد شمیم دومیل کے پل پر دریا (جہلم) کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور رانا فضل حسین کو منگلا جھیل میں ویری ناگ کا حسن جلوہ بار نظر آیا۔

یہی مصیبت کے دن ہم غریب الوطنوں کے لیے سالہا سال سے اس طرح سے مقرر ہو کر گذرتے گئے کہ شاید ہم بھی کسی روز اپنے گھر کو لوٹیں:

باگہِ طاوسہ ہر دہ یاوُن آم
شراونس دردہ نے کرم آباد (2)

طاؤسؔ کی تخلیقات میں حضرت شیخ نورالدین نورانی کے تقریباً پانچ سو

اشلوکوں اور منظومات کا منظوم اردو ترجمہ اور کشمیری کی لوک کہانیوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ترجمہ شیخ ''ریشی نامہ'' کے عنوان سے لوک ورثہ قومی ادارہ اسلام آباد کی طرف سے دسمبر 1980ء میں شائع ہوا۔ طاؤس نے کلام شیخ العالم کے کس نسخے سے ترجمہ کا کام سرانجام دیا ہے اس سلسلے میں وہ خود بھی پُر یقین نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہاں یہ عالم ہے کہ ہم آج تک للہ عارفہ اور نندہ ریش کے ایسے کلیات بھی مرتب نہیں کر پائے جن کا متن صحیح ترین یا صحت کے قریب ہو۔ ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ کلامِ شیخ کے ان اجزاء کی اشاعت اور تشہیر کا کچھ سامان کیا جائے جو کم از کم عام فہم اور قابلِ اعتماد ہوں'' (3)

اس ترجمہ سے چند مثالیں یہاں تبرکاً پیش کی جاتی ہیں:

میں نے پڑھا توحید کا کلمہ   میں نے پایا رازِ حیات
موجود اس کو وجود میں پایا   ہر سو دیکھا جلوۂ ذات



یہاں بھی میرا تُو ہی تُو اور وہاں بھی میرا تُو
میں خاکی تُو میری مٹی کو کردے گلزار
میں نے سب کچھ چھوڑ کے تیرا دامن تھام لیا
میں مٹی میں خاک، مگر چاہوں تیرا دیدار



میرا جیون مری جوانی جیسے پھول انار کا ہو
میری جوانی کب چاہے گی ایندھن اس انگار کا ہو
میرے دست و بازو اپنے کیے کا پھل جب پائیں گے
کیا اس وقت کروں کیا حاصل میری چیخ و پکار کا ہو



پل بھر میں شبنم کے موتی　　پل میں پوہ کا پالا تھا
پل میں اماوس رات اندھیری　　پل میں نُور کا ہالا تھا

طاؔوس نے کشمیر کی لوک کہانیوں کو بھی اردو میں ڈھالا ہے اور یہ ترجمہ بھی لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد کی طرف سے حسنِ اہتمام کے ساتھ 1987ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ بظاہر یہ ترجمہ طاؔوس نے جے ہنٹن نولز کی مشہور کتاب فوک ٹیلز آف کشمیر سے استفادہ کر کے ہی کیا ہو گا لیکن کہانیوں کے عنوانات اور اُن کی داستانوں سے طاوس نولز سے کوسوں دور اور الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ طاؔوس نے کشمیر کی لوک کہانیوں کے کئی نسخے زیرِ نظر رکھ کر اپنا مجموعہ مرتب کیا ہے جس کی طرف وہ خود بھی ان الفاظ میں نشان دہی کرتے ہیں'' اردو میں ترجمہ کرتے وقت اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اصل کشمیری لوک کہانیوں کا لہجہ برقرار رہے۔ اور وادیٔ کشمیر کے ہر علاقے اور ہر مزاج کی کہانیوں کا ایک نمائندہ انتخاب مرتب کیا جائے۔'' (4)

طاوس کا صرف نولز کی کہانیوں ہی کا ترجمہ نہ کرنا اس حقیقت سے بھی تقویت پاتا ہے کہ جہاں طاؔوس ''ہر علاقے اور ہر مزاج'' کی بات کرتے ہیں وہاں نولز کی کہانیوں کا خطۂ بیانیہ کشمیر کے دو تین اضلاع پر ہی حاوی ہے۔ مترجم کو چاہیئے تھا کہ وہ نولز کی طرح ان وسائل اور ذرائع کا بھی حوالہ دیتے جن سے انھوں نے عوامی کہانیوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا لیکن طاوس نے ایسا نہ کر کے قاری کے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا ہے۔ البتہ جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں کہا گیا ہے اس میں شامل بیشتر کہانیاں حاتم تیلی کی کہانیوں ہی کا ترجمہ ہیں۔

طاوس کا طبع زاد نمونۂ کلام یوں ہے:

راہ و رسمِ کُہن کی بات چلی　　قیس اور کوہکن کی بات چلی
اک تبسم کناں کلی چٹکی　　پھر کسی گل بدن کی بات چلی

یاد آتے رہے وہ دیوانے　　　جب بھی دارورسن کی بات چلی
جلتی یادوں کی جگمگاہٹ ہے　　　ہائے کس انجمن کی بات چلی
کُنجِ غربت میں یو رہے طاؤس　　　دھڑکنوں کے وطن کی بات چلی

طاؤس نے حبہ خاتون کے ایک گیت کا بھی گیت ہی کے مخصوص اسلوب میں ترجمہ کیا ہے جسے یہاں دوہرا کر محفوظ کیا جاتا ہے:

کچھ سندر الہڑ کر نیں
اُتریں گھر آنگن میں
آکاش سے پریاں اُتریں
زمزم کے پانی میں
نہلا کر پھر جابیٹھیں
اُتریں گھر آنگن میں
رُوپک مایا کودھن میں
بہروپی اُلجھائیں
ان لہروں سے بھی الجھیں
اتریں گھر آنگن میں
جب آنکھ کھُلے جوبن میں
سسرال کے دن آئیں
خوابوں میں ڈوبی آنکھیں
اُتریں گھر آنگن میں

☆ فتح محمد خاں آزر عسکری

آزر تبتِ خورد یعنی بلتستان میں اسکردو کے مقام پر 1912ء میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت اسکردو میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ آزر نے بلتی اور

فارسی والدین سے سیکھی اور پھر کشمیر اور جموں میں زندگی گذارنے کے دوران پنجابی، کشمیری اور اردو زبانیں سیکھ لیں۔

1948ء میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں پہلے پہل فارسی میں شاعری کی لیکن بعد میں مزاحیہ انداز میں سخن گوئی کا شغف اختیار کیا'' اردو شاعری کا آغاز 1932ء میں ہی کیا تھا۔ کچھ منظومات کی اصلاح استاد محترم حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے فرمائی ہے اور باقی تمام عرصہ حضرت ڈاکٹر بشیر محمد میاں قیس شیروانی مرحوم کے اخلاق کریمانہ اور روابط برادرانہ سے مستفید ہوتا رہا۔'' آگے کہتے ہیں'' میرا خمیر جنتِ کشمیر کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ (1976ء میں) پینسٹھ سال گذر چکے ہیں 1948ء میں جنت سے نکالا گیا۔ آج کل مظفر آباد آزاد کشمیر میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ کہاں جاؤں گا:

تاحدِ نظر جادۂ ویرانِ عدم ہے
اس راہ میں لاہور نہ پنڈی نہ پشاور (5)

''کشتِ زعفران'' آزر کا اردو مجموعۂ کلام ہے جو 1976ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں شاعر کا سارا مزاحیہ کلام یک جا ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔

آزر عسکری نے ہمارے خیال میں اپنے لیے مزاحیہ شاعری کو اپنا موضوع سخن بنانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان کی اس شاعری میں انھوں نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں سماج، سیاست اور زندگی کے دیگر شعبوں کی کمزور نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک قابلِ توجہ اردو شاعری کا سرمایہ پیش کیا ہے جو انھیں دیگر ممتاز پاکستانی مزاح گو شاعروں سید ضمیر جعفری اور انور مسعود کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ آزر نے حاجی لق لق کی مشہور نظم ''بہشت بریں'' کی جو تضمین کی ہے وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کا صرف ایک بند پیش ہے:

وہاں پر نہ ہوگی نہ پستی بلندی
نہ کام آئے گی اپنی کچھ ہوش مندی
نہ جرأت کسی کو کرے بات گندی
نہ بندی نہ بندہ نہ منصوبہ بندی
عصا ہاتھ میں لے کے ٹہلا کریں گے
بہشت بریں لے کے ہم کیا کریں گے

آزر عسکری نے صحافت کے میدان میں بھی اپنا حصہ ادا کیا۔ وہ کئی سال تک ہفت روزہ کشمیر چلاتے رہے۔ ان کی غنی کشمیری پر تحقیق مبینہ طور پر ایک منفرد انداز کی محققانہ کوشش ہے اگرچہ اس کے بارے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔

آزر، مارچ 1983ء کو مظفر آباد میں انتقال کر گئے اور وہ وہی پر مدفون ہیں۔

صابر آفاقی نے آزر کی مزاحیہ شاعری پر مختصر الفاظ میں یوں اپنی رائے ظاہر کی ہے:

''آزر نے انسان اور انسان کے کاموں کو ہمیشہ غیر سنجیدہ نظر سے دیکھا ہے بلکہ تمسخر اڑایا ہے اور اسی میں اس کے فن کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو طنزیہ شاعری میں آزر کا مرتبہ وہی ہے جو فارسی میں عبید زاکانی اور اردو میں اکبر الہ آبادی کا ہے''۔(6)

بقول حبیب کیفوی ''آزر جس شعری مجلس میں کلام سناتے ہیں اُس میں قہقہوں کے فوّارے پھوٹ پڑتے ہیں لیکن جب اہل فکر ان کے کلام پر غور کرتے ہیں تو انھیں مزاح اور طنز کے پردے میں معاشرے کے روگ اور رستے ہوئے ناسور دکھائی دیتے ہیں۔''(7)

حفیظ جالندھری اور قیس شیروانی کے علاوہ آزر نے جن اساتذۂ اردو کے

سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں کہ ''اس سلسلے میں مزید جن بزرگوں سے رابطہ رہا ہے ان میں نواب جعفر علی خان آثر لکھنوی۔ تاثیر مرحوم اور سید وحید الدین بیخود دہلوی سرِ فہرست ہیں۔ (8)

آزر عسکری کا ذریعۂ روزگار گھڑی سازی کا کام تھا۔ معاشی طور پر وہ کبھی آسودہ حال نہیں رہے اور عمر کے آخری ایام میں کمزور بینائی کی وجہ سے نوشت وخواند کا سلسلہ تقریباً منقطع ہوگیا۔ غریب الوطن ہوکر وہ پاکستان میں سیالکوٹ۔ لائیل پور اور لاہور میں مقیم رہے۔ بالاخر انھیں مظفر آباد ہی کی مٹّی نصیب ہوئی۔

آزر کی نظم ''نذرِ فیض'' کے یہ چند اشعار دیکھیں:

سرِ رہ گذر وہ دکھا کے یُوں رُخ پرُ بہار چلے گئے
ذرا جھانکا کھڑکی سے کار کی اور بھگا کے کار چلے گئے
ترے عشقِ ٹیڈی مزاج نے کبھی جا پہ ٹکنے نہیں دیا
کبھیِ زنجبار چلے گئے کبھی ہر دوار چلے گئے
شب وعدہ وہ جو نہ آسکے رہی یہ فتیگ ہی رات بھر
کبھی کوئے یار میں جاگھسے کبھی سوئے بار چلے گئے

اس مختصر سے جائزہ کے اختتام سے پہلے آزر کے چند منتخب اشعار ناظرین کی تفننِ طبع کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

صرف افسر ہی کاڈر اس میں نہیں ہے کافی
ساتھ بیوی کا بھی ڈر ہو تو غزل ہوتی ہے
دردِ دل دردِ جگر مال ہیں کنڈم دونوں
دردِ سر دردِ کمر ہو تو غزل ہوتی ہے



ازل سے ہی اُلٹ تاثیر ہے ہے کشتِ محبت کی
کہ گندم اس میں گر بوئیں تو ہوتے ہیں مٹر پیدا

سوہنی کے گھڑے کا افسانہ تاریخ نے یوں دہرایا ہے
ساحل پہ کھڑے ہم دیکھا کئے اور یار کا بیڑا غرق ہوا
قسمت ہی کچھ ایسی لائے ہیں اب اس کا مداوا کون کرے
اخبار نے فوٹو چھاپی تو اخبار کا بیڑا غرق ہوا
اتوار کا وعدہ اُن کا تھا جانا تھا کلفٹن دونوں کو
ڈیڈی کی اچانک آمد سے اتوار کا بیڑا غرق ہوا



اگر طے ہو گیا ہوتا میرے کشمیر کا قصہ
یہ لیڈر لیڈری کو اپنی چمکانے کہاں جاتے

نظم ''میرا تیرا شہر چھوڑ کر'' سے یہ اشعار:

اس سے پہلے کہ وہ عدُو کم بخت
تیرے گھر جا کے چغلیاں کھائے
اس سے پہلے کہ دیں رپٹ جا کر
تیرے میرے شریف ہمسائے
اس سے پہلے کہ تیری فرمائش
مجھ سے چوری کا جرم کروائے
اس سے پہلے کہ اپنا تھانے دار
مُرغ تھانے کا مجھ کو بنوائے
میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا

''فال نامۂ جدید'' سے یہ برجستہ اور برمحل اشعار:

بشارت ہو تجھے اے صاحبِ فال
مبارک ہر طرح تجھ کو ہے یہ سال

تری قسمت میں حج کا بھی سفر ہے
مگر اس میں ذرا سا یہ فرر ہے
کہ سونا جب وہاں سے لائے گا تُو
یہاں آتے ہی پکڑا جائے گا تُو



بخار و دردِ سر، اسہال ، نزلہ ، کھانسی و پیچش
مرض تو موسمی سب آگئے کیا تم نہ آؤ گے
سحر سے دوپہر تک پان والے کی دُکاں سے ہم
کوئی پچاس پتّے کھا گئے کیا تم نہ آؤ گے



خلاف توقع وہ آئیں بظاہر عنایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
مگر اس عنایت کے پردے میں اپنی حجامت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
وہ ایٹم شکن اُن کی دو مست آنکھیں وہ دو جوہری بم وہ قامت کہ راکٹ
اب ایسے خطرناک پر جان دینا شہادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے



اور اخیر پر اُن کی معرکۃ الآراء نظم ''سرّ دِگراں'' سے یہ اشعار نقل کر کے تذکرۂ آزر کو اختتام پر لاتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں مجھے خوش فکر ہوں دلشاد ہوں
ہر طرح کے رنج و غم آلام سے آزاد ہوں
یہ نہیں معلوم سر سے پاؤں تک فریاد ہوں
بیوی میکے جا بسی ہے میں مظفر آباد ہوں
ساس کے پنجے میں اک جکڑا ہوا داماد ہوں

☆ سرفراز حسین خاں تحسینؔ جعفری

تحسینؔ جعفری کی ولادت پونچھ میں 1908ء میں ہوئی۔1949ء میں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد پہلے وہاں امور کشمیر کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ رہے اور پھر ہفت روزہ ''کشمیر'' کے مدیر مقرر کیے گئے۔

تحسین کا تعلق مسلکی لحاظ سے شیعہ فرقے کے ساتھ تھا لہٰذا اُن کے یہاں کلام کا بیشتر حصہ اہل بیت کی نوحہ خوانی اور شہدائے کربلا کی مرثیہ خوانی پر ہی مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نعت، منقبت، حمد اور وطن پرستی کے نغمات بھی لکھے ہیں۔ جعفری کے اردو مجموعۂ ہائے شعر میں سرمایۂ نجات دل، لخت لخت اور سفینہ نجات شامل ہیں۔

جعفریؔ کی اردو یا کشمیری شعر گوئی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اسے عام قسم کی شاعری ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جعفری پر اگرچہ علامہ اقبال کا گہرا اثر تھا لیکن اقبال کی فنی نزاکتوں کی دہلیز پر جعفری بس کھڑے ہو کر رہ گئے اور اقبال کے گنجینۂ سخن سے اپنا خالی دامن بھرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم جعفری صاحب کے بارے میں منشور بانہالی کے اس اظہارِ خیال کو بھی مکمل طور پر خارج از فکر نہیں کیا جا سکتا جب وہ کہتے ہیں ''تحسین جعفری ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں جو زبان و بیان پر پوری دسترس اور مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے دور کے کچھ سر کردہ ہم عصر شعراء کی طرح اپنا ادبی سفر اردو شعر گوئی سے شروع کیا ہے۔ شعر گوئی کی یہ تحریک بنیادی طور پر آپ کو کچھ رثائی منظومات خاص کر میر انیسؔ اور مرزا دبیر کے مراثی سننے اور مطالعہ کے ساتھ شروع ہوئی تھی جس نے آگے چل کر آپ کی فکری اور فنی صلاحیتوں کو بہت ہی مستحکم اور معتبر بنا دیا ہے۔''(9)

تحسینؔ مشہور اردو افسانہ نگار کرشن چندر کے ہم جماعت تھے۔ انھیں

ایک اور پونچھی ادیب اور صحافی چراغ حسن حسرتؔ کی صحبت بھی حاصل رہی۔ تحسین کے شاگردوں میں سردار محمد عبدالقیوم خان۔ سردار سکندر حیات خان۔ جسٹس محمد اقبال فانی وغیرہ شامل ہیں۔ جعفری صاحب جب 1996ء میں انتقال کر گئے تو ممتاز مزاح نگار اور شاعر سید ضمیر جعفری نے کراچی کے روز نامہ جنگ میں جعفری صاحب کے بارے میں لکھا کہ ''پونچھ نے تین نامور ادبی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ کرشن چندر، چراغ حسن حسرت اور تحسین جعفری''

تحسینؔ جعفری کا کشمیری مجموعہ کلام ''پوشہ تھر'' نام کے دیوان کی شکل میں شائع ہوا ہے جسے انھوں نے اپنے ان الفاظ میں واضح کیا ہے ''کہ اس کی اشاعت کا مدُعا یہ تھا کہ میری اولادیں نسلاً بعد نسلاً یہ حقیقت ذہن نشین کریں کہ وہ سارے کشمیری الاصل ہیں خواہ ان کا قیام کہیں پر بھی ہو اور انھیں اپنے وطن کشمیر کو کسی صورت میں بھولنا نہیں''۔

نمونۂ کلام یوں ہے:

آغازِ بہاراں میں اپنا کچھ اور ہی عنواں ہوتا ہے
ہر زخمِ جگر لو دیتا ہے ہر داغ فروزاں ہوتا ہے
آنکھوں کے سُونے جھروکوں میں اشکوں کی شمعیں جلتی رہیں
ہر شب میرے کلبۂ احزاں میں اک جشنِ بہاراں ہوتا ہے
آسودۂ ساحل کیا جانے موجوں کی تلاطم خیزی کو
ہم موجۂ ساحل ہیں ہم سے اندازۂ طوفاں ہوتا ہے
آئینِ محبت میں واعظ احساسِ زیان وسُود نہیں
جاتے ہیں اس کوچے میں جہاں رُسوائی کا ساماں ہوتا ہے
کس رشکِ گل تر کی خوشبو انفاس میں میرے شامل ہے
ہر سانس کی آمد و شد پر جو احساسِ بہاراں ہوتا ہے

آنکھوں کے دیئے بجھنے سے لگے ہونٹوں کے کنول مُرجھا سے گئے

اب آئینہ دیکھ کے سوچتے ہیں کیوں حسن گریزاں ہوتا ہے

یہ دورِ بہار و خزاں تحسین کیا جانئے کب تک ختم نہ ہو

دل خون کے آنسو روتا ہے اک غنچہ جو خنداں ہوتا ہے

☆ احمد شمیم

برصغیر کی تقسیم کے بعد جو ادبی، ثقافتی اور صحافتی شخصیات کشمیر سے پاکستان یا پاکستانی کشمیر چلی گئیں اُن میں احمد شمیم سب سے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا اصلی نام غلام احمد زرگر تھا۔ کالج میں اُنھوں نے الہام شمیم کا قلمی نام اختیار کیا تھا۔

احمد شمیم 3 مارچ 1930ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے حزب اختلاف کی سیاست سے وابستہ تھے، جس کی بنا پر اُنھیں 1948ء میں اُس وقت کی ریاستی حکومت نے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہ پہلے آزاد کشمیر کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہوئے اور پھر وہاں کے ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔

سرینگر میں وہ کچھ عرصے تک پریم ناتھ بزاز کی سوشلسٹ تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ شمیم نے اگرچہ شاعری کا آغاز اُردو ہی میں کیا اور اُن کا کلام پاکستان کے کئی رسایل و جراید میں شائع ہوتا رہا، تاہم وہ جلد ہی اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف مائل ہوئے اور پھر ان کی شاعری میں ایک نکھار آ گیا۔

شمیم کا مثالی شاعر عبدالاحد آزاد تھا، جس سے وہ اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مہجور پر آزاد ہی کو ترجیح دی۔ البتہ ان کے کلام میں اکثر مہجور اور آزاد ہی کی بحر، اوزان اور ردیف و قوافی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے بہترین دوستوں میں غلام رسول طاؤس بانہالی سر فہرست تھے۔

چونکہ احمد شمیم نے اپنی زندگی کے بیشتر ماہ وسال وطن سے دور گزارے، لہازا اُن کی سوانح مکمل شکل میں دستیاب نہیں۔ اُنھوں نے 1982ء میں انتقال کیا۔ اُن کی مشہور اُردو نظم ''دجلۂ خون'' سے یہ چند اشعار پیش ہیں:

ستم و جور وہی
رگِ جان بھی ہے وہی اور نشتر بھی وہی
دستِ اغیار میں خنجر بھی وہی
کیسا جذبہ ہے کہ جو خانۂ زنجیر کا پابند نہیں
پھر اُمڈ آئی ہے بازاروں میں
موت پر خندہ کناں
اک تمنائے جواں
لب پہ آجائے تو اک نعرۂ مستانہ ہے
ہاتھ میں آئے تو اِک خشتِ جنوں بنتی ہے
دل میں آجائے تو اک ولولۂ نو کی طرح
درودیوار ہلا دیتی ہے
سوئی قسمت کو جگا دیتی ہے
کوئی دیکھے تو میرے شہر کے بازاروں میں
دجلۂ خوں تو رواں آج بھی ہے
رسمِ شبیر جواں آج بھی ہے

ریاستی کلچرل اکیڈیمی اس لحاظ سے درخورِ تحسین ہے کہ اس نے شمیم کے دستیاب مختصر کشمیری کلام کی شیرازہ بندی کر کے اسے 1989ء میں ''دگ تہ داغ'' (درد اور داغ) کے نام سے شائع کر کے محفوظ کیا۔

شمیم کے چند کشمیری اشعار کو اردو میں یوں منتقل کیا گیا ہے:

جس ستم گار نے دل کو میرے برباد کیا
دل نے ہر لمحہ اُسے شوق سے پھر یاد کیا
غمِ جاناں غمِ دوراں کو بسایا دل میں
اور اسی درد سے اس گھر کو بھی آباد کیا
دہر کی خاطر سبب ہے فخر کا میرا وجود
ہاں یہی غم ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا

☆ ☆ ☆

کتنا پیارا ہے خزانوں میں بہاروں کا خیال
دشمنوں کے نرغے میں گویا کہ یاروں کا خیال
دیس سے پردیس آکر روز وشب کی یہ کسک
صبح ہو یا شام ہو آئے چناروں کا خیال
دیکھئے کس نوع کا شاعر ہے یہ احمد شمیم
آتش نمرود ہے اور گلعذاروں کا خیال

☆ میر عبدالعزیز

میر عبدالعزیز وطنِ مالوف کشمیر کے ایک پختہ مشق اور مشہور صحافی تھے۔ وہ جنوری 1924 کو سرینگر کے رام باغ علاقے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلے اپنے ہی محلے کے مدرسے میں اور اس کے بعد سری پرتاپ ہائی سکول اور اخیر پر ایس پی کالج میں تعلیم حاصل کی۔

صحافت کی دنیا میں انھوں نے ہفت روزہ ''ملت'' اور پریم ناتھ بزاز کے روزنامہ ''ہمدرد'' کی ادارت سے آغاز کیا۔ 1947ء میں وہ جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے کنوینر بنائے گئے۔ 1948ء میں کشمیر سرکار نے انھیں زندہ گرفتار کیے جانے پر انعام مقرر کیا، کیونکہ وہ اپنے اداریوں میں حکومتِ وقت

کے خلاف انتہائی زہر افشاں تنقید اور تضحیک کا اسلوب اختیار کرتے تھے۔ اسی دوران وہ روپوشی کی حالت میں سرحد پار چلے گئے۔ پاکستان میں انھیں نئی نئی مشکلات اور مصائب نے آن گھیرا۔ حتیٰ کہ جب 1958ء میں پاکستان میں جنرل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کیا تو میر عبدالعزیز کو بھی 26 جون 1959ء کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس موقعے پر پنڈت پریم ناتھ بزاز نے پاکستان سرکار کی نکتہ چینی کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ ''وہ تنگ نظر افسر جس نے حکومتِ پاکستان کو اس اقدام کا مشورہ دیا، اس نے پاکستان کے کشمیر کیس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور یہ افسوس ہے کہ وزراتِ داخلہ میں بھی کسی نے اس امر کی نشاندہی نہیں کی''۔ اس حوالے سے میر عزیز نے یہ اشعار قلم بند کیے:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

میر عبدالعزیز آخر دم تک اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اُنھوں نے اگرچہ کئی سیاسی تنظیموں میں وقتاً فوقتاً شمولیت بھی کی لیکن بعد میں انھوں نے سیاست کو خیرباد کہہ کر باقی ماندہ زندگی اپنے دو اخباروں ہفتہ وار ''انصاف'' اور ''ٹائمز آف کشمیر'' کے لیے ہی وقف کرلی۔ یہ دونوں جریدے راولپنڈی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ پاکستانی کشمیر کے اولین صدر سردار محمد ابراہیم نے میر کے اس انتھک عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ جب دو انگلیوں سے ٹائپ کرتا تھا تو اُس کو کھانے پینے سمیت کسی بھی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا''

1997ء میں انھیں صدرِ پاکستان کی طرف سے صحافتی خدمات کے عوض ''پرائڈ آف پرفارمنس'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ آپ صرف ایک بار

1982ء میں اپنے وطن کشمیر آئے اور میرے ساتھ اُن کی ایک طویل ملاقات میری رہائش گاہ پر ہوئی، جہاں ہم رات گئے تک ہندوستان اور پاکستان کے حالات بالخصوص سیاسیات پر تبادلہ ٔخیالات کرتے رہے۔ اُس وقت مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ میر صاحب برصغیر کے کوائف سے نہایت دل برداشتہ تھے اور ان کے بقول اس پریشان کن سیاست گری سے سب سے زیادہ زیاں اہل کشمیر کو ہوا تھا۔

میر عبدالعزیز 6 فروری 2000 کو راولپنڈی کے ایک ہسپتال میں 76 سا کی عمر میں وفات پاگئے۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادے میر وقار عزیز نے یہ مصرعہ پڑھا:

چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

☆ مسعود کشفی

مسعود کشفی، علامہ میر غلام احمد کشفی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کا اصل نام میر مسعود احمد سلطان تھا۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب محمد حنیف نے مسعود کی وفات پر ناصر کاظمی کا یہ شعر ایک تعزیتی محفل میں پڑھا تھا:

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اُس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

اور اپنے ایک تہنیتی مضمون میں لکھا تھا۔ ''موت کے پنجہ سے کوئی ذی نفس نہیں جو بچ سکا ہو۔ اس تلخ حقیقت نے انھیں بھی نہیں بخشا جنھوں نے اپنی ساری عمر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گزاری ہو''

مسعود کشفی شمالی کشمیر کے بانڈی پورہ قصبے میں داچھی گام کی نہایت خوبصورت وادی میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر غلام احمد کشفی کشمیر کے مشہور روزنامہ ''خدمت'' کے مدیر اعلیٰ تھے اور وہ شیخ محمد عبداللہ اور

مولانا محمد سعید مسعودی کے قرابت داروں میں شامل تھے۔

مسعود صاحب جب پاکستان چلے گئے تو وہاں تراڑ کھل ریڈیو میں ان کی تقرری ہوئی اور پھر ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے انھوں نے اس نشریاتی ادارے کی قیادت سنبھالی۔ چونکہ مظفر آباد میں ثقافت اور ادبیات کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا، مسعود نے ریڈیو کے ذریعہ ہی فنون لطیفہ کے لحاظ سے اس غیر آباد اور بنجر علاقے کو ادبی سرگرمیوں کا ایک مرکز بنایا۔

بقول حنیف ''مسعود اپنی ذات میں سیماب صفت تھے، کشمیر ان کی پہچان اور کشمیری ہی ان کی زبان تھی، لیکن بدقسمتی سے ان کا کشمیری کلام ہم تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ مسعود کے جانے سے روزنامہ ''گردش'' کے قارئین مسعود سے محروم ہوگئے اور قارئین ''سیاست'' بھی ان کے دلچسپ مضامین اور شذرات کو ترستے رہے۔

وفات سے چندروز قبل معاصر جریدے ''آتش چنار'' میں کشمیری ادب اور ثقافت پر اُن کا ایک شاندار مقالہ شائع ہوا جس نے پاکستان کے اُردو دان حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ مسعود کے دوست محمد حنیف نے بالآخر ان کی یاد میں کہا، ''مسعود کشفی اپنی ذات میں گلدستہ تھے جس کے پھولوں اور جس کی یادوں کی مہک سے فضائیں معطر رہیں گی''۔

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں اردو۔ جلد 3۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سری نگر۔ 1984ء

(2) جموں صوبس منز کاشرہ زبان و ادبک تواریخ۔ منشور بانہالی ۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 2001ء۔ ص188

(3) ریشی نامہ۔لوک ورثہ قومی ادارہ اسلام آباد۔1980ء ص19

(4) کشمیری لوک کہانیاں۔1987ء،ص8

(5) پیش لفظ کشتِ زعفران۔نیشنل بک فاؤنڈیشن بینک روڈ،مظفرآباد۔جولائی1976ء۔ص9

(6) عکسِ کشمیر۔گلشن بُکس سری نگر، 2011ء ،ص128

(7) کشمیر میں اردو۔مرکزی اردو بورڈ لاہور۔1979ء ،ص203

(8) ایضاً۔ص204

(9) تحسین جعفری۔منشور بانہالی۔کلچرل اکادمی سری نگر۔2009، ص100



اردو کی خدمات میں محکمہ اطلاعات کا حصہ

ریاست جموں و کشمیر میں سرکاری سطح پر جن اداروں نے اردو زبان و ادب کی خدمات سالہا سال سے سرانجام دی ہیں اور مسلسل طور پر دے رہے ہیں اُن میں محکمہ اطلاعات کسی سے پیچھے نہیں۔

جموں کشمیر میں محکمہ اطلاعات آج سے پچاسی سال قبل مہاراجہ ہری سنگھ کے دور حکمرانی میں قائم ہوا۔ پہلے پہل یہ اطلاعات اور سیاحت کی تشہیر کے لیے وقف کیا گیا، بعد میں ڈوگرہ راج کے اختتام سے بعد پہلے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے مقامی طور پر ریڈیو بھی قائم کیا جو 1948ء میں وازرت اطلاعات و نشریات کے تابع کام کرتا رہا۔ اس ادارے کے لیے جانکی ناتھ زتشی کو ڈایریکٹر جنرل کا عہدہ سونپا گیا، مرزا غلام حسن بیگ کو سربراہ مقرر کیا گیا، حکیم محی الدین پروگراموں کے ڈایریکٹر بنائے گئے اور مشہور اردو افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کو جموں ریڈیو کی سربراہی سونپی گئی۔ البتہ اس نشریاتی ادارے کا گہرا تال میل محکمہ اطلاعات کے ساتھ عملی طور پر برابر قائم رہا۔

محکمے کی طرف سے ریاست کی سرکاری زبان اردو ہونے کے حوالے سے حکومت کے سارے پریس نوٹ اور دیگر تشہیری مواد اردو ہی میں شائع ہوتا رہا اور کبھی کبھی ان کا انگریزی ترجمہ قومی پریس کی خاطر کیا جاتا تھا جو عام طور پر زتشی خود ہی کیا کرتے تھے۔

دریں اثنا محکمہ اطلاعات نے اپنی ہی حدود اختیار میں لالہ رخ پبلی کیشنز

کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا جس کے اہتمام سے کشمیری زبان میں لوک کہانیاں وغیرہ جیسی تخلیقات منظر عام پر آئیں۔اس سلسلے میں میر غلام رسول نازکی کی تالیف ''روح غنی'' ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

محکمہ کی جانب سے ''مکتوب'' نام کا ایک خبر نامہ بھی شائع ہوتا رہا لیکن اس کی غیر مقبولیت کے سبب کچھ عرصہ بعد اس کی اشاعت معطل کی گئی۔

ریاست جموں کشمیر کے اطلاعاتی محکمے کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ابتدا سے لے کر سالہا سال تک اردو کے حوالے سے کوئی قابل فخر کارنامہ سرانجام دیا ہو۔اس کی کارکردگی دوسرے ایسے ہی سرکاری اداروں کی طرح زیادہ تر حکومت وقت کی سرگرمیوں اور پالسیوں کو عوام تک پہنچانے اور اس کے نتیجے میں اپنا فرض منصبی انجام دینے تک ہی محدود رہی ہے۔

البتہ گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں محکمے نے ''تعمیر'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا جسے محکمے کی طرف سے اردو کی خدمت کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

خوش قسمتی سے تعمیر کی ادارت ایک تیز وطرار صاحب قلم دانشور شمیم احمد شمیم کے ہاتھوں میں دی گئی۔ شمیم کے بعد محمد یوسف ٹینگ نے اس کا مدیر بن کر اسے اس حد تک ایک معتبر اور معیاری جریدہ بنایا کہ ہندوستان کے اطراف و اکناف سے برگزیدہ اردو قلم کار اس میں چھپنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

کمال احمد صدیقی، راہی معصوم رضا، پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ، خلیل الرحمان اعظمی، فراق گورکھپوری، پروفیسر جیا لال کول، پرتھوی ناتھ پشپ، پروفیسر شکیل الرحمان، فضا ابن فیضی، خلیق انجم، حیات اللہ انصاری، سراج لکھنوی، مرزا کمال الدین شیدا، تنہا انصاری، شمیم کرہانی، منور لکھنوی، فکر تونسوی، اختر الایمان، ناطق گلاوٹھووی، قیصر قلندر، شمس کنول، مخمور سعیدی، شہاب جفری،

غلام ربانی تاباں، نریش کمار شاد، وحید اختر، علی جواد زیدی، بلراج کومل، شاذ تمکنت، ہنس راج رہبر، رسا جاودانی، سعید صباح الدین عبد الرحمان، فرقت کاکوروی، کوثر چاند پوری، عزیز لکھنوی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ساغر نظامی، سری نواس لاہوتی، جگن ناتھ آزاد اور سارے ہندوستان کے ادیب، شاعر، نقاد، محقق اور ڈراما نگار اس رسالے کو اپنی تحریریں اشاعت کے لئے بصد شوق بھیجتے تھے۔ تعمیر کی خصوصی اشاعتوں میں عبد الاحد آزاد نمبر اور مہجور نمبر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ تعمیر کی اردو اشاعت کے ساتھ اس کے مدیران نے اس کا ایک جامع حصہ کشمیری کے لیے بھی وقف کیا جس میں کشمیری زبان کے سرکردہ قلم کاروں کی معیاری تخلیقات ہر شمارے میں شائع ہوتی رہیں۔

تعمیر کی خصوصی مندرجات میں جو دلچسپ تخلیقات شامل ہیں ان کا ذکر یہاں بے محل نہیں ہوگا تا کہ اردو ادبیات کے تحقیق کاروں کی رہنمائی کے لیے ان سے استفادہ کیا جاسکے۔ رسالے کے مختلف شماروں سے ایسے مضامین محقق کے لیے بنیادی مواد فراہم کرنے میں ممد ثابت ہوسکتے ہیں۔ اردو کے طلباء سے مندرجہ ذیل مضامین اور مندرجات کے مطالعے کی سفارش کی جاتی ہے:

نریش کمار شاد کا حافظ شیرازی کی منظومات کا اردو ترجمہ، مزاحیہ شاعر قاضی غلام محمد پر محی الدین قادری زور کا مضمون، جلالی شاہجہان پوری کا تحریر کردہ مقالہ ''قدیم سنسکرت ادب کا ایک شاہکار پنچ تنتر''، علامہ اقبال سے چند ملاقاتیں از گھنشام سیٹھی، عزیز کشمیری کا صحائف اور ادب العالیہ کے کشمیری تراجم، نور محمد بٹ کا کام دیو، یونان سے کشمیر تک، صاحبزادہ حسن شاہ کا ملّا حمید اللہ شاہ آبادی، کشمیری شاعری میں مزاح از میر غلام رسول نازکی، مہابھارت اور ہندوستانی کلچر از پروفیسر شکیل الرحمان، رسول میر پر ایک نظر از قاضی غلام محمد، کشمیر کی لوک کہانیاں از علی محمد لون، حبہ خاتون کی شاعری کا سماجی

پس منظر از امین کامل وغیرہ۔

قاضی غلام محمد کے یہ مزاحیہ اشعار قابل توجہ ہیں:

اپنی محرومئی قسمت پہ ہنسی آتی ہے
دودھ بازار میں خالص بھی بکا میرے بعد
میرے ماتم میں نہیں، اپنی رقم کے غم میں
شہر کا بنیا سیہ پوش ہوا میرے بعد
ویٹ لفٹر کوئی مجھ سا نہ ہوا جو پیدا
کون اٹھائے گا تیرے ناز بتا میرے بعد

اسی طرح نریش کمار شاد کا ترجمۂ حافظ کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

''کوئی اپنا نہیں ہے دنیا میں مجھ کو سمجھا دیا ہے اپنوں نے
کیا شکایت کروں میں غیروں کی جو کیا ہے کیا ہے اپنوں نے''

تعمیر کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس میں اختر الایمان کی متنازعہ نظم ''میرا نام'' شائع ہوئی۔ یہ نظم جب شاعر نے ایک ایسے مشاعرے میں پڑھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی موجود تھے تو انھوں نے اعتراض کیا کہ شاعر کس طرح اپنے آپ کو اختر الایمان یعنی ایمان کا تارا کہتا ہے۔ اختر نے کچھ عرصہ بعد اس اعتراض کے جواب میں یہی نظم لکھی جس کے یہ چند اشعار غور طلب ہیں:

اے نگینِ خاتم زمانہ کے اے خداوند عصر والا اعتبار
لیجئے خم کردیا سر تسلیم آپ سے اور میں کروں تکرار
میرے اس نام پہ تو چونکے حضور پر توجہ نہ دی کبھی زنہار
ہیں بہت ایسے لوگ بھی جن کے نام تو ٹھیک ہیں مگر اطوار

بیچتا ہے مدک، چرس، کوکین روز ملتا ہے راہ میں غفار
ایک بدرالدجیٰ ہے برسوں سے ایسے ہوتے ہیں شب کو جلوہ بار
شاہد و مےَ کی ان سے فرمائش لیجئے چٹکی بجی کہ سب تیار
کیسا موزوں ہوا ہے ان پہ نام بخشئے ان کو خلعت و دستار
اے خداوندِ صرف و نحو ابھی یہ زمیں ہے مقام کژدم و مار
توسنِ زیست ہے خرِ پا لنگ آنکھیں مونڈے ہیں آپ جس پہ سوار

ستمبر اکتوبر 1959ء کے شمارے میں فراق گورکھپوری کی یہ خوبصورت غزل شائع ہوئی جس کے چند اشعار یوں ہیں:

اُس وقت تو سُنی کو کیا تم نے اَن سنی
آئیں گی یاد تم کو یہ باتیں ہماریاں
گذرے ہیں سامنے سے ملائک بصد ادب
میں نے تیرے لیے ہیں وہ راتیں گذاریاں
اک نیم بوسہ نیم اجازت سے ہائے ہائے
اے لعل لب یہ تیری کفایت شعاریاں
خلوت تمام عالمِ اسرار ہوگئی
جب اس نے تنگ و چست قبائیں اتاریاں

جیسا کہ کہا جاچکا ہے شمیم نے تعمیر کی ادارت کے دوران اس میں ''بچوں کا تعمیر'' اور کشمیری حصے کا بھی اضافہ کیا جس میں کشمیری زبان کے قلم کاروں نے اپنی اپنی تخلیقات سے مسلسل طور پر اس کے صفحات کو سنوارا۔ اس سلسلے میں اُس دلچسپ مباحثے کا ذکر ناگزیر ہے جو اس کے صفحات پر اختر محی الدین کا مشہور اور طویل افسانہ ''آدم چھُ عجب ذات'' شائع ہونے کے بعد چھڑ گیا۔ اس افسانے پر رحمان راہی نے تابڑ توڑ حملے کیے اور اسے ایک ناکام ادبی تخلیق قرار دیا۔ اس پر

اختر نے بھی اپنے تیکھے جواب سے ردعمل ظاہر کیا اور پھر شمیم بھی اس میں ایک فریق بن گیا۔ بالآخر جب اختر سے راہی اور شمیم کی تنقید کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ افسانہ راہی اور شمیم دونوں کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکا ہے۔ خالد بشیر بٹ نے اپنے وقت میں اس جریدے کا ''اردو ادب نمبر'' اور ''پریم چند نمبر'' بھی شائع کیا جن کی مناسب تشہیر نہیں ہو سکی۔

جن اصحاب ذوق نے وقتاً فوقتاً محکمہ اطلاعات کی سربراہی کی ان میں بلدیو پرشاد شرما، غلام رسول ریزو، ست پال ساہنی، محمد امین پنڈت، محمد سعید ملک، محمد یوسف ٹینگ، شمیم احمد شمیم اور ظفر احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک ناعاقبت اندیش ڈائریکٹر نے ادارے کے تینوں جریدوں تعمیر (اردو)، کشمیر ٹوڈے (انگریزی) اور آلوَ (کشمیری) کی اشاعت بغیر کسی جواز کے منقطع کی۔ حالانکہ ان جرائد کے اجراء کا فیصلہ ایک سرکاری حکم نامے کے تحت کیا گیا تھا اور یہ بدذوق ڈائریکٹر انہیں بہ یک جنبش قلم رد نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنی دریدہ ذہنی سے کام لے کر یہ سلسلہ منقطع کر کے رکھ دیا۔

محکمۂ اطلاعات کے بارے میں یہ ضرور کہا جانا چاہئے کہ سرکار نے اسے اردو زبان و ادب کی تشہیر یا تبلیغ کے لیے قائم نہیں کیا۔ اس زبان کے ساتھ اس کا براہ راست رشتہ صرف سرکاری پریس نوٹوں کے اجراء کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ محکمے کے ایک اہل کار کے مطابق اردو میں تشہیری مواد تقسیم کرنا روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ انگریزی نے لی ہے۔ اب صرف وہی اخبارات اردو کا مطالبہ کرتے ہیں جن کے یہاں انگریزی دان عملہ نہیں ہے اور جہاں اردو میں ترجمے کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔

محکمے میں نایاب رسائل اور جرائد اور دستاویزی مواد تو ستمبر 2014ء کے سیلاب کی نذر تو ہو گیا لیکن اب یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہمارے یہاں جو

معیاری اور قابل مطالعہ اخبارات اور رسالے شائع ہو رہے ہیں اور جن کی تعداد بہت کم ہے، محکمہ ان کی مناسب حفاظت کا مکمل انتظام کرے تاکہ آئندہ دنوں میں تحقیق کار اور اردو زبان و ادب کے طالب علم اس خزینے سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ اس کے لیے ادارے کو ایک ایسا عملی اقدام کرنا ہوگا کہ جس جگہ یہ کارآمد تحریریں رکھی جائیں اُس پر قدرتی آفات کا کسی بھی صورت میں کوئی منفی اثر نہ ہو سکے۔

(2015ء میں تحریر شد)



بھگوت گیتا کے اُردو تراجم

بھگوت گیتا دراصل ہندوؤں کے مشہورِ عالم عقیدتی رزمیہ مہابھارت ہی کی ایک داستان ہے جس میں کرشن جی کی کوروؤں کے ساتھ کورکھشیتر میں حق و صداقت کی جنگ کا حال نہایت ہی فلسفیانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس صحیفے کو ہندو دھرم میں اعتقاد کے لحاظ سے اعتبار اور وقار حاصل ہے۔

بھگوت گیتا یا نغمہ الٰہی یعنی یہ مقدس صحیفہ سات سو اشعار پر مشتمل ہے، جو پانڈوؤں کے شہزادے ارجن اور اس کے رہبر کرشن کے ایک تاریخی مکالمے کے اردگرد گھومتا ہے۔ جب ارجن اس شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ اسے اپنے ہی قرابت داروں یعنی کوروؤں کو میدان جنگ میں ہلاک کرنا ہے تو کرشن اُس سے کہتا ہے کہ ''تم ایک سپاہی کا فرض ادا کرو اور مارو''۔

بھگوت گیتا میں انسانیت کے تحفظ کا جو درس اور سچ کی خاطر اجرِ خداوندی کا فکر کیے بغیر فرض منصبی ادا کرنے کی تلقین ہے اس نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے کئی رہنماؤں کو متاثر کیا جن میں مہاتما گاندھی بھی شامل ہیں جن کے بقول گیتا اُس کے لیے ایک ''روحانی لغت'' تھی۔

کرشن مہاراج نے خود اپنی زبانی اس فلسفۂ حیات کا ذکر بھگوت گیتا کی ابتدا میں اس طرح کیا ہے۔ ''جب جب اچھائی زیر ہوتی ہے اور برائی کا بول بالا ہوتا ہے، میں بذاتِ خود اچھائی کی حفاظت اور برائی کی بربادی کے لیے اور مذہب کی بالادستی کی خاطر ہر دور میں وارد ہوتا ہوں''۔

سری کرشن کا سالِ ولادت 3228 قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش جیل کے اندر ہوئی کیونکہ اس کے ماموں کنس نے جو اسے قتل کرنا چاہتا تھا، اسے قید خانے میں ڈال رکھا تھا۔ کرشن کو چپکے سے جیل سے نکالا گیا اور پھر اس کے سوتیلے والدین نند اور یشودھا نے اس کی پرورش کی۔

بھگوت گیتا کے تراجم دنیا کی بے شمار زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا کہنا ہے "سب سے پہلے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں اکبر اعظم کے زمانے میں فیضی جیسے قادر الکلام شاعر نے کیا۔ یہ ترجمہ آزاد ہے۔ فیضی نے اس میں یہ کامیاب کوشش کی ہے کہ ترجمے اور شعر کی خوبی کے ساتھ ساتھ اصل مضمون کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے (1) انگریزی میں گیتا کا ترجمہ پہلی بار چارلس ولکنس نے 1785ء میں کیا۔

بھگوت گیتا کے اردو تراجم کی تعداد اگر چہ چند قلم کاروں نے بارہ سے لے کر نو سے تک بتائی ہے لیکن انھوں نے کسی مترجم کا نام تک نہیں لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں کو دوہراتے ہوئے رواروی کے عالم میں یہ اعداد پیش کیے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں حیدر آباد کے شیخ عبدالغنی کی مساعی کی داد دئے بنا نہیں رہا جاسکتا جنھوں نے انگریزی میں گیتا پر ایک مبسوط اور جامع مقالہ قلم بند کر کے اس کے ترجمہ کاروں کی تفصیلات بھی غالباً پہلی بار فراہم کی ہیں۔ ان مترجمین کے اسماء یوں ہیں: کنہیا لال الکھ وہاری، منشی شام سندر لال بنارسی، منشی دیوی پرشاد، منشی رام سہائے، قاضی محمد نیر صدیقی، جانکی ناتھ مدن دہلوی، منشی جگن ناتھ پرشاد عارف، منشی کیدار ناتھ، بابو بھگوان داس بھارگو، چودھری روشن لال، پنڈت روپ نرائن پانڈے، بنکٹ پرشاد خلیق، پنڈت لکشمی نرائن مشرا، ستیہ پرکاش سہروردی، چرن داس ریڈی، عبدالعزیز خالد، سلطان احمد صدیقی گورکھپوری، مہا ریشی شو بھرت لال، پربھو دیال عاشق لکھنوی، سورج

نرائن مہر دہلوی، محمد اجمل خان اور مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی۔

ان مترجمین کے اسماء کے ساتھ اگر چہ شیخ صاحب نے تراجم کے اشاعتی اداروں اور سالہائے اشاعت کا بھی ذکر کیا ہے لیکن طوالت کی بنا پر یہ تفصیلات ہم نے یہاں حذف کی ہیں۔

اس طویل مقالے کے لیے ہمیں بھگوت گیتا کے جو اردو ترجمے حاصل ہوئے وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، منور لکھنوی، حسن الدین احمد، منیر بخش عالم، انور جلالپوری، پنڈت دینا ناتھ مدن، خواجہ دل محمد، وینکٹ ٹی، ای، اپالا چاری، ساجد صدیقی، نسیم نور محلی، منشی پنا لال بھارگو، پریم ناتھ شاستری، کیول کرشن ریشی، صلو چودھری، سروانند کول پریمی اور نظر سوہانوی نے کیے ہیں اور زیر نظر تحریر میں ظاہر ہے کہ انھی کے ترجموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انگریزی کے ترجمہ کاروں میں بالخصوص اینی بیسنت اور ایڈوِن آرنالڈ کے نام نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ترجمہ لاہور میں اشاعت پذیر ہونے کے بعد ہریانہ اردو اکیڈیمی نے 1995ء میں دوبارہ شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دیباچے میں گیتا اور اس میں بیان کردہ فلسفے کو جس پُرکاری اور گہری تجزیہ نگاری کے پس منظر میں پیش کیا ہے اس کے مدنظر ان کا یہ اقتباس بے حد برمحل اور گیتا کو ذہن نشین کرنے میں ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ خلیفہ عبد الحکیم کہتے ہیں۔ ''یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اس کے اندر عرفان کا ایک دریا کوزے میں بند ہے۔ توحید کا بلند تصور، روح انسانی کا خدا سے واسطہ، زندگی اور موت کا راز، جسم اور روح کا تعلق، علم اور عمل کی باہمی نسبت، جذبات اور عقل کا رشتہ، صلح اور جنگ کا فلسفہ، غرضیکہ حیات و ماورائے حیات کا شاید ہی کوئی ایسا اساسی مسلہ ہو جو اس کے اندر موجود نہیں۔ گیتا کا بنیادی نظریہ قران کریم اور تصوف اسلامی کے نظریہ سے بہت قریب ہے۔ ہندوؤں کے شاستروں میں یہی ایک کتاب ہے جو

ہندوؤں اور مسلمانوں کو دین قدیم کی اصلی وحدت سے آشنا کرسکتی ہے۔ ازروئے اسلام توحید اصلِ دین ہے۔ کائنات کی وحدت اور انسان کی وحدت اس سے بطور نتیجہ حاصل ہوتی ہے۔ علم بھی کثرت میں وحدت کی تلاش کا نام ہے اور اخلاق بھی کثرت اور تضاد میں وحدت کی کوشش ہے۔ عشق بھی وحدت کے جذباتی پہلو کا نام ہے۔ اگر یہ وحدت کی روح کسی فرد یا قوم کے علم و عمل میں سرایت کر جائے تو جنگ اضداد آشتی میں تبدیل ہو جائے۔ گیتا کی تعلیم میں تمام وہ عناصر موجود ہیں جو زندگی کے اہم مسائل کی عقدہ کشائی میں مدد دیتے ہیں۔ گیتا کا مردِ عارف یا مردِ کامل کا تصور بہترین انسان یا جدید اصطلاح میں فوق الانسان کا تصور ہے۔ بعض لوگ اس کو بے حد بلند ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل سمجھیں گے لیکن زندگی کے تمام حقیقی نصب العین اسی انداز کے ہیں:

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت مے نشوم آنم آرزوست (2)

خلیفہ عبدالحکیم کے ترجمے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مترجم نے نہایت خوبصورت اسلوب میں خیال کو بطریقِ احسن بیان کیا ہے۔ ایک ہی بحر میں ترجمہ شدہ اشعار دل کی گہرائیوں کو چھوتے ہیں اور قاری کو ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی اصل کلاسیکی شہہ پارے کا مطالعہ کررہا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

جو پیدا ہوا اُس کا مرنا ضرور

ہے سب کو اسی گھاٹ اترنا ضرور

گیا آج جو یاں سے کل آئے گا

وہ صورت بدل کر نکل آئے گا

ہے گر مرنے جینے کا قانوں اٹل

تو پھر اس پہ افسوس ہے بے محل

یہ تخریب و تعمیر مخلوق ہے
ازل سے یہ تقدیرِ مخلوق ہے
عدم سے ابھرتے ہیں سارے وجود
ہے دیرینہ آئینِ بود و نمود
ابھرتے، سنورتے، گذرتے ہیں سب
عدم کی طرف عود کرتے ہیں سب
اٹھاتی ہے سر جیسے دریا سے موج
گھڑی بھر کا ہے سب غرور اور اوج
جو عارف ہے وہ اس سے گھبرائے کیوں
جو عاقل ہے وہ مفت غم کھائے کیوں؟

بشیشور پرشاد المعروف منوّر لکھنوی کا بھگوت گیتا کا ترجمہ بقول مترجم کے اصل سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ اسے منور صاحب نے بھگوت گیتا موسوم بہ نسیمِ عرفان کے نام سے مکمل کیا ہے اور اس کی پہلی اشاعت 1936ء میں ہوئی تھی۔

علاّمہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے اس ترجمے کے بارے میں یوں خیال آرائی کی ہے: ''میں نے پیش نظر منظوم ترجمے کو جستہ جستہ دیکھا۔ نفسِ معنی میں اصل سے مطابق اور خوبی بیان میں حسن ادا کی جان پایا۔ ان اوصاف اور اصل موضوع کی دقیع اہمیت کے باوجود نسیمِ عرفان باغِ فصاحت کے دلدادوں کے لئے شمیم مشام پرور بھی ہے۔ بیان کی سلاست، بندش کی چشتی، اسلوب کی تازگی و دلآویزی اور مشکل پسندی سے اجتناب میں یہ کتاب ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا اور مفید ثابت ہوگا''۔ (3)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منوّر صاحب نے گیتا کو اردو میں منتقل کرتے وقت ذہن میں اس کا اصل سنسکرت ہی رکھا ہے جس کے نتیجے میں ترجمہ سنسکرت کے

الفاظ سے بھاری ہوا ہے اور اس سے ترجمے کا تغزل بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔

مثلاً:

مٹ جائیں گے دھرم کرم جس وقت

غالب ہوگا ادھرم جس وقت

اس قبح کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منور صاحب نے جگہ جگہ پر مہابھارت اور گیتا کے پس منظر میں ان کے کرداروں کے نام بھی ترجمے میں موزون کرنے کی کوشش کی ہے جس کی بنا پر شعر کی روانی میں خلل پڑا ہے۔

حسن الدین احمد کے ترجمے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ منثور ہونے کی وجہ سے یہ قاری کے ذہن میں آسانی کے ساتھ گھر کرتا ہے۔ البتہ ان کی یہ رائے کسی حد تک مبالغہ آمیزی ہی کا اظہار ہے کہ "گیتا کے اردو تراجم دیکھنے سے مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ ایسا کوئی ترجمہ نہ مل سکا جس کو پڑھ کر میں بھگوت گیتا کا مطلب بخوبی اور آسانی سے سمجھ سکتا"۔(4) احمد چونکہ سنسکرت زبان سے واقف نہیں تھے لہازا انھوں نے اپنے لیے بیسنت اور آرنالڈ کے انگریزی ترجموں ہی کا سہارا لیا ہے۔

کئی اور مترجمین کے برعکس احمد نے ہندو دیو مالائی اسما اور اصطلاحات کو حاشئے میں درج کر کے اور اُن کی توضیح کر کے اور ان کے معنی درج کر کے قاری کو سہولت بہم پہنچائی ہے۔ ترجمے میں شروع سے آخر تک سہل ممتنع کی زبان استعمال کی گئی ہے۔

خواجہ دل محمد کا ترجمہ' گیتا جو بے پناہ مقبولیت کی بنا پر' دل کی گیتا' کے نام سے مشہور ہوا غالباً دوسرے تمام تراجم پر سبقت لے چکا ہے۔ دل محمد نے اس کی ابتدا میں ایک طویل مگر با معنی مقدمے میں مہابھارت اور گیتا کے پس منظر میں ہندو فلسفے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کے فطری رشتے کی جزیات پر سیر حاصل

بحث کر کے قاری کو اس فلسفے کی باریکیوں اور نزاکتوں سے کما حقہ آگاہ کیا ہے جس کی بدولت گیتا کی روح کو سمجھنے میں آسانی بہم ہو جاتی ہے۔ دل محمد نے اپنے ابتدائیہ کے اخیر پر مہابھارت کی توسیع پسند پر مبنی جنگ برعکس گیتا کی حق اور سچائی کی لڑائی کے تناظر میں ہمعصر حالات کا یہ موازنہ کیا ہے: ''آج بھی وہی مہابھارت کی جنگ ہو رہی ہے۔ انسان کا تن کوروکشیتر کا میدان ہے۔ من دھرم کشیتر ہے۔ کھیت میں جو بیج بویا جائے گا ویسا ہی پھل پائے گا۔ آم کی گٹھلی سے آم اور نیم کی بیج سے نیم کا پور نکلے گا۔ محبت کے بیج سے محبت اور نفرت کے بیج سے نفرت پیدا ہوگی۔ حق و باطل، نیکی اور بدی کی فوجیں برسرِ پیکار ہیں۔ نیکی کی فوج کا سردار ضمیر ہے جو یدھشٹر کی طرح یدُھ یعنی جنگ میں مستقل مزاج رکھتا ہے۔ دوسری طرف بدی کی فوج ہے جس کا سردار نفسِ امارہ ہے جو دھرت راشٹر (اندھے راجے) کی طرح دوسرے کے راج کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔

''ارجُن کی طرح انسان کو چاہئے کہ اپنی رتھ (قوتِ عمل) کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں دے، جذبات کو فرائض پر غالب نہ آنے دے، حق کے لیے پوری کوشش کرے اور سب کام کرم سمجھ کر خدا کے لیے اور خدا ہی کا کام سمجھ کر پورا کرے۔ خدا اس کا مددگار ہو''۔(5)

سوامی تپسیانند نے گیتا کے فلسفے کی یوں وضاحت کی ہے۔ ''اس صحیفے کی زبردست پذیرائی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کے عملی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر قابو پانے کے لیے انسان کا یہ فریضہ بھی شامل ہے کہ بنی آدم ایک نامکمل سماجی نظام میں اپنا کام سرانجام دے تاکہ اسے تکمیل کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو سکے۔ گیتا اسی مسلے سے شروع ہو کر اسی کے حل پر اختتام پذیر ہوتی ہے اور اس میں عقیدتی فلسفے کی پُراثر ترسیل موجود ہے''۔

بھگوت گیتا کے تئیں دنیا بھر کے مفکروں، دانشوروں اور اصحاب فکر و

دانش نے انتہائی عقیدت اور تحسین کے ساتھ خیال آرائی کی ہے اور اور اسے ایک عظیم آسمانی صحیفہ اور رہبرِ زندگی قرار دیا ہے۔ مہاتما گاندھی کا کہنا ہے، ''جب بھی شکوک وشبہات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ جب نا امیدی میرے چہرے بشرے سے جھلکتی ہے اور مجھے افق پر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، میں بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتا ہوں اور اسے سکون قلب عطا کرنیوالی ایک راحت بخش تخلیق پاتا ہوں۔ میں اس عالمِ افسردگی میں فوراً ہی مسکرانے لگتا ہوں۔ میرے خیال میں جو بھگوت گیتا کا سہارا لیتے ہیں انھیں ہر دن اس سے حیات بخش سرور اور نئے معنے حاصل ہوں گے۔''

سوامی وویکانند جب 1888 ء سے لے کر 1893 ء تک سارے ہندوستان کا دورہ کرر ہے تھے تو انھوں نے جو دو کتابیں ساتھ رکھی تھیں وہ تھیں **The Imitation of Christ** اور بھگوت گیتا۔

ایک دلچسپ واقعہ یوں ہے کہ تامل ناڈو کے رام ناتھ پور میں ہر جمعرات کو ایک مندر میں ہندو فرقے کے لوگ کسی ہندو سے نہیں بلکہ ایک مسلمان سے گیتا کا پاٹھ انتہائی انہماک اور ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔ ایم۔ عبدالسلام نامی اس دانشور نے بیک وقت قران، گیتا اور بائبل کا بغور مطالعہ کیا ہے اور وہ اب تامل ناڈو میں ان تینوں الہامی صحائف کی تدریس میں رات دن محور ہتا ہے وہ کہتا ہے کہ ''میں ان تینوں کتابوں میں کوئی تضاد نہیں پاتا''۔ صوبے میں اب اس کا نام ''گیتا سلام'' پڑ گیا ہے۔

منیر بخش عالم نے ''یتارتھ گیتا'' کے نام سے اس کی مبسوط تشریح کی ہے اور اس کے ترجمے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ترجمہ کار نے انتہائی وضاحت کے ساتھ گیتا کے تخلیقی پس منظر اور اس کے آفاقی فلسفے پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کا وجدان اُن کے بقول انھیں گورو سوامی پرمانند سے ودیعت ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دین کی اور ایمان کی باتیں
اس عظیم انسان کی باتیں
میں نا چیز کہاں لکھا باتیں
گیتا کی یہ گیان کی باتیں

منیر عالم کے مطابق ''گیتا کسی خاص انسان، ذات، طبقہ، موقع محل، مذہبی تفریقات یا کسی قدامت پرست کی کتاب نہیں بلکہ یہ تمام عالم کی دائمی دینی کتاب ہے۔'' ان کے دیباچے کا قدرے طویل یہ اقتباس قاری کو گیتا کی آفاقی اہمیت اور ابدی افادیت کو سمجھنے میں کسی حدت ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ ''گیتا عالم گیر ہے۔ دین کے نام پر مروجہ دنیا کی تمام شریعتوں میں گیتا کا مقام بے مثال ہے۔ یہ خود میں کتابِ شریعت ہی نہیں بلکہ دیگر مذہبی کتابوں میں پوشیدہ سچائی کا پیمانہ بھی ہے۔ گیتا وہ کسوٹی ہے جس پر ہر ایک مذہبی کتاب میں دھندلا سچ اجاگر ہوا ٹھتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف بیانات کا حل نظر آتا ہے۔ ہر ایک مذ ہبی کتاب میں دنیا میں جینے کھانے کا فن اور مذہبی روش کے طور طریقوں کی افراط ہے۔ زندگی کو دلکش بنانے کے لیے انہیں کرنے اور نہ کرنے کے دلچسپ لیکن خوفناک بیانات سے مذہبی کتابیں بھری پڑی ہیں، مذہبی طور طریقوں کی اسی روش کو عوام دین سمجھنے لگے ہی۔ زندگی گذارنے کے فن کے لیے تیار شدہ اصولوں میں وہ زمانہ اور حالات کے مطابق بدلاؤ قدرتی ہے۔ مذہب کے نام پر سماج میں جھگڑے کی واحد وجہ یہی ہے۔ گیتا ان لمحاتی انتظامات سے اوپر اٹھ کر روحانی تکمیل میں قائم کرنے کا عملی غور و فکر ہے جس کا ایک بھی اشلوک مادی زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کا ہر ایک شلوک آپ سے باطنی جنگ 'عبادت' کی مانگ کرتا ہے۔ غیر مستند مذہبی کتابوں کی طرح یہ آپ کو جنت یا دوزخ کی کشمکش میں پھنسا کر نہیں چھوڑتی بلکہ اُس ابدیت کا حصول کراتی ہے جس کے

پیچھے زندگی اور موت کی قید نہیں رہ جاتی''۔

مترجم نے اپنے نثری ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی درج کیا ہے جس سے قاری کو ترجمے کا ہر باب ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ البتہ قارئین کے لیے اس ترجمے سے لیے گئے درجِ ذیل اقتباسات سے لگتا ہے کہ غالباً انھیں فصیح و بلیغ اردو پر کما حقہ عبور حاصل نہیں تھا جس سے یہ ترجمہ پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے جگہ جگہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ بعض اوقات ان کے معنی مہمل نظر آتے ہیں:

''پانڈو کے پسر ارجن نے (نیکی ہی پانڈو ہے۔ نیکی ہی عشق کو جنم دیتی ہے) اس وقت مختلف قسموں میں بٹی ہوئی ساری دنیا کو ان اعلی معبود کے جسم میں ایک جگہ موجود دیکھا۔''

''جس طرح پروانے ختم ہونے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں بے حد رفتار سے داخل ہوتے ہیں ویسے ہی یہ ساری جاندر (؟) بھی اپنی تباہی کے لئے آپ کے دہان میں بہت زیادہ بڑھے ہوئے (؟) رفتار سے داخل ہو رہے ہیں۔''

''اے مالک! میرے ذریعے سے آپ کی وہ شکل دیکھی جانی ممکن ہے اگر آپ ایسا مانتے ہوں؟ تو اے جوگ مالک! آپ اپنی لافانی حقیقی شکل کا مجھے دیدار کرائیے۔ اس پر جوگ کے مالک نے کوئی اختلاف نہیں کیا کیونکہ وے پہلے ہی جگہ جگہ پر کہہ آئے ہیں کہ تو میرا شریک بندہ اور محبوب دوست ہے لہازا انھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اپنے (؟) حقیقی شکل کا دیدار کرلیا۔''

وینکٹ ٹی ای اپالا چاری نے ''نغمۂ الاہی'' کے نام سے گیتا کا ترجمہ اس وقت مکمل کیا جب ان کی عمر 74 سال تھی۔ ان کا دعوی ہے کہ ''میں نے یہ کام ایک سال میں مکمل کرلیا اور اسے 2003 میں شائع کیا۔ بھگوت گیتا کے جو اردو تراجم

میری نظروں سے گذرے ہیں وہ بے معنی ہیں البتہ مجھے اطمینان ہے کہ میرا ترجمہ اصل کے عین مطابق ہے۔میں اردو کی جان پہچان کا سہرا اپنے سکول کے اردو مدرس قادر حسین خان کے سر باندھتا ہوں"۔ چاری ان دنوں پچاس سالہ پرانی تیلگو۔اردولغت پر کام کرر ہے ہیں۔

گیتا کے دیگر کئی اردو تراجم کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بے معنی ہیں چاری کی یاوہ گوئی کے سوااور کچھ نہیں کیونکہ اگرانھوں نے دل محمد،شان الحق حقی یا خلیفہ عبدالحکیم کے ترجموں کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اس خودستائی میں مبتلا نھیں ہوتے۔ یہ دعوائے پیغمبری محض ایک خودستائی ہے کیونکہ ان کے ترجمے میں فنی التزام اور ادبی معیار کہیں پر نظر نہیں آتا۔نمونے کے طور پر غیر معیاری منثور ترجمے سے یہ بے اثر مثالیں پیش ہیں۔اس ترجمے میں شعری نزاکت،حسن کلام اورفنی برجستگی ہر طرح سے ناپید ہے۔

"اے ارجُن !ساتوک عمل وہی ہے جس میں پھل کی خواہش نہ ہو۔نتیجہ کی خواہش نہ رکھنے والا جو نہ تو رغبت اور نفرت رکھ کر بغیر لگاؤ کے اپنے فرائض کے مطابق جومقررہ عمل کرتا ہے اُس فعل کوساتو کی فعل کہتے ہیں"۔

"جوشخص شاستر کے احکام کی پروانہ کر کے اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے وہ نہ تو کمال حاصل کرتا ہے،نہ ہی مسرت اور نہ ہی منزلِ مقصود"۔

"خواہش آلود عمل کو چھوڑنا (سنیاس) کہلاتا ہے اور تمام اعمال کے پھل کو چھوڑنا تیاگ (ترکِ علائق) کہلاتا ہے"۔

"قربانی،ریاضت،خیرات اور عمل کوترک نہیں کرنا چاہئے۔اعمال کو کرنا ہی چاہئے۔ریاضت کے کام روح کو پاک کرنے والے ہیں مگر پھل اور تعلق کا خیال چھوڑ کر ان کو کرنا چاہئے"۔

"نہ وہاں سورج کی روشنی ہے نہ چانداور نہ ہی آگ اسے روشن کرتی ہے۔

وہاں جا کر کوئی انسان اس دنیا میں واپس نہیں آتا۔ وہی میرا افضل مقام ہے‘‘۔

انورؔ جلالپوری مشاعروں کے شاعر ہیں جو اکثر شاعری کی محفلوں میں کلام سنانے کے علاوہ نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ انھوں نے بھگوت گیتا کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مگر ان کا ناشر شائقین کو دیوناگری میں شائع شدہ جلد ہی فراہم کرتا ہے جس سے اس رسم خط سے نابلد قارئین اس تخلیق سے محظوظ ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ بقول انورؔ انھوں نے گیتا کے اسی (80) تراجم دیکھے ہیں جن میں ساٹھ نثر میں اور باقی منظوم ہیں۔ انھوں نے سات سو ایک شلوک، اٹھارہ ابواب سے ایک ہزار سات سو اکسٹھ اشعار میں ڈھالے ہیں۔

ہمارے یہاں چند اردو ادبا نے یہ رویہ اپنایا ہے کہ اردو کی نام نہاد خدمت کے نام پر وہ دیوناگری میں اپنی تصانیف کو شائع کر کے اردو کی بے حرمتی کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ اردو کا ایک مسلمہ نستعلیق رسم خط ہے جو دنیا بھر میں رائج ہے۔ اس سے کنی کترانا اور ہندی کے پجاریوں کی چاپلوسی میں ملوث ہونا قابل افسوس ہے، انور جلالپوری نے بھی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اسی کوتاہ نظری سے کام لیا ہے۔

البتہ مثنوی کی صنف میں کیے گئے انور جلالپوری کے اردو ترجمے کی یہ خاصیت ہے کہ انھوں نے کئی دوسرے مترجمین کے برعکس بحر اور وزن، ردیف و قافیہ اور شعری لوازمات کا پورا خیال رکھا ہے۔ اگر اس کا موازنہ خواجہ دل محمد کے ترجمے کے ساتھ کیا جائے تو دل محمد کی شیرینی او معنی آفرینی بے مثال ہے پھر بھی انورؔ نے حتی الامکان اپنے ترجمے کو سہل ممتنع میں ڈھال کر ایک اچھی تخلیق پیش کی ہے۔ اس ترجمے سے چند مثالیں پیش ہیں:

خوشی اور غم کچھ بھی ہوتے نہیں
سمجھ دار جو ہیں وہ روتے نہیں

تجھے پھر بھی لازم نہیں رنج و غم
تو سب کی نگاہوں میں ہے محترم
چکھے گا ہر اک موت کا ذائقہ
یہی ہے ازل سے یہی سلسلہ
مرے گا جو پیدا بھی ہوگا وہی
یونہی چلتی جائے گی یہ زندگی
تیرے میرے بس کی یہ باتیں نہیں
ہوا و ہوس کی یہ باتیں نہیں
جو بس میں نہیں اُس پہ رونا ہی کیا
بلا وجہ پلکیں بھگونا ہی کیا؟

-

وہ اک ذات ہے خالقِ کائنات
وہ اک ذات ہے مالکِ شش جہات
اُسی کے تو جلوے ہیں چاروں طرف
اُسی کے کرشمے ہیں چاروں طرف
فنا سے پرے تو وہی ذات ہے
سدا جو رہے تو وہی ذات ہے

اور جاودانی حقیقت کے یہ لافانی اشعار جن میں پیغمبرانہ انداز میں دین دھرم کی افادیت کا خوبصورت بیان ہے:

کرشن سے ہی ارجن نے پھر یہ کہا
کہ سُن لے میری آپ یہ التجا

اگر دھرم پر آنچ آجائے گی
تو دنیا کو دیمک ہی کھا جائے گی
اگر پاپ پھیلے گا سنسار میں
بکیں گی خواتین بازار میں
اگر اس میں کچھ چوک ہو جائے گی
تو اولاد مشکوک ہو جائے گی
جہنم کا پھر پیٹ بھر جائے گا
شریف آدمی جونہی ڈر جائے گا

پنڈت یوگی راج نظرؔ سوہانوی نے ''کلام ربّانی'' کے نام سے بھگوت گیتا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اس لحاظ سے نہایت اہمیت اور افادیت کا حامل ہے کہ 1934ء میں انبالہ پنجاب سے شائع شدہ اس ترجمہ پر اُس وقت کے ممتاز صاحبانِ علم و دانش اور دنیائے ادب کے اکابرینِ دہر نے دل کھول کر اظہار خیال کیا ہے جن میں نوح ناروی، سید امتیاز علی تاج، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالکؔ، سید مسعود الحسن رضوی، مولوی عبدالحق، رضا علی وحشتؔ کلکتوی، برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، منشی پریم چند، احمد شاہ بخاری پطرس، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور خواجہ حسن نظامی کے شہرہ آفاق اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بقولِ نوح ناروی ''نظر سوہانوی نے اس کتاب کو لکھ کر ادبی دنیا پر احسان کیا ہے''۔ مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ ''گیتا کا ترجمہ دنیا کی ہر شائستہ زبان میں ہو چکا ہے۔ اردو میں کئی ترجمے نظم اور نثر میں ہوئے ہیں۔ یہ ترجمہ جو نظر صاحب نے کیا ہے بلاشبہ دوسرے ترجموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ترجمہ میں روانی پائی جاتی ہے اور دقیق مسائل کو بھی مترجم نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے''۔ کیفی دہلوی کا کہنا ہے کہ ''نظم کی سلاست، بیان کی روانی اور ادائے مطلب میں دقتِ

نظر کے ساتھ سہل پسندی اس ترجمے کے جوہر ہیں جو ہر پڑھنے سے خراج تحسین طلب کرتے ہیں"۔ منشی پریم چند کی یہ رائے ہے کہ "موازنہ کرنا تو بہت مشکل ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تک اس قسم کے جتنے منظوم ترجمے شائع ہوئے ہیں اُن میں حضرت نظؔر کے کلام ربّانی کو ممتاز درجہ حاصل ہے"۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے مبسوط تجزیے میں لکھا ہے کہ "پنڈت یوگی راج نظؔر سوہانوی ایک خوش فکر اور مشاّق شاعر ہیں۔ آپ نے حال ہی میں سری کرشن جی مہاراج کی گیتا کا ترجمہ سلیس اردو نظم میں کیا ہے جس میں مثنوی کی بحر اختیار کی ہے۔ میں نے جستہ جستہ مقامات سے اس ترجمے کو دیکھا۔ نظم میں متانت اور ترجمے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ اس قسم کا لٹریچر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وحدت فکر پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے احساساتِ مذہبی کو سمجھنے میں بے انتہا کارآمد ہوتا ہے۔ اردو دان ہندوؤں اور مسلمانوں کو پنڈت نظر صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنہوں نے سری کرشن کے بے نظیر موعظۂ عمل کو نظم اردو کا لباس پہنا کر اردو خوانوں پر احسان عظیم فرمایا ہے"۔

عالمی شہرت یافتہ ماہر لسانیات اور مورخ ڈاکٹر تارا چند کا یہ تجزیہ قابل مطالعہ ہے کہ "بھگوت گیتا قدیم ہندوستان کی ذہنی وروحانی ترقی کی ایک قابل فخر یادگار ہے جس کے ترجمے تقریباً تمام متمدن ممالک کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ فیضؔی نے اکبؔر کے زمانہ میں اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندی، مراٹھی، بنگلہ اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں اور شرحیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ اردو زبان میں بھی گیتا کے ترجمے ہوئے ہیں لیکن پنڈت نظر سوہانوی نے اس کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے جو اپنی نوعیت میں ایک نئی چیز ہے۔ مترجم کی یقیناً یہ ایک جدت ہے کہ سنسکرت نظم کا براہ راست اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے"۔

بھگوت گیتا کے اکثر تراجم میں ہندی اور سنسکرت الفاظ وتراکیب کا تکلیف دہ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کے برعکس نظر صاحب نے فصیح و بلیغ اردو زبان ہی کا استعمال کیا ہے جس کی بدولت اسے ایک انفرادی خاصیت عطا ہوئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس ترجمے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت اور ہندی کی مذہبی اور روحانی اصطلاحوں کی بجائے زیادہ تر عربی اور فارسی کی اسلامی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں''۔ مندرجہ صدر دیگر تبصرہ نگاروں نے بھی اپنے اظہار خیال میں ایسے ہی تاثرات بیان کیے ہیں۔

اس خوبصورت ترجمے سے ثنائے خداوندی کی یہ چند خوبصورت مثالیں پیش ہیں:

ایک ہے، یہ سب اُسی کا ہے ظہور
جسم و جاں سے برتر و بے مثل نور

ابتدا و انتہا سے ہے بری
ہے اُسی کی چار سو جلوہ گری

بے تعلق ہے حق و باطل سے وہ
سب میں شامل، دُور ہر شامل سے وہ

اُس کے ہر سو ہیں دہان و گوش و سر
دست و پا و دیدۂ جلوہ نگر

سب کو دے کر صورت نقش و نگیں
اس جہاں میں آپ ہوتا ہے مکیں

ہے اُسی کے دم سے احساسِ حواس
خود ہے لیکن بے حواس و بے قیاس

گو صفاتِ ظاہری سے دور ہے
لیک اُسی میں یہ جہاں مستور ہے

جملہ مخلوقات پر فائق ہے وہ
حمد کے، توصیف کے لائق ہے وہ

وہ اگر چہ ہے سراسر بے صفات
ہر صفت میں پُر ہے لیکن اُس کی ذات

سب کے اندر سب کے باہر ہے وہی
سب سے بہتر سب سے برتر ہے وہی

ڈاکٹر ساجد صدیقی کا تعلق مالیگاؤں مہاراشٹر سے ہے۔ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کر کے اسے قران کریم کی روشنی میں تقابلی مطالعہ کے ساتھ یہ بات پھر ایک بات واضع کی ہے کہ مسلمانوں کی مقدس ترین آسمانی کتاب قران اور بھگوت گیتا کی تعلیمات میں حد درجہ مماثلت ہے اور ان میں گیتا کے اٹھارویں ادھیائے میں بیان کردہ یہی جاودانی فلسفہ درج ہے کہ ''تمام خداؤں کی عبادت کو چھوڑ کر مجھ ایک خدا کی پناہ میں آجاؤ۔ بہت سارے خداؤں کو چھوڑتے وقت غم نہ کرو۔ میں تم کو تمام گناہوں سے آزاد کر دوں گا'' اسی لیے مترجم نے اس تصنیف کو ''خدا کا بیان'' کہا ہے۔

مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی چترویدی نے اپنی تقریظ میں مہا بھارت اور بھگوت گیتا کے تذکرہ میں حقیقت اور فسانہ کی توضیح اس طرح کی ہے

کہ ''شریمد بھگوت گیتا در اصل دنیا کی جنگی کہانیوں میں نا قابل یقیناً مبالغہ آمیز واقعات و عجائبات پر مشتمل مہا بھارت کا ایک حصہ ہے مگر دونوں کے مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً مہا بھارت کی جنگ میں مرنے والوں کی تعداد ایک ارب چھیاسی کروڑ بتائی گئی ہے۔ قابل غور بات ہے کہ موجودہ ہندوستان کثرتِ آبادی کے باوجود اب تک ایک ارب چھیاسی کروڑ کی تعداد کو نہیں چھو سکا ہے تو آج سے لگ بھگ سوا پانچ ہزار سال پہلے (سری کرشن جی کی پیدائش 28 جولائی 3338 قبل مسیح اور وفات 3102 قبل مسیح کے مطابق) سر زمین ہند میں نہیں بلکہ اس کے صرف ایک چھوٹے سے علاقے کوروکھشیتر میں اتنا بڑا فوجی اجتماع کسی حساب سے ممکن قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مہا بھارت کی کہانی حقیقت سے بہت دور مبالغہ آمیز افسانوی کرداروں پر مشتمل ہے۔

''اس کے برعکس شریمد بھگوت گیتا حقائق و معارف سے لبریز، خدا کی وحدتِ ذات و عظمتِ صفات اور اس کی عبادت و معرفت اور خدمتِ خلق اور انسان کے صالح کردار اور اقدارِ حیات کے گہرے فلسفے اور شعورِ بندگی اور فرائضِ زندگی کے بیش بہا نکات پر مشتمل خزینۂ معرفت ہے''۔

مولانا نے گیتا کے اردو تراجم کی تعداد 67 بتائی ہے۔ البتہ ان میں سے انھوں نے صرف دو تراجم یعنی سیماب اکبر آبادی کے شاگرد الم مظفر نگری اور چودھری روشن لال، سابق کمشنر پنجاب، ہی کے ترجمے کا ذکر کیا ہے۔

با محاورہ سنسکرت میں لکھی گئی گیتا کا اردو نظم میں کامیابی کے ساتھ ترجمہ کرنا نہایت کارے دارد والا معاملہ ہے۔ ہمارے خیال میں ابھی تک صرف نظر سوہانوی نے اس کام میں کامیابی پائی ہے۔ اسی تکلیف دہ دشت نوردی میں آبلہ پا ہونے سے بچنے کی خاطر ساجد صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سعی کو

نثر ہی کی راہ اختیار کر کے رو بہ عمل لایا جائے جسے انھوں نے بطریق احسن انجام دیا ہے۔ ترجمہ کا یہ اقتباس خوبصورت نثر پر ساجد صاحب کی دسترس کی دلالت کرتا ہے:

''خدا جو مخلوق سے بالکل الگ ہے، وہ نہ ہی کسی کے نیک کاموں کا اور نہ ہی گناہ کے کاموں کا حساب لینے کا ذمہ وار ہے۔ جہالت کی وجہ سے انسان ایسا کہتا ہے کیونکہ بلا شبہ انسان کے غرور اور لالچ نے اُس کے علم پر پردہ ڈال کر اُسے چھپا دیا ہے۔

''لیکن وہ تمام انسان جن کے علم کو جہالت نے برباد کر دیا ہے، یہ حقیقی علم، اُس سب سے اعلیٰ خدا کو اُن پر سورج کی طرح روشن کر دیتا ہے۔

''جن لوگوں نے علم کے ذریعے اس ایک خدا سے اپنے شعور کو جوڑ رکھا ہے۔ اپنے آپ کو اس خدا کے سپرد کر دیا ہے، اس ایک خدا پر پختہ ایمان قایم کر رکھا ہے، صرف اُس کی پناہ لے لی ہے، ایسے لوگ اس جنت کے مقام میں جائیں گے جہاں جا کر دوبارہ کوئی بھی واپس نہیں آتا اور جہاں جا کر انسان تمام تکالیف اور خوف وغم سے پاک ہو جاتا ہے''۔

ساجد صدیقی نے یہ ترجمہ، جو 178 صفحات پر محیط ہے، خود ہی شائع کر کے انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مترجم نے قران پاک کے ارشادات اور بھگوت گیتا کی تعلیمات کا ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کر کے یہ بات ایک بار پھر باور کی ہے کہ دراصل سبھی الہامی اور آسمانی صحائف انسان کو ایک ہی نوع کا درس حیات دیتے ہیں اور فلسفۂ زندگی کو واضع کرنے میں ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ مختلف مذاہب کے آسمانی یا الہامی صحائف کے بارے میں ان سے متعلق فرقے اپنے عقیدتی نظریہ کے لحاظ سے مختلف

تاویلات پیش کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اس سلسلے میں کئی مقامات پر اختلافی تصورات بھی سامنے آجاتے ہیں لیکن جہاں تک انسانی اقدار، نیک خیالات اور ہمدردی کے جذبات کا تعلق ہے وہاں قران یا گیتا میں اختلافات کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ سری کرشن کی ہمہ جہت ذات کے گونا گوں پہلوؤں کی توضیح اس طرح سے بھی ہوتی ہے کہ روایت کے مطابق اُس کے ایک سو آٹھ نام ہیں جو اُس کی شخصیت کی اُن صفات کی نشان دہی کرتے ہیں جن کی رو سے وہ حق و صداقت کا مجسمہ اور بے لاگ عملِ پیہم کا علبر دار ہیں۔ ان اسماء میں اننت، اجے، بال گوپال، دیالو، دوارکاس پتی، جگدیش، مدن، مادھو، مدھوسودن، من موہن، میور، مرلی، نارائن، نرنجن وغیرہ شامل ہیں۔

پنڈت دیناناتھ مدن المتخلص بہ معجز دہلوی نے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ پہلی بار 1912ء میں شائع کیا۔ اس کا چوتھا ایڈیشن جو 1921ء میں اشاعت پذیر ہوا، وہی میرے پاس ے۔ جو ''مخزن اسرار'' کے نام سے ان کے برادر پنڈت امرناتھ مدن نے پنجاب سے منظر عام پر لایا۔ کہا جاتا ہے کہ مدن کے والد پنڈت جانکی ناتھ مدن نے بھی نثر میں گیتا کا اردو میں ترجمہ جو میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ دیناناتھ مدن کو چونکہ سنسکرت، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں پر خاصی دست رس حاصل تھی لہاذا انھوں نے اس صحیفہ کی توضیح کے سلسلے میں کئی فارسی اساتذہ کے چیدہ چیدہ اور با معنی اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ مثلاً:

سرمدؔ غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

پنڈت دینا ناتھ مدن نے گیتا اور دیگر آسمانی صحائف کے فلسفے کا اس فاضلانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے: ''یہ صورت طلسم جو دیدۂ سیر بین میں سمائی ہے اور جو مختلف صدائے ہوا گوش شنوائی میں آئی ہے، یہ کیا شعبدہ ہے، اور کس کا ہے اور کیونکر ہوا ہے؟۔ عارف اور عاشقِ حقیقی جو اس عالم کی روحِ خاص ہیں۔ اس حجاب ظلماتی کی پردہ دری کا سبب ہوئے ہیں اور اس دائرہ جہل و نادانی میں اون کا وجود مطلق علم سرور کا نقطہ ہوا ہے جس قدر کلام صغیر و کبیر مختلف مذاہب کے اس وقت گفت و شنود اور علم میں ہیں، اسی نقطہ کا شہود ہیں اور اسی سے نقاط خطوط اور زاویہ کل صفحہ ہستی پر منقش ہو رہے ہیں۔ پس علم عارفان علم ذات ہے اور اون کا کلام کلامِ حق جو کلام عارفوں کے ہیں وہی وید متبرک، اوپنشد سمرتی، قران، انجیل، توریت اور زبور کہلائے ہیں اور کلام حق انھی کے وسیلے سے عالم میں ظاہر ہوا ہے''۔

مدن صاحب کے ترجمہ کا یہ دل نشین نمونہ پیش ہے:

دیکھ کر کوروؤں کو اپنے سامنے صف میں کھڑا
ہاتھ میں لے کر کمان جب کشت و خون ہونے لگا
کرشن سے اے مہربان اُس وقت ارجُن نے کہا
وسط میں فوجوں کو میرے رتھ کو ٹھہرادو ذرا
تاکہ مجھ کو بھی خبر ہو کون ہیں وہ سورما
معرکے میں آج ہوگا جن سے میرا سامنا
میں بھی اُن زورآوروں کو اک نظر سے دیکھ لوں
جن کو دریودھن کی حشمت پر سمایا ہے جنوں
مجھ کو تو خواہش نہیں سامان فتح و عیش کی
ہیچ ہیں میری نظر میں مال و جاہِ زندگی

سلطنت کے ٹھاٹھ جن کے واسطے درکار تھے
وہ کھڑے ہیں ہاتھ دھوکر اپنی مال و جان سے
نیک اعمالی میں جس کنبے کو آتا ہے فتور
لوگ کہتے ہیں کہ وہ دوزخ میں جاتا ہے ضرور
ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے شعاع ذو الجلال
غیر ممکن ہے کسی تدبیر سے اُس کا زوال

مدن صاحب نے اپنے فلسفیانہ نظریات کو بھی گیتا کے ترجمے میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کر کے اس صحیفے کے ساتھ مدرجہ ذیل فارسی اشعار کو بھی برمحل طریقے سے جگہ جگہ درج کیا ہے:

مخصوص صفا بہ سر تراشیدن نیست
تسلیم و رضا بہ خرقہ پوشیدن نیست
رمزے است کہ از فیض سیر گردد
ایں دولت نایاب بہ کوشیدن نیست

لکشمی چند نسیم نورمحلی (1912-1967) کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ ابوالفصاحت جوش ملسیانی کے شاگردِ رشید تھے۔ وہ پنجاب کے ایک برگزیدہ کھتری خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اپنی امارت اور زمینداری کی بدولت سارے علاقے میں مشہور تھے۔ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ایران گئے جہاں انھوں نے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق صرف ونحو میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ شاعری بھی انھوں نے اردو اور فارسی میں کی۔

بھگوت گیتا کا ان کا کیا ہوا منظوم اردو ترجمہ ایک اہم کارنامہ ہے جس میں انھوں نے فصیح اور بامحاورہ زبان میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا یہ ترجمہ 1973ء میں شائع ہوا۔ نسیم صاحب کے ترجمۂ گیتا پر اساتذۂ اردو

جوشؔ ملسیانی، نوح ناروی، ابر احسنی گنوری اور قیس جالندھری نے اپنی قیمتی آرائ کا اظہار کیا ہے۔ جوش صاحب لکھتے ہیں۔ ''میرے عزیز شری لکشمی چند نسیم نور محلی نے حال ہی میں گیتا کا منظوم اردو ترجمہ تصنیف کیا ہے اور اس کا تاریخی نام ''فضیلت الٰہی'' رکھا ہے۔ گیتا جیسے مشہور روحانی فلسفے کے منظوم ترجمے اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ تین ترجمے تو میری نظر سے بھی گذرے ہیں۔ مگر جہاں تک زبان کی صفائی اور اور بیان کی وضاحت کا تعلق ہے، یہ ترجمہ اُن سب سے بہتر ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی مختصر بحر میں ایسے وسیع مفہوم کو صرف دو شعروں میں اتنی صفائی، اتنی سادگی اور اتنی سلاست سے کس طرح بیان کیا ہے۔ یہ کامیابی اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ شاعر نے اپنی فنی چابک دستی اور قادر الکلامی پر اپنے آپ کو بہت ہی تحسین و آفرین کا مستحق ثابت کر دیا ہے اور اس ہفت خوانِ سخن کو بڑی کامیابی سے طے کیا ہے''۔

نوح ناروی کا خیال ہے کہ۔ ''نسیم صاحب جیسی خوبی اور کسی ترجمے میں نظر نہیں آئی۔''

قیس جالندھری کی رائے میں۔ ''اردو زبان کے اس دور میں یہ سلیس انداز بیان قابل رشک ہے''۔

نسیم صاحب کے اس ترجمے سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

جو نہیں ہے وہ ہو نہیں سکتا
اور جو ہے وہ کھو نہیں سکتا
جس نے کل کائنات پیدا کی
بے شک اُس کی ہے ذات لافانی
کوئی اُس کو مٹا نہیں سکتا
موت کی زد میں لا نہیں سکتا

روح ہے لا زوال، لا محدود
اس کے دم سے ہے کل جہاں کی نمود
نہ کبھی روح آپ مرتی ہے
نہ کسی کو یہ قتل کرتی ہے
آرزو کی مراد میں نہ الجھ
رنج و راحت کی یاد میں نہ الجھ

عزیز اللہ شیرانی نے بھگوت گیتا کے جن قدیم اور نایاب تراجم کا کیا ہے ان میں 1893ء میں پچھمی نراین ٹونکی کا کیا ہوا منظوم ترجمہ مخطوطے کی شکلیں موجود ہے۔ کیول کشن فرح کا ترجمہ بعنوان 'جلوہ عالم نما' جو1911ء میں جے پور سے شائع ہوا۔ تیسرا ترجمہ 'گنجینہ معرفت' شنکر دیال نگار کا کیا ہوا ہے جو1915ء میں کانپور سے اشاعت پذیر ہوا۔ منثور تراجم میں مسودے کی شکل میں حکیم جگن ناتھ پرساد کا میں 1951ء کیا ہوا ترجمہ موجود ہے۔ ایک اور نثری ترجمہ گوپی ناتھ غمگین نے 1943 میں کیا۔ یہ بھی غیر مطبوعہ اور نایاب ہے۔ راجستھان کے گنگا سہائے نے بھی نثر میں گیتا کو اردو میں ڈھالا(6)۔

شیرانی کے پیش کردہ منشی پنالال بھارگو کے ترجمے سے یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

عجب ہی سفر ہے یہ سنسار ارجُن
ذرا دیکھ تو اس کا بستار ارجُن

ورق ہائے دید اس شجر کے ہیں پتے
سمجھتے ہو وہ کس شجر کے ہیں پتے

حقیقت جو اس بھید کی جانتے ہیں
حقیقت وہی وید کی جانتے ہیں

سنبھالی کمان ارجنِ خوش سیرّ نے
تو باندھی کمر اپنی فتح و ظفر نے

کہا یہ سری کرشن سے اُس نے دیکھو
چلو بیچ میں لے چلو میرے رتھ کو

میں دیکھوں کہ ہے کون میرا مقابل
سمجھتا ہے اپنے کو ایسا قابل

ہیں آئے ہوئے کون کون اس کے یاور
ہیں وہ کیسے جری اور دلاور

سری کرشن مہاراج نے رتھ کو ہانکا
دکھایا وہیں آکے نقشہ وہاں کا

کہا ہے ادھر تو یہ سینا تمہاری
ادھر کوروؤں کی جماعت ہے بھاری

زبردست ان میں تو بھیشم ہے سب سے
زبردست ڈرتے ہیں جس کے غضب سے

ورونا کو دیکھو سب کے گرو ہیں
تنو مند استادِ فن جنگ جو ہیں

ہیں دونوں طرف ہی یگانے تمہارے
کھڑے ہیں پئے جنگ و پیکا سارے

نہ میں ان پہ حربہ نہ حملہ کروں گا
یہ ہتھیار بھی ہاتھ سے ڈال دوں گا

یہ کہہ کر وہیں با دلِ غم رسیدہ
بہت مضطر و ششدر و آب دیدہ

وہ جا بیٹھا گوشے میں رتھ کے نرالا
دھنش ہاتھ سے اپنے ارجُن نے ڈالا

جو دیکھی یہ حالت سری کرشن جی نے
لگے کہنے اچھے نہیں یہ قرینے

تم ارجن ذرا دل میں سوچو بچارو
نہ ہو ایسے مایوس ہمت ہارو

نہ زیبا ہے تم کو کبھی ایسا کہنا
نہ لازم ہے پامالِ اندوہ رہنا

نہیں بزدلی ایسے موقعے پہ شایاں
دکھاؤ کوئی اپنا کارِ نمایاں

دلیرانہ مردانہ میداں میں آؤ
شجاعت کے ہمت کے جوہر دکھاؤ

بھارگو کا ترجمہ ان تراجم میں شامل کیے جانے کا استحقاق رکھتا ہے جنھیں ہم اچھے ترجمے کہہ سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مترجم کو اردو پر خاصی دست رس حاصل ہے اور انھوں نے اسی لسانی قابلیت کے سہارے جگہ جگہ برمحل استعاروں، محاورات اور تراکیب کا صحیح استعمال کیا ہے۔

پریم ناتھ شاستری کا 346 صفحات پر محیط یہ ترجمہ کسی بھی طرح اردو زبان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر چہ اسے نستعلیق رسم خط ہی میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں استعمال شدہ زبان کو ہندی بلکہ شدھ سنسکرت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی ادبی کوشش کو بہر حال قارئین کو گمراہ کرنے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس نام نہاد ترجمے سے مثالیں دینا بے کار کی بات ہوگی البتہ قارئین کو بھی کم از کم اس بات کا علم ہو کہ ترجمے میں کس قبیل کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ پہلے شاستری کی اردو (؟) نثر کا یہ نمونہ دیکھئے:

''بھگوت گیتا کی سینکڑوں ٹیکائیں اتھوا ترجمہ ہونے پر پربھی یہ بھگوت گیتا اس لیے پرکاشت کی گئی ہے کہ کئی پاٹھک ایسے بھی ہیں جو سنسکرت اتھوا دیوناگری لپی کا گیان نہیں رکھتے ہیں۔ جنہیں صرف اردو کی مہارت ہے۔ وہ بھی گیتا کا پاٹھ کر سکیں۔ چونکہ سنسکرت کی نسبت اردو میں ماترائیں کم ہیں اس لئے سنسکرت شلوک اردو میں صحیح روپ میں نہیں لکھے جا سکتے ہیں۔ اردو شلوک صحیح روپ میں پڑھے جا سکیں اس لئے ہم نے سنسکرت شلوک پد چھید کر کے لکھے ہیں۔ کہیں کہیں پد چھید نے کے لیے ویاکرن کی مریادا سے بھی باہر جانا پڑتا ہے تا کہ اردو صحیح روپ میں لکھا جا سکے۔ اس لیے گیتا کا پاٹھ کرنے کے پشچات اوش پڑھیں''۔

اوراب اس بے معنی اور بے اثر ترجمے سے یہ اقتباسات دیکھیں:

۔ اس اوناشی، اپرمی یہ، نتیہ سروپ، جیوآتما کے یہ سبھی شریر ناشوان کہے گئے ہیں۔اس لیے ہے بھرت ونشی ارجن! تو یدھ کر!

۔ ان ان بھن کاماؤں کے کارن جن کا گیان نشٹ ہو چکا ہے اور جو اپنے سوبھاو کے ادھین ہو چکے ہیں، ایسے اگیانی لوگ بھن بھن ودھی نیموں کے مطابق دوسرے دیوتاؤں کے شرن جاتے ہیں۔

۔ میں شستروں میں وجر اور گیوؤں میں کام دھینو ہوں۔شاستروں میں کہی ہوئی ریتی سے سنتان اتپن کرنے والا کام دیو ہوں اور سرپوں میں سرپ راج واسوکی ہوں۔

بھگوت گیتا کے اس ترجمے کے ساتھ نہ تو ناشر ہی کا پتہ درج ہے اور نہ ہی اس کی تاریخ اشاعت کا ذکر ہے۔سوال یہ ہے کہ ایک گمنام ناشر نے یہ ترجمہ کیوں چھاپا اور اگر چھاپا بھی تو اس کا کیا مقصد تھا؟

اس ترجمے کو قاری کسی بھی زبان سے تعبیر تو کرسکتا ہے لیکن اسے بہر صورت اردو زبان کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

ڈاکٹر کیول کرشن ریشی کا ترجمہ سارے کا سارا دیوناگری خط میں لکھا گیا ہے اور قاری کو گمراہ کرنے کی غرض سے اسے اردو کا ایک فصیح نام یعنی "شمع حقیقت" دیا گیا ہے۔مترجم نے اولین صفحے پر دعوی کیا ہے کہ یہ گیتا کا منظوم اردو ترجمہ ہے جو حقیقت کے عین منافی ہے۔2003ء میں شائع ہونے والی تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب کسی بھی صورت میں اردو ترجمہ کہلائے جانے کی درخور نہیں کیونکہ ترجمہ بھی سنسکرت اور ہندی کے ناقابل فہم الفاظ سے بھرا پڑا ہے اگرچہ اردو کا ترجمہ اردو زبان کے جان کاروں کی خاطر ہی کیا جاتا ہے۔

یہ چند ٹیڑھے میڈھے اشعار سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ ریشی کا نام نہاد

ترجمہ کیا اردو کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے؟:

کہ بن تیرے یہ لا محدود جلوہ
کسی نے کبھی پہلے نہ دیکھا

سبھی جلوؤں میں جلوہ آپ کا ہے
ہر اک جانب سے ہے میرا نمسکار

ملے گی وہ جہاں کی تجھ کو شاہی
میں پاؤں دیوتاؤں کا بھی رتبہ

سروانند کول پریمی (1924-1990) ایک نیک خصلت کشمیری شاعر اور ادیب تھے جنھیں یکم مئی 1990ء کو جنوبی کشمیر میں ان کے آبائی گاؤں صوف شالی ضلع اسلام آباد میں بے رحم بندوق برداروں نے قتل کیا۔ اس طرح کشمیری ادب اور ثقافت کی دنیا ایک اور قلم کار سے محروم ہوگئی۔ پریمی ہمارے پرخلوص دوستوں میں تھے اور ان کی ہلاکت سالہا سال تک ہمارے دل اور ذہن کو مغموم کرتی رہے گی۔

پریمی نے بھی بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جس میں انھوں نے دیگر ترجمہ کاروں کے برعکس گیتا کے فلسفے اور اس کے پس منظر میں مہابھارت کی مرکزی کہانی سے استفادہ کرنے کے ساتھ کئی اختلافات کو بھی دلائل کے ساتھ واضع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پریمی نے گیتا کے علاوہ رامائن، ٹیگور کی گیتا نجلی، ٹیگور ہی کی کہانیوں اور روسی لوک کتھاؤں کے کشمیری اور اردو تراجم کے ساتھ ساتھ کئی کشمیری شاعروں پر مختصر کتابچے بھی قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے ایک مبسوط اور جامع پیش نامے میں ہندو دھرم کے عقائد اور فلسفوں کی بھرپور انداز میں وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اس ترجمے کے بارے

میں لکھتے ہیں: ''مجھے خوشی ہے کہ ایسی سلیس، شائستہ اور سادہ زبان میں گیتا کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ہر سطح کے لوگوں کے لیے مفید ہے۔ گیتا کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ عظیم صحیفہ کسی ایک مذہب کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔ ہاں! میں یہ عرض کروں کی گیتا کے فلسفے نے ہندوستانی مسلمانوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جتنے منظوم اور اور منثور ترجمے اردو میں گیتا کے ہوئے ہیں کسی اور زبان میں نہیں ہوئے''۔(7)

البتہ رام پرکاش راہی نے اپنی اختلافی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس ترجمہ کا یہ تجزیہ کیا ہے: ''نثری تحریریں ایک برجستہ اسلوب کی حامل ہیں، معلومات کے منظر نامے ہیں اور اپنی دلچسپ پیرائیگی کی بدولت قاری کو اس شعری اظہار کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ جو منظوم ترجمے کی صورت میں مصنف کا نصب العین رہا ہے، منظوم ترجمے کی اس خوبی سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ گیتا گیان کی معنویت کو مکمل حالت میں میں پیش کیا گیا ہے لیکن شعری فصاحت اور فنی لوازمات کے کچھ ایسے ناگزیر سے پہلو ہیں جن کے ساتھ شاعر پورا انصاف کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ کتابت کے سہو در آئے ہوں لیکن اشعار کا مجموعی رنگ و آہنگ زیادہ موثر نہیں ہے''۔(8)

سروانند کول پریمی کے ترجمۂ گیتا سے یہ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

جو کوئی پیدا ہوا مرنا اسے ہے مان لے
جو مرا جینا اسے پھر ہے یہ ارجن جان لے
راز پوشیدہ ہے سارا اس کا اک یہ کھیل ہے
پھر نہیں جائز ہے یہ غم یہ برا ہی فعل ہے
ہیں جو گیانی عقل ان کی قائم رہتی ہے سدا

ہیں نہیں گیانی جو ان کی عقل مرتی ہے سدا
رات دن بس عیش و عشرت میں لگے رہتے ہیں جو
عقل گم ہوتی ہے ان کی حق سے ہیں محروم وہ
کرم کر اے نیک ہر دم یہ تیرا ادھیکار ہے
پھل کی خواہش چھوڑ دے تو تیرا بیڑا پار ہے

رام پرکاش راہی نے جو تنقیدی جملے پریمی کے ترجمے پر کہے ہیں ان سے بہت حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے کیونکہ پریمی کے ترجمے میں بحر اور وزن کا پورا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ایسے بے شمار اشعار ہم نے یہاں پر نقل نہیں کیے ہیں اور ترجمہ لاتعداد ٹھیٹھ سنسکرت اور ہندی لفظوں سے بھرا پڑا ہے جن کے متبادل معیاری الفاظ اردو میں آسانی سے موجود ہیں۔

صلو چودھری نے گیتا کا بہت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں چودھری نے غالباً پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ علامہ اقبال بھی گیتا کا ترجمہ کرنے کی خواہش رکھتے تھے: ''اردو زبان میں سب سے پہلے ترجمہ سترہویں صدی میں سید متین نامی ایک شخص نے کیا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترانۂ ہندی 'سارے جہاں سے اچھا' کے خالق ڈاکٹر سر محمد اقبال نے فیضی کے ہاتھوں ہوئے 'بھگوت گیتا' کے فارسی ترجمے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس تعلق سے اقبال نے 11 اکتوبر 1921 کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے ایک خط میں صاف طور پر لکھا ہے کہ: ''اگر وقت نے اجازت دی تو میں نے گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے فیضی کے ذریعے کیا ہوا گیتا کا فارسی ترجمہ دیکھا ہوگا۔ کوئی شخص ان کی تحریر کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے متن اور طرز نگارش کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ فیضی گیتا کی روح کو

سمجھ نہیں پائے‘‘ ۔(9)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال بھی سری کرشن کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ’’اسرار خودی‘‘ کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں: ’’بنی نوع انسان کی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔ اس عظیم شخصیت نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں پیغام عمل دیا ہے جو اقتضائے فطرت ہے اور استحکامِ زندگی کا ضامن‘‘۔

اقبال کے ہم عصر مولانا ظفر علی خان نے بھی ان اشعار میں کرشن جی کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

سری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں
اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں
وہ جور و ظلم کی بنیاد ڈھانے آیا تھا
میں اس کی رسم کو دنیا میں عام کرتا ہوں

ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے صلو چودھری کے ترجمے کے حوالے سے اپنی رائے یوں دی ہے: ’’بھگوت گیتا کے اردو تراجم کے تعلق سے عرصہ دراز سے ایک ایسے ترجمے کا انتظار تھا جو بہت عام فہم اور بہت آسان زبان میں ہوتا کہ کم سے کم درجے کا پڑھا لکھا اور ادنی اسمجھ رکھنے والا انسان بھی گیتا کے پیغامات کو سمجھ سکے۔

’’محترم صلاح الدین چودھری نے، جنھیں صلو چودھری کے نام سے جانا جاتا ہے، بھگوت گیتا کا ترجمہ آسان ترین اور روزمرہ کی زبان میں کردیا ہے۔ یہ کارنامہ بلاشبہ قابل قدر بھی ہے اور لائق رشک بھی‘‘ ۔(10)

چودھری نے اپنے ترجمے کے لیے ایک چھوٹی بحر کا انتخاب کرکے جس عام فہم اسلوب میں اسے اردو نظم میں پیش کیا ہے اس نے واقعی اس کاوش کو کئی دوسرے اردو تراجم کے مقابلے میں ایک انفرادیت اور فنی برتری بخشی ہے۔

بھگوت گیتا کے بے شمار اردو ترجم میں اسے واقعی بہتر اور پر اثر قرار دیا جا سکتا ہے۔ نمونے کی خاطر چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں تا کہ چودھری کی فن شناسی کا اندازہ ہو سکے:

وہ قطرہ سمندر ہی کہلائے گا
سمندر میں شامل جو ہو جائے گا
سب آشائیں ہو جائیں گم سینے میں
تو حاصل اسے ہو خوشی جینے میں



اجالوں سے بڑھ کر اجالا ہے وہ
وہی سب سے اتم نرالا ہے وہ
دکھاتا ہے بھگتی کا جو راستہ
وہ ہے گیان داتا وہ پرماتما



نہ ہے اُس میں آشا نراشا نہ آس
مگر خوبیاں ساری ہیں اس کے پاس
کسی سے نہ ناتا مگر سب کا وہ
نہیں ایسا گُن جو کہ اس میں نہ ہو



ہے من میرا کمزور دل نرم ہے
بتائیں مجھے کیا میرا دھرم ہے
میں چیلا ہوں مجھ پر دیا کیجئے
بھلائی کا رستہ مجھے دکھا دیجئے

وہ ہے سب میں موجود سب سے جدا
کسی میں چھپا ہے کسی میں کھلا
وہ پیارا ہے ایسا نہ سمجھے کوئی
وہی پاس ہے دور بھی ہے وہی

حوالہ جات:

(1) شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ، شیخ امین الدین پرنٹر و پبلشر، لاہور۔
(2) شریمد بھگوت گیتا، خلیفہ عبدالحکیم، ہریانہ اردو اکیڈمی، چنڈی گڑھ، 1995ء، ص 12-11
(3) نسیم عرفان، آدرش کتاب گھر، دہلی، 1955ء۔ ص 5
(4) حسن الدین احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1975ء ص 10
(5) دل محمد، ص 52
(6) ہماری زبان، نئی دہلی، 8 نومبر 2015
(7) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے 26 نومبر 1993 کو مرحوم پریمی کے صاحبزادے راجندر پریمی کے نام تحریر کردہ مکتوب۔
(8) ماہوار ہماری زبان، نئی دہلی، اکتوبر 1994
(9) بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ، ملینیم آفس، 67 تھیٹر روڈ، کلکتہ، 2013ء، ص 14
(10) ایضاً، ص 16



والٹر لارنس اور کشمیر

اُنیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی ممالک سے کئی ایسے دانشور، سیاح اور تاریخ دان کشمیر آئے جن میں سے اکثر و بیشتر نے سرزمین کشمیر کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ ان کی تحریروں میں یہ خوش آئند بات ہر صفحے پر جھلکتی ہے کہ انھوں نے تذکرۂ کشمیر کے حوالے سے ہر بات کو ایک صحیح تناظر میں دیکھ کر اُس پر اپنے ضمیر کی روشنی میں خیال آرائی کی۔ اس عمل میں اگرچہ انھیں کئی مقامات پر اہل کشمیر کی اُن خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی منظر عام پر لانا پڑا جو آج بھی اُن میں موجود ہیں، لیکن اس ''چرب دست، تر دماغ اور نجیب'' قوم کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بار بار دہرانے سے بھی انھوں نے کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالخصوص تاریخ کشمیر کے تعلق سے آج بھی اہل کشمیر ان ہی مستشرقین کی تصانیف کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور مقامی طور پر یا ہندوستان میں تحریر کردہ کشمیر کی تواریخی کتابوں کو مقامی لوگ تعصب، تنگ نظری اور لاعلمی کی بھرمار کے پیش نظر درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔

سر والٹر لارنس نے اگرچہ نیو اور وگنے کی کشمیر پر تصانیف کی سراہنا کی ہے لیکن اُن کی اپنی کتاب ''کشمیر کی وادی'' ہمارے خیال میں کشمیر اور کشمیریوں کے رہن سہن، عادات و اطوار اور ان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی دلکش آئینہ دار ہے۔

لارنس 9 فروری 1857ء کو مورٹین کورٹ انگلستان میں پیدا ہوئے اور

1944ء میں لندن کے قریب ایک علاقے میں انتقال کر گئے۔ لارنس کی وفات کے سلسلے میں اگرچہ اُن کے آبائی وطن برطانیہ میں کسی خاص غم واندوہ کا اظہار نہیں کیا گیا اور نہ ہی کشمیر میں اُن کے قیام اور کام کی مسلمہ حیثیت کو مقامی طور پر دہرایا گیا، لیکن برطانیہ ہی کے ایک کثیر الاشاعت اخبار ''لندن ٹائمز'' نے لارنس کا جو تعزیت نامہ شائع کیا وہ اس ممتاز ماہر علومیات اور نباض قلم کار کو ایک لافانی حیثیت بخشنے کے لیے ایک اہم دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ ''لندن ٹائمز'' کی روزانہ اشاعت اس وقت 4 لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہ اخبار لارنس کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''سر والٹر لارنس ایک قابل شخص تھے جس نے اپنی طویل اور اعلیٰ سرکاری زندگی کے دوران بہت سے اہم عہدوں پر اپنی خدمات قابلیت اور امتیاز کے ساتھ سرانجام دیں۔ انڈین سول سروس میں انھوں نے ایک بندوبست کے کمشنر کی حیثیت سے اپنی قابلیت کا شاندار مظاہرہ کیا اور اگر وہ واپس انگلستان نہ آجاتے تو اُنھیں یقیناً کسی ہندوستانی صوبے کا سربراہ بنایا جاتا۔ لارنس کا پرانا دوست لارڈ کرزن وائسرائے ہند مقرر ہونے کے بعد انھیں اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنا کر واپس ہندوستان لے گیا۔ کشمیر میں بندوبست اراضی سے فارغ ہونے کے بعد اگر انھیں اپنے ہمہ جہت کام میں سے کسی بھی شغل سے فرصت اور تسکین حاصل ہوئی تو ٹائمز میں کئی سال تک ہندوستان میں اپنے تجربات کے بارے میں مضامین لکھنے سے ہوئی جس سے بہتر اس موضوع پر کسی اور اہل قلم نے ہمارے لئے بہتر مضامین نہیں لکھے''۔

1885ء میں جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ کشمیر میں تخت نشین ہوا تو اس نے دیکھا کہ ریاست کا مالیاتی نظام بکھرا ہوا تھا۔ اس نظام میں رشوت ستانی اور نااہلی کے عناصر داخل ہو چکے تھے، جنھوں نے اسے ناکارہ اور کسی حد تک بے کار

بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔ جہاں تک زمینوں کا تعلق ہے، اس سلسلے میں ایسا ریکارڈ اور نقشہ جات ناپید ہی تھے جن سے یہ معلوم ہو جاتا کہ کس شخص کے پاس کتنی زمین اس کی اپنی ملکیت کی شکل میں موجود ہے۔ بقول بامزئی جب کوئی پٹواری یا دیہات کا منشی کسی بھی گاؤں میں داخل ہوتا تو اس کے پاس پھٹے پرانے کاغذ کے پرزوں یا بھوج پتر پر اس گاؤں کے مکینوں کی زمینوں کی تفصیلات درج ہوتیں، جنھیں وہ اپنے پھرن کی گہری جیبوں میں چھپا کر رکھتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پٹواری عام طور پر اس قسم کے تین کاغذات اپنے پاس رکھتے۔ ایک اپنے لیے جو قریب قریب صداقت پر مبنی تھا۔ دوسرا کاغذ تحصیل دار کے لیے رکھا جاتا تھا اور تیسرا کسانوں کو دکھایا جاتا تھا۔ اس زمین کی حد بندی صحیح طریقے پر نہیں کی جاتی بلکہ اس کے رقبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا تھا کہ کس زمین میں کاشت کے لیے کتنا بیج درکار ہے؟ اس ناقص نظام کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی تھا کہ اثر ورسوخ والے کاشت کاروں کی زمینوں کے لیے کم مقدار کی بیج کا اندراج کیا جاتا کہ وہ کم فصل کے بدلے میں بہت ہی کم ٹیکس کی ادائیگی کرتے، جب کہ اُن کے نادار اور غریب ساتھیوں کو اس لیے زیادہ مالیہ ادا کرنا پڑتا کیونکہ ان کے نام بیج کی اچھی خاصی مقدار درج کی جاتی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ زیادہ بیج حاصل کرنے والے کے پاس زیادہ زمین ہے اور زیادہ زمین پر زیادہ فصل اُگنے کی صورت میں سرکار کو زیادہ مالیہ یا مجوزہ ادا کرنا ضروری ہے۔

اس ساری صورت حال کے ہوتے ہوئے 1889ء میں ریاست جموں وکشمیر دیوالیہ ہو چکی تھی۔ زیادہ فصل دینے والی زمین کو بغیر کاشت کے نظر انداز کیا گیا تھا اور فوج فصل کی کٹائی کے وقت کاشت کاروں کی زمینوں پر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتی اور کھڑی فصلوں کا اچھا خاصہ حصہ ہڑپ کر جاتی۔ نتیجتاً غریب اور محکوم کسان کے پاس مشکل سے پیٹ بھرنے کی خاطر تھوڑا بہت اناج باقی

رہتا، جو جاڑے کی جان توڑ سردیوں میں ان کے پاس مشکل سے موجود ہوتا۔

اُسی سال سر والٹر لارنس کو وادیٔ کشمیر میں بندوبست کا کام تفویض کیا گیا۔ ابھی انھوں نے کام شروع ہی کیا تھا کہ انھیں سرکاری اہلکاروں اور تن آسان شہریوں کی طرف سے زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

اگرچہ یہ کام دو سال قبل ہی اے ونگیٹ کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن سازشوں اور مخالفت کی بڑھتی ہوئی شورش کے پیش نظر انھوں نے اس کام سے اپنا دامن کھینچ لیا۔ لارنس نے اس بہت بڑے فریضے کو بہرحال چار سال کے عرصے میں مکمل کر لیا اور ایسا کرنے میں انھوں نے عزم صمیم کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

لارنس کے کام کا جائزہ لیتے وقت جب مہاراجہ کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی بدولت ریاست کو مالی لحاظ سے کس قدر فائدہ ہوا ہے تو اُس نے اپنے درباریوں کی مخالفت کے باوجود زمینی مالیہ کی 31 لاکھ روپے کی بقایا رقم معاف کر دی۔

اُن دنوں کشمیر میں بیگار کی بدعت جاری تھی جس کی رُو سے ہزاروں بے کس کشمیریوں کو گلگت کے دور دراز علاقوں میں مسلح افراد کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے رسد اور دیگر ساز و سامان پہنچانے کی غرض سے جبری طور پر اس جان لیوا سفر پر ہر سال جانا پڑتا تھا۔ لارنس نے اس غیر انسانی سلسلے کی تفصیلات جان کر اسے بند کرنے کی ٹھان لی۔ ان کے کہنے پر جبری اور بغیر اُجرت کے مزدوری کو بند کیا گیا، لیکن اسے مکمل طور پر ختم نہیں کیا گیا، کیونکہ انتظامیہ کی طرف سے مزدوروں کی باقاعدہ جماعت موجود نہیں تھی، جب کہ لارنس کی ایما پر ایک ہزار باقاعدہ مزدوروں اور دو سو خچروں کو کام پر لگایا گیا اور اس طرح سے ایک مزدور کی ماہانہ مزدوری پانچ روپے مقرر کی گئی۔

اصل میں اس سے قبل ہی حکومت ہندوستان نے مہاراجہ کو اس بات کی

تاکید کی تھی کہ وہ ریاست میں زمینی اصلاحات کا طریقہ رائج کرے تاکہ کاشت کار اور سرکار دونوں کو اس ناگفتہ بہ حالت سے نجات دلائی جائے جو سرکار کے ہر محکمہ پر حاوی تھی۔

لارنس نے اگرچہ دل و جان سے بندوبست اراضی کا تاریخی کام سرانجام دیا، لیکن وہ نظام حکومت بہت حد تک جوں کا توں رہا جو ایک شخصی راج کا خاصہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لارنس کی پیش کردہ عوام پرور سفارشات پر جب موثر طور پر عمل درآمد نہیں ہوا تو ریاست کے لاکھوں عوام معاشی بدحالی اور اقتصادی پسماندگی کی زندگی گزارتے رہے۔ اس حالت میں کشمیری دیہاتوں میں رہنے والے 80 فیصد سے زیادہ لوگ قرض کے بوجھ تلے دبتے ہی گئے۔ اکثر مواقع پر کاشت کار کی زمین فصل کاٹے جانے سے پہلے ہی قرض دار کے حق میں وڈ داری کے عمل کے نتیجے میں منتقل ہو چکی تھی۔

کشمیر آنے سے پہلے ہی سر والٹر لارنس کو اپنے احباب نے تنبیہ کی تھی کہ وہ کشمیر جانے کا ارادہ بدل دے، کیونکہ اس سے قبل کشمیر ہی میں غلام کشمیریوں کے ایک ہمدرد اور حبیب رابرٹ تھورپ کو سرکاری کارندوں نے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کروایا تھا کہ اُس نے محکوم و مظلوم اہل کشمیر کا حالِ زار انگلستان کے اخباروں میں بیان کیا تھا اور ایک مختصر سی مگر ایک عہد ساز **Kashmir: Misgovernment** کتاب تحریر کر کے حکومتی عتاب کو دعوت دی تھی اور اپنی جانِ عزیز کا نذرانہ بے کس اور بے بس کشمیریوں کو پیش کر کے کشمیر کی تحریک حریت کے شہید اوّل کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا، لیکن لارنس کا ارادہ قائم رہا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب **India, We Served** میں لکھتا ہے: ”میرے احباب نے مجھ سے کہا کہ پہاڑوں کے اُن بادلوں میں جن کے پس پردہ ایک خوش کن وادی موجود ہے، مجھے آنکھوں سے بھی اُترنا پڑے گا اور دل سے محو ہونا

پڑے گا۔ میں اگرچہ اس ملک یعنی کشمیر کی صورتحال سے واقف نہیں تھا پھر بھی میں کشمیر کے نام پر ہی اس حد تک عاشق ہو گیا کہ میں نے وہاں کا رُخ کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور احباب سے کہہ دیا، خواہ کچھ بھی ہو، میں بالآخر کشمیر، ہاں ہاں کشمیر جا رہا ہوں''۔

لارنس اگرچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے کہنے پر ہی کشمیر آیا تھا، لیکن بالآخر انھیں یہ دیکھ کر دُکھ ہوا کہ بالخصوص بیگار کی بدعت کے خاتمے کے لیے انھوں نے جو سفارشات کی تھیں اُن سب ہی پر مہاراجہ کے جاہ پرست، عیاش اور راشی درباریوں اور بے ایمان خوشامدیوں کی مداخلت سے عمل نہیں ہو سکا اور اس سلسلے میں خود مہاراجہ کی عجیب و غریب طرزِ زندگی اور عادات و اطوار کا دخل بھی تھا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ ایسی ایسی عادات اور خصائل کا غلام تھا کہ اُن کا ذکر یہاں پر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ ڈوگرہ مہاراجہ خطرناک حد تک ایک کٹر مذہب پرست ہندو تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی انگلستان یا کسی اور غیر ملک کا دورہ نہیں کیا، کیونکہ سمندری سفر کرنا اس کے خیال میں دھرم کے خلاف تھا۔ عام طور پر وہ اپنی پوجا سے پہلے کسی غیر ہندو یا مسلمان کا منہ دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے برعکس ایک گائے کے درشن کرنا اُسے قبول تھا۔ اگر کوئی مسلم اُس کے قالین کے کونے پر اپنے پاؤں رکھتا تو وہ اپنا حقہ توڑ دیتا۔

پرتاپ سنگھ سادھوؤں اور برہمنوں کا مربی تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ کئی بار ہردوار کے درشن کیے بلکہ اُس زمانے میں جب آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے اور کشمیر میں امرناتھ گپھا برف کی چادر تلے دبی ہوئی رہتی تھی، اُس نے امرناتھ کے درشن کے لیے بھی اس دشوار گذار پہاڑی راستے کو عبور کر لیا۔

اُس کے عہد میں کسی بھی برہمن کو موت کی سزا دینا ممنوع تھا اور اگر وہ کسی مجرم کی سزائے موت کے کاغذ پر دستخط کر لیتا تو اُس دن وہ دن بھر کچھ نہیں کھاتا۔

مہاراجہ ایک زبردست قسم کا پیٹو شخص تھا۔ اس کے کھانے کی میز پر چالیس اقسام کی ضیافتیں سجائی جاتیں۔ وہ خمیری روٹی کا دلدادہ تھا اور اس کے ساتھ وہ پوری اور چاول بھی کھاتا تھا۔ اس کے کھانے میں ملائی، دہی اور اچار کا بھرپور استعمال ہوتا تھا۔ وہ دن کا کھانا ایک سے دو بجے کے درمیان کھاتا تھا۔ 5 بجے بعد دوپہر وہ ایک سیر دودھ اور ڈھیر سارا میوہ ہضم کرتا تھا۔ اس کے عشائیہ کا وقت رات گئے دو بجے ہوتا تھا۔ جوانی میں اگرچہ وہ گوشت خور تھا لیکن بعد میں اُس نے گوشت کھانا ترک کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ گوشت کھانے سے اسے ذاتی معالج حکیم مہدی نے منع کیا۔ حقہ کا وہ اس قدر عادی تھا کہ ایک بار کلوروفارم یعنی بے ہوشی کی دوا کے دو گھنٹے بعد ہی اُس نے حقہ طلب کیا اور آرام سے اس کے کش پر کش لگاتا رہا۔ 1894ء میں ایک تجربہ کار ڈاکٹر نے والٹر لارنس سے کہا کہ مہاراجہ اب دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے بعد برابر 30 سال تک زندہ رہا۔ ''کشیر'' کے مصنف ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے یہاں اس قابل تعریف حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اگرچہ تینوں ڈوگرہ مہاراجوں نے اپنے لیے تین تین، چار چار رکھیلیں رکھی تھیں، لیکن وہ اپنی رعایا کے ننگ وناموس کے بارے میں بے حد محتاط تھے۔ اُنھوں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ لوگوں کے گھروں سے کسی لڑکی کو اُٹھا کر لائیں۔ اس تعلق سے اُنھوں نے دیگر ریاستوں کے حکمرانوں کے لیے ایک مثال قائم کرلی۔ آخری ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ سے وابستہ یہ واقعہ بھی یہاں پر یاد دلائیں کہ جب ایک تقریب پر مہاراجہ کے ایک غیر کشمیری دوست نے ایک کشمیری خاتون پر بُری نظر ڈالی تو مہاراجہ نے فوراً اُسے کشمیر سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور دوبارہ اس کے کشمیر آنے پر پابندی عائد کردی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ 40 سال سے زائد عرصہ تک حکمرانی کرنے کے بعد

75 سال کی عمر میں 23 دسمبر 1925ء کو سرینگر میں انتقال کر گیا۔ جب اس کا دَم نکلنے ہی کو تھا تو اُسے محل کے بالائی کمرے سے فوراً نیچے لایا گیا تاکہ اُس کی جان دھرتی ماتا یعنی زمین پر نکل جائے۔ اس کے ساتھ بیرون ریاست سے ایک برہمن کو بلایا گیا جس کے سر سے پیر تک بال منڈوایے گئے۔ مہاراجہ کی ساری ذاتی اشیاء اُسے دی گئیں اور مہاراجہ کی وفات کے بعد اُسے ریاست بدر کر دیا گیا تاکہ وہ دوبارہ اِدھر کا رُخ نہ کرے، کیونکہ وہ اپنے ساتھ مہاراجہ کے تمام گناہ لے کر گیا تھا۔

سر والٹر لارنس کو اگرچہ ایک سرکاری کام کی انجام دہی کے لیے کشمیر بلایا گیا تھا لیکن اس مغربی صاحبِ دل اور انسان نواز دانشور نے اہلِ کشمیر کے بارے میں ایک ایسی بے مثال تخلیق دنیا کے سامنے پیش کی جس کی وجہ سے آج بھی لارنس کو کشمیریوں کے جگری دوست اور مخلص حبیب کا مرتبہ حاصل ہے۔

اہلِ کشمیر کے بارے میں جو غلط بیانات اور تبصرے چند غیر ملکیوں نے وقتاً فوقتاً مشتہر کیے، لارنس نے اُن کی نفی میں وادیٔ کشمیر کے عوام کی اصلیت اور انسانی خصائص کا تفصیلی ذکر کر کے ان بے بنیاد باتوں کی تردید کی۔

لارنس اگرچہ اپنے وقت کے مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ کی خصوصیات اور اوصاف کی تعریف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتا، لیکن مہاراجہ کے وقت میں جن مصائب اور مشکلات سے کشمیری عوام گزر رہے تھے اُن کی بھی اُس نے بھرپور وضاحت کر کے اربابِ اقتدار کو اس کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لارنس ایک بے خوف اور نڈر قسم کا شخص تھا جو کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے ضمیر کی آواز بلند کر کے ہی دم لیتا تھا اور اس آواز کا مقصد اگرچہ حاکم اعلیٰ کی تنقید اور حرف گیری بھی تھا تو وہ اسے بیان کرنے میں ایک بہادر اور ایماندار قلم کار کی طرح عمل کرتا۔ لیکن یہاں یہ بات بھی قابلِ ستائش ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اس حق

گوئی کے باوجود لارنس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی، بلکہ کشمیر کے بندوبستِ اراضی میں انھیں تمام سہولتیں فراہم کیں۔

بندوبست اراضی کے سلسلے میں والٹر لارنس کو کشمیر میں اُن بارسوخ عناصر کی طرف سے قدم قدم پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو اس بندوبست کے نتیجے میں عام کشمیری دیہاتیوں کے استیصال کا غیر انسانی عمل جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ لیکن لارنس نے بہرصورت ان اوچھے حربوں کے سامنے کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ کشمیری عوام میں اُن کے محسن اور نجات دہندہ کی شکل میں روز بروز مقبولیت حاصل کرتا گیا اور پھر اسے پیار اور احترام سے ہر جگہ ''لارن صاحب'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

لارنس نے اپنی کتاب کی اوّلین اشاعت یعنی 1895ء میں وادیٔ کشمیر سے متعلق کئی نادر اور نہایت نایاب تصاویر شامل کی ہیں جو اُس تصنیف کے لیے مصنف کے فوٹوگرافی کرنے والے احباب میجر ہیبرن، کیپٹن وِلسن، کیپٹن گوڈ فرے اور عالم چند شامل ہیں۔ عالم چند ریاست کا سرکاری فوٹوگرافر تھا۔ لارنس نے اپنے ابتدائیہ میں ان سبھی کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ چونکہ یہ تصاویر آج سے زائد از سو سال قبل کھینچی گئی تھیں اور ان میں اُس وقت کی مروج تکنیک کا استعمال کیا گیا تھا جو آج عکس بندی کے زبردست ارتقا کے مقابلے میں بے جان سی لگتی ہیں۔

لارنس کی ضخیم کتاب میں چند ایک جگہوں پر ایسے گوشوارے اور اعداد و شمار کے نقشے شامل کتاب کیے ہیں جن کا خاص تعلق کشمیری عوام، اُن کی زبان اور اُن کے رہن سہن کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ہے۔ ان گوشواروں میں اُردو داں دنیا کو کسی قسم کی دلچسپی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا ان اوراق کو بھی درج مقالہ نہیں کیا گیا ہے۔

''کشمیر کی وادی'' اُن بے شمار تصانیف میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے جو مغربی دانشوروں نے اس خوبصورت وادی کے بارے میں وقتاً فوقتاً تخلیق کیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کتاب لارنس کی اُس گہری نظر شناسی کا ماحصل ہے جس کی بدولت انھوں نے اہل کشمیر کی رگ رگ کو پہچان لیا تھا اور اُن کی زندگی کے مختلف رنگوں کو جانچا اور پرکھا تھا۔



(واضع رہے کہ غلام نبی خیالؔ نے لارنس کی اس شہرہ آفاق کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ پانچ سو ستاسی صفحات پر مشتمل اس کتاب کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، نے 2014ء میں شائع کیا۔ ناشر)



سی، ایل۔ ٹنڈیل بسکو

کشمیر میں تعلیم کا مہم جو مبلغ

دُنیائے مغرب سے خاص کر انیسویں صدی عیسوی میں جو مستشرقین، سیّاح، تاریخ دان، آثارِ قدیمہ کے ماہرین، عیسائیت کے مبلغ اور اہل دانش و بینش وقتاً فوقتاً واردِ کشمیر ہوئے، اُن میں سے اکثر و بیشتر نے اپنے رشحات قلم، سفرناموں، یاد داشتوں اور تاریخ کی تصانیف میں اس خطۂ ارضی کے حسنِ فطرت، قدیم تاریخ، انسانی خصائل و کردار، سیاسی کوائف، سماجی رسوم و رواج اور شخصی راج کے تحت اہل کشمیر کی نکبت و افلاس کی درد بھری داستانیں واضع طور پر بیان کی ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے بارے میں ان تحریروں کی عالمی سطح پر خاصی پذیرائی ہوئی ہے اور انھیں بے لاگ اور بہترین اظہار خیال کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں مصنّفین نے انتہائی غیر جانبداری اور ذاتی مُشاہدے کے پیش نظر وہ حالات و محسوسات صفحۂ قرطاس پر درج کیے ہیں جو بعض اوقات کشمیری قوم کے لیے باعث اضطراب بھی بنے ہیں لیکن ان اہالیان قلم نے اپنی حق بیانی میں کسی مصلحت یا ذاتی تعصب کا اظہار نہیں کیا ہے جیسا کہ تاریخ کشمیر کے حوالے سے گزشتہ چھ سات دہائیوں میں سارے برصغیر میں حقائق کو مسخ کرنے اور اہل کشمیر کو ہر طرح ہدف تنقید بنانے کا ایک کشمیر دشمن سلسلہ جاری رکھا

گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی تاریخ میں سیاسیات، سماجیات، اخلاقیات، ادبیات، تہذیب اور ثقافت کے کئی حقائق ابھی تک حقیقت بیانی اور صحیح تحقیق و تلاش کے نتیجے میں واضع نہیں ہو سکے ہیں۔

ان درجنوں مغربی اہالیان قلم میں جنھیں سب سے زیادہ شہرت کشمیر میں نصیب ہوئی وہ ''کشمیر کی وادی'' کے مصنف سر والٹر لارنس اور کشمیر میں جدید تعلیم کے علم بردار ٹنڈیل بسکو ہیں۔ مقامی طور پر اسی مقبولیت کے نتیجے میں انھیں لارن صاحب اور بسکٹ صاحب کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔

اس کی خاص وجوہات یہ ہیں کی جہاں لارنس نے کشمیریوں کی زبوں حالی اوران کی پس ماندہ زندگیوں کا حال مفصل طور پر بیان کیا وہاں بسکو نے ایک پادری کی حیثیت میں کشمیر آکر یہاں تعلیم کے شعبے میں ایک انقلاب بپا کیا۔ جس کی تفصیلات اس نے خود اپنی کتاب **Kashmir in Sunlight and Shade** میں بیان کی ہیں۔ اس مقدس مشن کو آگے بڑھانے میں بسکو نے لاتعداد مصائب اور مشکلات خاص کر توہم پرست اور جاہل کشمیری برہمنوں (پنڈتوں) کے ہاتھوں جھیلیں۔ پھر بھی اس کے صبر و استقلال میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اس حوالے سے وہ بیان کرتا ہے: ''یہ برہمن لڑکے اُن سرکاری کارندوں کے بیٹے یا پوتے تھے جنھوں نے سالہا سال تک کشمیری کاشتکاروں کو گذشتہ برسوں میں اپنے استبداد اور ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ شہر میں ان استیصالی عناصر کے بڑے بڑے مکانات اور بے حساب دولت اس بات کی صاف گواہ تھی کہ انھوں نے کس طرح لوٹ مار سے یہ سب کچھ حاصل کیا تھا کیونکہ جو تنخواہیں انھیں سرکار سے ملتیں وہ اس ٹھاٹھ باٹھ کے لیے بہت کم تھیں۔ ان کے والدین نے انھیں اسی غرض سے سکول بھیجا تھا کہ وہ بھی سرکاری ملازمتیں حاصل کریں اور اپنے بڑوں کی طرح رشوت ستانی کا بازار گرم کریں۔ انگریزی زبان پر عبور

حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آبا و اجداد سے بھی زیادہ مرتبہ پا سکتے تھے۔

''اب اس بے ہودگی پر کیسے قابو پایا جا سکتا تھا؟

''یہ صرف اسی طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ انھیں غلط سے نفرت اور صحیح سے محبت کرنا، زور زبردستی کی مخالفت اور کمزوروں سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ یعنی اس کے سراسر برعکس زندگی گذارنے کی ترغیب دی جائے جو اُن کے بزرگوں نے بسر کی تھی''۔

مزید برآں بسکو نے اپنے مشن کے تحت چلائے جانے والی تمام درس گاہوں میں نصابی تعلیم کے علاوہ مہم جوئی، کھیل کود، سڑکوں کی صفائی، سیلاب زدگان اور وبائی بیماریوں کے شکار لوگوں کی امداد اور کشتی رانی کی سرگرمیوں کو بھی بڑھاوا دیا اور اپنے عملے کے افراد اور طلبا کو مشکل ترین مہمات اور دریائی کھیلوں اور دوڑ کے مقابلوں میں پے در پے شامل کر کے مقامی تعلیم یافتگان کو بھرپور زندگی جینے کا بھی درس دیا۔ وہ اسی تصنیف میں مُہمات کے باب میں کہتا ہے:

''اپنی ساری مہمات کے دوران ہم ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ہر دن کا بھرپور استفادہ کریں اور نئی نئی باتوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ مقصد یہی تھا کہ ہمارے طلبا کی آئندہ نسلیں شجاعت اور ہمت کی مالک بن سکیں۔ اس سے قبل کسی طالب علم کے باپ نے ایسی مہم بازی نہیں کی تھی لہازا ہماری خواہش کے مطابق نئی نئی باتوں کو وجود میں لانا تھا''۔

اس دور میں خاص کر کشمیری برہمن طبقہ دریا میں کشتی رانی کو ایک حقیر کام تصور کر کے اس سے ہمیشہ کنی کترانے کے لیے بہانے بناتا تھا۔ بسکو نے اس فرسودہ نظریے کو رد کرنے کی غرض سے اور طلباء میں حرارت اور عمل سے بھرپور زندگی کا جذبہ ابھارنے کے لیے کشتی رانی کو متحرک طرز حیات کا ایک لازمی جز قرار دیا۔ باوجود اس کے کہ اس کوشش میں اس کی راہ میں بار بار روڑے اٹکائے

گیے مگر اپنی دھن کا پکا یہ مغربی ماہر تعلیم مشنری اپنے ہر اس عمل میں آخر کار کامیابی سے ہم کنار رہوا جس کا بنیادی مدعا کشمیری طالب علموں اور اساتذہ کے دلوں پر دوسروں کے تیئں ہمدردی، کمزوروں کے ساتھ رحم دلی اور حیوانوں تک کی حفاظت کے محسوسات کو ثبت کرنا تھا۔ اس کی نظروں میں یہ سب اسی وقت ہوسکتا تھا جب اس کے عملے اور مدارس کے طلبا جسمانی طور پر تندرست اور چوکنے ہوں۔

سیسل ایرلی ٹنڈیل بسکو 9 فروری 1863 کو انگلستان میں پیدا ہوا۔ 1890ء میں وہ کشمیر آیا اور آتے ہی یہاں جے۔ ہنٹن نو ولز سے مشن سکولوں کی نگہداشت کا فریضہ سنبھالا۔ پادری بسکو یکم اگست 1949ء کو انتقال کر گیا۔ اس کی موت روڈیشیا افریقہ میں واقع ہوئی۔ سری نگر میں فتح کدل کے مقام پر جس جگہ مشن سکول کا کچھ حصہ راستے کی کشادگی کی وجہ سے منہدم کیا گیا تو اُس جگہ ایک نیا پل تعمیر کیا گیا جس کے افتتاح کی تقریب پر شیخ محمد عبداللہ نے اسے بسکو پُل کا نام دیا۔ وہاں پر ایک کتبہ بھی نصب کیا گیا جس پر یہ تحریر کندہ تھی:

''عزت مآب پادری سی۔ ای۔ ٹنڈیل بسکو، کشمیر میں تعلیم کا ایک عظیم معمار''۔

بسکو کے وارد کشمیر ہونے کے بعد اس کی مساعی سے سارے کشمیر میں تعلیم کو لوگوں نے ایک نصب العین کی طرح اپنایا اور اس کی سب سے زیادہ توجہ اس بات کی طرف مرکوز ہوئی کہ خاص کر اُن طبقوں کو علم و آگہی کی ودیعت ہو جو مختلف بہانے بنا بنا کر اس ابدی نور سے محروم ہی رہنا چاہتے تھے، اس سعی جمیلہ کا نتیجہ اہل کشمیر نے دیکھا جب ہر فرقے کے نوجوان اس میدان میں آگے بڑھنے کی تگ و دو میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد کرنے لگے۔

بسکو کے وقت میں یا اس کے بعد سری نگر میں تین سکول سب سے زیادہ

مقبول عام ہوئے۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے خاص طور پر قدیم شہر میں 1866 میں اسلامیہ ہائی سکول کی شروعات ہوئی تھیں جس کی بنیاد مولوی غلام رسول شاہ نے ڈالی تھی۔ اس کے بعد نیشنل ہائی سکول شہر کے وسط میں کرن نگر کے علاقے میں 1932 میں شروع ہوا جہاں زیادہ تر کشمیری پنڈت لڑکے زیر تعلیم تھے۔ بسکو نے جو مشن سکول قائم کیا، اول الذکر دونوں درس گاہوں کے مقابلے میں اس کی شان اور بان برابر قائم ہے۔ اسلامیہ سکول بہت حد تک غیر تعلیمی سرگرمیوں اور ناقص تدریسی نظام کی وجہ سے ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکا۔ 1990ء میں کشمیر میں حالات کے بگڑ جانے کے ساتھ ہی کشمیری پنڈتوں نے یہاں سے ہجرت کی اور نیشنل سکول بھی اس غیر متوقع صورتِ حال سے متاثر ہو کر وقت کے ہاتھوں اپنی ساخت کھو بیٹھا۔

سی۔ ایم۔ ایس کا پہلا سکول دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر فتح کدل میں غریبوں کے علاقے میں ''کشمیری لوک کہانیاں'' نامی کتاب کے مصنف پادری جے۔ ہنٹن۔ نوولز نے قائم کیا۔ اس مرکزی مدرسے کے ساتھ اس سے ملحق سکول رعنا واری، نوا کدل، حبہ کدل اور امیرا کدل میں اور ایک ہائی سکول اننت ناگ میں قائم ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک بسکو نے چھا سکول قائم کیے تھے جن میں طلباء کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ 1912ء میں اسے قیصرِ ہند کا تمغہ دیا گیا۔

کشمیر میں ستاون سال تک بے لوث اور بے لاگ خدمات انجام دینے کے بعد بسکو 9 اکتوبر 1947 کو سری نگر سے چلا گیا۔ اس وقت سارے ملک کشمیر میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سکول کے عملے کے تیس اشخاص نے اس کی گاڑی کو شیخ باغ سے لے کر امیرا کدل کے بس اڈے تک ہاتھوں سے کھینچا۔ اس کے آگے آگے اسکول کا باجا بج رہا تھا۔ اس راستے پر لڑکوں اور سابقہ اساتذہ

نے دو رویہ قطار باندھ کر اپنے اس محبوب رہبر تعلیم کو الوداع کہا۔اس کے بعد جب روڈیشیا میں اس کا انتقال ہوا تو اس سے پہلے وہ بار بار یہ دعا پڑھتا رہتا:

اگر خدا میرا ممد ہے تو مجھے کس سے ڈرنا ہے؟
انسانیت کی خدمت اصل عبادت ہے
تم جس طرح اپنے آپ سے پیار کرتے ہو
اُسی طرح اپنے ہمسائے سے بھی محبت کرو
ایک مچھلی ہمیشہ لہروں کے مقابل تیرتی ہے
ہتھیلی سہلانے کے لیے اور مُکہ لڑنے کے لیے ہیں۔

بسکو کی بیوی کا اس سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔وہ جب بستر مرگ پر تھا تو اس کی بہن اس کی سانس کو درست کرنے کے لیے نزدیک آئی۔ بسکو نے اس سے کہا: ''اب میں ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔آپ براہ کرم جا سکتی ہیں''۔ یہ بسکو کے آخری الفاظ تھے۔

یہ وہ شہر آشوب دن تھے جب برصغیر ہند دو ممالک میں تقسیم ہوا تھا اور بنگال سے لے کر پنجاب تک ہندو اور مسلمان وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے تھے۔ بسکو نے دہلی میں اپنی آنکھوں سے ایک ہزار لوگوں کو قتل ہوتے دیکھا جن میں مختلف مذاہب کے مرد وزن، بچے، بوڑھے، ناتوان، بیمار، بے سہارا اور بے کس غریب اور خواتین شامل تھیں۔ بسکو نے غالباً اسی خون ریزی کے دہشت ناک ماحول سے دور ہونے کی خاطر دہلی کو فوراً خیر باد کہا اور پھر پاکستان سے ہوتے ہوئے واپس چلا گیا۔اگر بسکو کچھ اور دن اس خون آشام ملک میں ٹھہرتا تو وہ غالباً ایک اور کتاب تحریر کرتا جس کے صفحات پر انسانی خون کے دھبے جلی حروف کی شکل میں نظر آ جاتے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں کشمیر ایک شاہی ریاست تھی جس

میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اس پر مہاراجہ اور اس کی ہندو اقلیت راج کررہی تھی۔ مہاراجہ نے کئی معاملوں میں مقامی طور پر مطلوبہ اہل کاروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے برطانوی اور یورپی ماہروں کی خدمات حاصل کیں۔ جب بسکو نے بھی یہاں کے ناگفتہ بہ حالات میں ذات پات کی لعنت کو شعبۂ حیات پر حاوی دیکھا تو اس نے اپنے عیسائی خیالات کے سہارے کشمیری عوام کی حالت سدھارنے کی شروعات کیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنے دوسرے ہم مذہبوں کی طرح یہاں کے لوگوں پر عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے کوئی زور زبردستی نہیں کی۔

رابرٹ تھورپ کی طرح بسکو بھی مظلوم کشمیریوں کی حیوانی زندگی کے جان کاہ مناظر دیکھ کر بے حال ہوتا تھا۔ اس ضمن میں وہ شخصی راج کے بے رحم حکمرانوں اور ان کے مقامی برہمن کارندوں کی بہیمانہ کارروائیوں اور مسلم غربا پر ان کے تابڑ توڑ مظالم پر نوحہ خوان تھا۔ تھورپ کو اسی لیے اُس نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''شہر کے اولین پل امیرا کدل کے پاس شیخ باغ میں عیسائیوں کا قبرستان ہے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں تو رابرٹ تھورپ کے احترام میں اپنی ٹوپی اتارتا ہوں جس نے کشمیریوں کے لیے اپنی جان قربان کی''۔

ایک سرکردہ ماہر تعلیم امرناتھ مٹو نے بسکو کی طرف سے تعلیم کو ایک نئی اور جدید جہت دینے کے بارے میں لکھا ہے: ''آج کل کے تعلیمی اداروں میں طلباء کی کارگزاری کی رپورٹیں اصل میں مسٹر بسکو کی مرہون منت ہیں جنھوں نے پہلی بار کشمیر میں ''کیریکٹر فارم سسٹم'' کو متعارف کرایا جو ہر طالب علم کو سال میں دوبار دیا جاتا تھا یہ کاغذ کا ایک لمبا ورق ہوتا تھا جس میں مختلف اندراجات سے 'جسم'، 'روح اور دماغ' کے عنوانات کے تحت نمبر دیے جاتے تھے۔ مسٹر بسکو

بہ نفس نفیس یہ فارم طلبا کو ان کے فارم ماسٹروں کی موجودگی میں دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ کیا یہ یہ نمبرات صحیح ہیں؟''

اس نئی طرح کے امتحانی تجربے سے بسکو کی مراد یہ تھی کہ طلبا میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور طبعی دنیا کے اندرون میں جھانک کر ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے نکھارا جائے اور انھیں بہتر سے بہترین بنایا جائے۔

والٹر لارنس کی طرح مغرب کے کئی اور کشمیر شناسوں نے بھی اس خطے کے ہر فرقے یا طبقے کے لوگوں کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے ساتھ مختلف آرا جوڑی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کے بیانات کو بہر حال ان کی اپنی صوابدید اور حقائق شناسی پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں ان کی نیت پر شک کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ ہوسکتا ہے کشمیری الاصل نہ ہونے کی بنا پر انھوں نے کہیں کہیں ایسی باتیں بھی کہیں ہونگی جو واقعاتی طور درست نہ ہوں جیسا کہ ہم نے بسکو کی کتاب میں بھی ایسی کئی غلطیاں دیکھی ہیں لیکن اس سے ان کی مراد کسی عقیدے یا مذہب پرستی کی تنقید کرنا مقصود نہیں ہے۔ البتہ ان کی ذاتی آراء کو ان کے اپنے خیالات تک ہی محدود رکھنا برمحل ہوگا۔ مثلاً لارنس کے بقول ''گوجر طبقہ اپنی زندگی کے سفر میں اپنی بھینسوں کی طرح سست ہے''۔ اب کوئی گوجر اس سے شاید خفا بھی ہوسکتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے جس کا مظاہرہ کشمیر کے اس طبقے کی طرز حیات سے قدم قدم پر واضع ہوجاتا ہے۔

اسی طرح مقامی عادات و اطوار سے پوری شناسائی حاصل کرنے کے بعد ہی بسکو کشمیر کے مسلمانوں میں چغل خوری اور غیبت کی بری عادتوں کا ذکر کرتا ہے یا جب وہ کشمیری ہندوؤں کی توہم پرستی اور ان کی فرسودہ سوچ کو ہدفِ تنقید بناتا ہے تو اس کا یہی ایک مدعا و مقصد ہوتا ہے کہ اس قدامت پرست اور زمانے کے نئے تقاضوں سے ناآشنا طبقے کی ظلمات سے روشنی کی طرف رہنمائی کی

جائے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ بسکو کی یہ خواہش بہت حد تک پوری ہو چکی ہے کیونکہ کشمیری پنڈت طبقہ اب یہاں کا ایک تعلیم یافتہ اور مہذب فرقہ کہلایا جاتا ہے۔

کشمیری برہمنوں کے حوالے سے ہی یہاں پر اس بات کا اعادہ کرنا مناسب ہوگا کہ جہاں ان میں سے کچھ نکتہ دان یہ شکایت کرتے ہیں کہ بسکو نے خاص طور پر ان کی سماجی زندگی پر انگلیاں اٹھائی ہیں وہاں یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس طبقے کے تاریخ نویسوں نے اکثریتی فرقے کے بارے میں حقیقت بیانی سے کام نہیں لیا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر میر سید علی ہمدانی کی طرف سے مبینہ طور پر برہمنوں کو بہ زور بازو اسلام قبول کروانے کا افسانہ دوہرایا گیا ہے۔ جو محض ایک مفروضہ ہے جبکہ پریم ناتھ بزاز اور پرتھوی ناتھ کول بامزئی جیسے حقیقت بیان ہندو مورخوں نے بھی اسے واضح الفاظ میں رد کیا ہے اور اس اصل بات کو دوہرایا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں جب حضرت ہمدانی کشمیر آئے تو مقامی ہندوؤں نے اپنی مرضی سے اس بنا پر مسلمان ہونا قبول کیا کہ وہ اور خاص کر ان کی نچلی ذاتوں کے لوگ برہمن پنڈتوں کے ہاتھوں ناقابل بیان جور و جبر اور ظلم و ستم کے مستقل شکار تھے۔ اسلام میں چونکہ ذات پات یا تفرقات کی کوئی گنجائش نہیں ہے لہٰذا کشمیری ہندوؤں نے اس مذہب کو گلے لگایا اور حضرت ہمدانی نے اعلان کیا کہ تبدیلیِ مذہب کے بعد ان لوگوں کو اپنے رتبے کے لحاظ سے اعلیٰ ذات کے برہمنوں کا درجہ حاصل ہوگا۔

نصف صدی سے زیادہ عرصے تک کشمیر میں اپنے قیام کے دوران بسکو نے محسوس کیا کہ مقامی طور پر بالخصوص مسلمان طبقہ ناخواندہ اور پس ماندہ ہے۔ مدارس میں طلباء کی سب سے زیادہ اکثریت برہمن لڑکوں کی تھی جنھیں م والدین تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے لیے پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ

سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض تھے کیونکہ ان عہدوں پر پہلے سے ہی ان کے قرابت دار یا جان پہچان والے قبضہ جما چکے تھے اور خواندہ مسلمانوں کو نوکریوں سے محروم ہی رکھا جاتا تھا۔ اس تناظر میں بسکو نے مسلمانوں کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور انھیں طرح طرح سے تعلیم کی طرف راغب کیا۔ ساتھ ہی اُس نے اس فرقے میں موجود برائیوں اور مختلف عیوب کو دور کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔

بسکو کی بے لاگ محنت کے نتیجے میں جو بسکو سکول اور مشن ہسپتال قائم کیے گئے وہ آج بھی کشمیر کی علمی اور سماجی دنیا میں روشن میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت میں بسکو ہی کو کشمیر میں باضابطہ اور جدید تعلیم و تدریس کا نابغۂ عہد بانی کہلایا جائے گا۔



لداخ کا سفر نامہ

سی ۔ ایل ۔ ٹنڈیل بسکو

یہ 1896ء کے موسمِ گرما کی بات ہے کہ مجھے ڈاکٹر ارنیسٹ نیو کی ہمراہی میں لداخ جانے کا اتفاق ہوا جسے چھوٹا تبت بھی کہتے ہیں۔ سری نگر سے لیہہ تک، جو اُس ملک کی راجدھانی ہے، 224 میل کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ عام طور پر پیدل سفر میں بارہ دن میں طے ہو جاتا ہے جب ایک دن میں سات میل کا سفر طے کیا جائے جس رفتار سے بار بردار قلی یا ٹٹو چل سکتے ہیں۔ کئی جگہوں پر تو یہ سفر بلندیوں پر واقع گذرگاہوں سے ہوتے ہوئے کرنا پڑتا ہے۔

میں اگرچہ ڈاکٹر نیو کے ساتھ نہیں ہو سکا کیونکہ میرے سکول میں میرا کام پڑا تھا البتہ لداخ کے کمشنر کیپٹن شیوینیکس ٹرینچ نے از راہ عنایت مجھے اپنے ساتھ لیا۔ وہ میرے روانہ ہونے سے چار دن پہلے ہی چل پڑا تھا لہازا مجھے اسے پانے کے لیے انتہائی تیز رفتار سے چلنا پڑا۔ میں نے اس طرح پہلے ساڑھے چار مرحلے تقریباً تیس گھنٹوں میں طے کیے۔ جبکہ میں سری نگر سے شکارے میں نصف شب کو روانہ ہوا۔ اسماعیل اور اس کے ساتھی ساری رات آنچار جھیل کو پار کرتے رہے جہاں سے وہ دریائے سندھ کے راستے گاندربل پہنچے جو ہمارا پہلا پڑاو تھا۔

جب میں نے اگلی صبح کو ساڑھے چھ بجے آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنی

پہلی سواری کو مجھے تاکتے ہوئے دیکھا جو غالباً مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جلدی کرو۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اس پر چڑھ گیا۔ یہ ایک خوصورت گھوڑی تھی جو مِس نیومیم نے مجھے عاریتاً دی تھی۔ ہمارا مشنری عملہ بے حد خوش تھا اور غالباً گھوڑی کو بھی اس کا احساس ہوا تھا اسی لیے وہ ایک تیز گام ہرن کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔

ہمارا راستہ ہمیں اوپر کی طرف وادیٔ سندھ میں لے گیا جہاں ہماری دوسری جانب دریا گرجتے ہوئے بہہ رہا تھا۔ یہ موسمِ گرما کے ابتدائی ایام تھے اور جنگلی گلاب برجستہ کھلے ہوئے تھے۔اسی طرح ہر سمت موسم بہار کے پنچ برگہ لالے، گلِ نافہ، گل لالہ، گل میمون، گل زعفرانی اور ایسے ہی کئی اور پھولوں کی برجستگی پورے جوبن پر تھی۔

ہم تیز رفتار سے چل رہے تھے اور قبل اس کے کہ وہ اپنے بلوں میں جا چھپتے ہمارے راستے میں سانپ آگئے۔ دوپہر کے قریب میں اپنے ٹٹو کے ساتھ چلا اور میرا سائیس ایک بہت بڑے اخروٹ کے درخت تلے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سواری بدلی اور سائیس اپنے ٹٹو کو لے گیا۔ میں اب اُس راہ پر گامزن تھا جو چٹانوں سے پُر تھا اور وادی رفتہ رفتہ تنگ ہوتی جارہی تھی۔

کوئی پانچ بجے کے قریب میں نے اپنے سائیس اور تیسرے ٹٹو کو انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ جو مجھے آٹھ میل دور سونہ مرگ میں اس خیمے تک لے گیا جو مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچایا گیا تھا۔ سونہ مرگ ہری گھاس اور پھولوں کا ایک حسین قطعہ ہے جو دس ہزار فٹ کی اونچائی پر اٹھارہ ہزار بلند چوٹیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تین گلیشیر، برفانی تودے، دائیں طرف ان وادیوں کے دہانے پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

سونہ مرگ کے معنی ہیں سونے کی چراگاہ۔ یہ ایک وقت سری نگر کا پہاڑی

مقام تھا۔ یہاں کے باشندے بتائیں گے کہ اس جگہ بہت سارے سانپ موجود ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جن وادیوں پر ہرموکھ پہاڑ کی نظر نہیں پڑتی وہیں پر ان سانپوں کی کثرت ہے۔

اگلے دن اتوار تھا اور میں نے آرام کرنا چاہا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں اپنا سفر نصف شب کے بعد جاری رکھوں گا۔ لہازا میرا خیمہ تیاری کے لیے باندھا گیا تھا۔ میں نے ڈاک خانے کے برآمدے میں سونے کی کوشش کی لیکن کیڑے مکوڑوں نے مجھے باہر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ اس وسط ایشیائی راستے پر ٹڈی دل کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں سونہ مرگ کے ڈاک خانے میں بھی ستایا اور جب ہم روپہلی چاندی رات میں چل پڑے تو میرا نوکر جو ایک سست رفتار مسلمان تھا، مجھے کشمیر کے پرانے بادشاہوں کے قصے سنا سنا کر وقت کاٹنے لگا۔ پھر ہم نو میل کا سفر طے کر چکے تھے اور پو پھٹنے پر ہم بال تل پہنچے تھے جوز وجیلا درے کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ایک بلند درہ نہیں ہے کیونکہ اس کی اونچائی صرف ساڑھے گیارہ ہزار فٹ ہے البتہ یہ ایک خطرناک راستہ ہے کیونکہ سڑک اونچائی کی سمت میں جاتی ہے اور سخت برف اور یخ بستہ ڈھلوانوں پر چلنا نہایت دشوار ہے۔ اس راستے پر کاروان والے کئی ٹٹوؤں کو کھو بیٹھے ہیں۔ میرا بھی ایک ٹٹو پھسل کر نیچے گر گیا۔ لیکن اسے بہر حال بچایا گیا اور میرے سامان کو بھی کم سے کم نقصان پہنچا۔ میں واقعی اس کے لیے اپنے لالچی نوکر کا ممنون ہوں۔

درّے کی چوٹی پر پانی کے ذخیرے کے پاس برف کی چادر میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک یخ بستہ سمندر کی طرح تھی جہاں برف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بٹی ہوئی تھی جن سے گویا لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لہازا ان پر چلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر گرمی کے موسم میں اتنی برف جمع ہو تو ڈاک رسانوں کی

مشکلات کا اندازہ ہوسکتا ہے اور پھر اس شخص کے حالِ بد کا بیان واضع ہے جو گرما میں یہ کام انجام دے۔

یہ کہانی مجھے ایک موراوی مشنری نے بتائی جو لداخ کی راجدھانی لیہہ جارہا تھا تاکہ وہ بمبئی میں اپنی دلہن سے بھی مل سکے۔ وہ موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی اس سفر پر نکلا جو دروں کو پار کرنے کے لیے سب سے سخت ترین موسم ہے۔ جب وہ زوجیلا درے کے قریب پہنچا تو اسے ایک ہوائی طوفان آگھیر لیا۔ اسے جلد ہی پتہ چلا کہ وہ اپنا راستہ کھو بیٹھا ہے کیونکہ تازہ برف باری نے ڈاک رسانوں کا سارا راستہ بند کیا ہوا تھا۔ یہ زبردست سردی کا موسم تھا اور وہ آنکھوں کو اندھا کرنے والی برف میں اپنا راستہ نہیں دیکھ سکا۔ برف کے گالوں کے تھپیڑے اس کے چہرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک راہ تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے جدوجہد کرنا چھوڑ دیا۔ چونکہ رات قریب آرہی تھی، اسے اب زندہ رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اسے خیال آیا کہ اب تو کوئی دعا ہی اسے بچاسکتی ہے اور وہ زور زور سے خدا سے زندگی کی خیرات مانگنے لگا۔

اس نے اپنی مناجات ختم ہی کی تھی کہ اسے ایک انسانی صورت سی نظر آئی جس کے بارے میں اس نے خیال کیا کہ یہ کوئی ڈاک رسان ہی ہوسکتا ہے۔ وہ کسی حد تک شکرانۂ خداوندی کے ساتھ اس صورت کے پیچھے ہولیا لیکن وہ اچانک اوجھل ہوگئی۔ وہ پھر وہیں چلا گیا جہاں اس نے یہ صورت دیکھی تھی۔ یہاں اسے برف میں ایک بڑا سوراخ دکھائی دیا۔ وہ اس میں اُتر گیا جہاں اس نے برف کی ایک پناہ گاہ دیکھی جو غالباً ڈاک رسانوں نے اپنی حفاظت کے لیے بنائی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پناہ گاہ خالی تھی اور وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی دعاؤں کا غیر متوقع طور پر مثبت جواب دیا گیا ہے اور

اس کی زندگی آئندہ خدمات کے لیے بچائی گئی ہے۔

میں جب جون کے مہینے میں اس درّے کو پار کر رہا تھا مجھے میلوں تک پھیلی ہوئی برف کو روند کر چلنا پڑا۔ مجھے اس وقت خوشی محسوس ہوئی جب میری نظروں کے سامنے چٹانیں اور گھاس دکھائی دی۔ میں کوئی ساڑھے تین بجے تک چلتا رہا۔ مجھے زبردست تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور نیند بھی مجھ پر غالب آ رہی تھی۔ کیونکہ میں اس سفر پر گذشتہ شب کو بارہ بجے روانہ ہوا تھا۔ میں اپنے بوجھ بردار ٹٹوؤں سے آگے نکل چکا تھا۔

میں ستانے کے لیے سڑک کے ایک کنارے لیٹ گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرا نوکر مجھے کچھ گھنٹے بعد گھور رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ اور اب ٹٹوؤں اور سامان کے ساتھ کوچ کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ مٹیان کے مقام پر تعمیر کردہ پتھر کے چھوٹے مکان قریب ہی تھے۔ مجھے اس بات سے اطمینان ہوا کہ اب کھانے اور آرام کرنے کی سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے زبردست بارش ہوئی تھی کیونکہ جب ہم اس آرام گاہ میں داخل ہوئے تو ہم نے اسے پانی میں ڈوبا ہوا پایا۔ یہ اس لیے بھی ہوا تھا کہ اس مکان کی بنیاد سڑک کی سطح سے نیچے تھی۔ بہر حال میرے پلنگ کے پایوں تک پانی نہیں پہنچ سکا تھا، میں اس میں بھیگ نہیں سکا اور میں اپنے آپ کو ٹڈوؤں سے بھی محفوظ رکھ سکا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وسط ایشیا کو جانے والی اس سڑک پر اسی طرح کی آرام گاہیں بنائی جاتیں تا کہ راہ گیران میں دورانِ سفر پناہ لے سکتے۔ غالباً میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اب اس شاہراہ پر جگہ جگہ ایسی آرام گاہیں تعمیر کی گئی ہیں مٹیان سے دراس کی پہاڑی وادی کی جانب ایک حرارت بخش سفر تھا۔ یہاں جو ٹیلے سے درخت مجھے یاد ہیں وہ پنسل کی جسامت

کے دیودار تھے۔مٹیان سے آگے کی طرف راستے میں چونے کے خزانے نظر آتے ہیں۔زورزور سے بہتا ہوا دریا گویا ہر شخص کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔میں اپنے ہم سفروں سے چند میل آگے نکل چکا تھا اور میرے پاس نہانے کے لیے کافی وقت تھا۔پھر بھی یہ نہانا کوئی آسان عمل نہیں تھا کیونکہ پتھریلے فرش پر نوکیلے کنارے سے اس طرح کا کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔

میں نے ابھی پانی میں جسمانی راحت کا وقت گذارا بھی نہیں تھا کہ مجھے اپنے قریب ہی دو کالی آنکھیں گھورتی نظر آئیں۔وہ لمبے سیاہ بالوں والے لوگ تھے۔ میں فوراً پانی سے باہر نکل آیا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ میرے کپڑے چرائیں گے۔اگر ایسا ہوتا تو میں اس بے برگ وگیاہ ویرانے میں بغیر کپڑوں کے کیا کرتا؟، جہاں سورج کی تیز کرنیں میرے ننگے بدن میں چھید کر رہی تھیں وہاں کوئی ایسا درخت بھی موجود نہیں تھا جس کے پتوں سے میں اپنا تن ڈھانپ لیتا۔لہازا میں نے گیلے بدن پر ہی جلدی جلدی کپڑے پہنے اور میں ان کالی آنکھوں کو دیکھتا رہا اور میرا ہاتھ اس کوہ پیما چھڑی پر جما رہا جس کے ایک سرے پر لوہے کی نوک لگی ہوتی ہے۔مجھے یہ بھی خیال آیا کہ جب تک میں اپنے جوتوں کے تسمے مضبوطی سے نہ باندھوں مجھے ان سے نبرد آزما نہیں ہونا چاہئے کیونکہ چٹانیں بہت تکلیف دہ تھیں۔یہ دو خوفناک چہرے والے غالباً مجھے اس لیے گھور رہے تھے تاکہ وہ میرے مدد کریں اور ان کے دل میں مجھے لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔میں نے لداخ میں سنا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت ایماندار ہیں اور یہاں کوئی بھی شخص اپنے مال ومتاع کو چرائے جانے کے خوف سے بے خطر ہو کر اسے کسی بھی جگہ رکھ کر کہیں بھی جا سکتا ہے۔

نہانے کے بعد اگلی صبح مجھے کھانے کی طلب ہوئی۔میری بھوک زوروں پر تھی کیونکہ میں نے ناشتہ کئی گھنٹے پہلے کیا تھا۔میری ملاقات لمبی داڑھی والے دو

افراد سے ہوئی جن کے پاس مکئی کی بڑی بڑی روٹیاں تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک روٹی خریدی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انھیں کب سینکا گیا تھا کیونکہ یہ پتھر کی طرح سخت اور بے مزہ تھیں۔ بہر حال میں نے انہیں ایک نالے میں کچھ دیر تک ڈبوئے رکھا جب ہی میں انھیں کسی حد تک حلق سے نیچے اتار سکا۔

بعد میں میں نے چند گاؤں والوں کے ساتھ دوستی کر لی اور وہ بھی خیر سگالی کے اس عمل میں میرے لئے ڈھیر سارا دودھ لے کر آئے۔ میں اُس وقت بے حد پیاسا تھا اور میں نے یہ سارا دودھ غٹا غٹ پی لیا۔ میں ان مہربانوں کے ساتھ تب تک بیٹھا رہا جب تک کہ مجھے اپنا کاروان قریب آتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ اس کے آنے پر ہم نے سفر جاری رکھا اور ہم ایک وسیع اور سرسبز خطۂ زمین پر پہنچ گئے جسے ہوا نے گویا جھاڑو پھیر کر صاف کیا ہو۔ یہاں ہمیں پتھر اور مٹی کے چند مکان بنے ہوئے نظر آئے۔ اس جگہ کو دراس کہتے ہیں جو ملکِ دراس کا صدر مقام ہے۔

یہاں میں نے ایک برطانوی افسر کو پہاڑی بکروں کا شکار کرنے کے بعد واپس ہندوستان جانے کے سلسلے میں ایک خیمے میں مقیم دیکھا۔ میرا خیمہ بھی اسی جگہ نصب کیا گیا۔ میں نے چائے پی لی جس سے مجھے بشاشت نصیب ہوئی کیونکہ میں اس بے برگ و گاہ وادی میں اترائی پر چلتے چلتے نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ دریں اثنا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس سے خوف زدہ ہو کر میں نے خیمے کے ایک کھمبے کے ساتھ اپنے آپ کو چپکایا تا کہیں خیمہ زمین بوس نہ ہو جائے۔ میرا نوکر بھی خیمے کے کھمبے پوری طاقت سے زمین میں زور زور سے دباتا رہا۔ اسی دوران میں نے چیخیں سنیں اور دیکھا کہ برطانوی افسر کا سامان خیمے سے چھیتڑوں کی شکل میں باہر کی جانب اڑ رہا ہے۔ تیز ہوا تھم گئی اور پھر ایک بار ہر طرف سکون اور امن کا ماحول لوٹ کر آیا۔ اب صرف دراس کے آوارہ کتوں

کے بھونکنے کی کرخت آوازیں ہی کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔

اگلے روز ہم کرگل میں کمشنر کے کیمپ میں پہنچ گئے اور وہاں ناشتہ کیا۔ اُس کی جماعت میں ساڑھے چھ فٹ قد والا دیو قامت مسٹر بیچ، اس کی بیوی مسز ڈرّاہ جس کا شوہر ایک نامور کھلاڑی ہے۔ لیہہ میں اس کا انتظار کر رہا تھا، جیک فیلپس اور پی، ایچ چرچ، جو پانگ گانگ کی دس میل لمبی جھیل کی طویل مہم پر تھے اور چانگ چینمو شامل تھے۔ ان لوگوں نے میرا والہانہ استقبال کیا اور میری بھوک کا خیال رکھتے ہوئے ناشتہ پیش کیا۔

کرگل پورک نامی ضلع کا صدر مقام ہے اور یہاں شیعہ مسلمان رہتے ہیں۔ کرنل وارڈ نے ان کے مردوں کی تدفین کے حوالے سے ایک عجیب رسم بیان کی ہے کہ یہ لوگ اپنی میتوں کی قبر پر ایک سوراخ کرتے ہیں جس پر مستری ایک صندوق بناتا ہے جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ اور ایک کھڑکی رکھی جاتی ہے۔ اس سوراخ کے راستے میت پر آٹا ڈالا جاتا ہے، یہ عمل وقفے وقفے سے تین ماہ تک جاری رہتا ہے اور اس کے بعد یہ سوراخ بند کیے جاتے ہیں۔

اُس صبح صوبے کے گورنر نے ہمیں بلایا۔ وہ ایک کوتاہ قد کشمیری برہمن تھا لیکن اپنی چھاتی کے نچلے حصے کی جسامت سے لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کی خوب دیکھ بال کرتا ہے۔ کپتان ٹرینچ نے اس سے کہا کہ وہ اناج کے حساب کتاب کے کاغذات دکھائے کیونکہ وہاں اس موسمِ خزاں میں غلے کی قلت پیدا ہوئی تھی۔ اسے ہدایت ملی تھی کہ وہ ہنگامی صورت حال کے پیش نظر اناج کے بڑے ذخیرے محفوظ رکھے۔ اس غرض کے لیے پہاڑی پر قدیم قلعے کو منتخب کیا گیا تھا۔ حساب کتاب کے کاغذات پیش کیے گئے اور انھیں دیکھ کر کپتان ٹرینچ نے دیکھا کہ ہدایات کو ایمانداری کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے اور قلعہ گورنر کی چھاتی کے نچلے حصے کی طرح اناج سے بھرا ہوا تھا۔ کپتان ٹرینچ خوش ہوا۔ اس نے گورنر سے کہا

کہ اس نے اتنا سارا غلہ کس طرح اس گودام میں محفوظ رکھا تھا اور یہ بھی کہا کہ وہ اسی دن بعد دوپہر تین بجے قلعے کا معائنہ کرے گا۔

ڈھائی بجے گورنر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دوبارہ ہمارے کیمپ میں پہنچا۔ اس نے کمشنر صاحب اور اس کی جماعت کو اُس کے گھر پر چائے پینے کی دعوت دی۔ لیکن اس روز سخت گرمی تھی اور خاص کر خواتین کے لیے کوئی ساڑھے چار بجے کا وقت موزون رہتا۔ کپتان ٹرینچ نے دعوت قبول کر لی لیکن یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ بہر صورت پہلے قلعے کا معائنہ کریں گے اور اس کے بعد چائے کی نشست ہوگی۔ ہم سب پہاڑی پر سے قلعے کے پاس پہنچے۔ جونہی ہم وہاں پہنچے تو گورنر نے کپتان ٹرینچ سے پھر کہا کہ وہ پہلے اس کے گھر پہنچیں اور اس کے بعد ہی قلعے کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ گورنر کی رائے میں گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی اور شام کو سخت سردی ہوگی۔ کپتان ٹرینچ انکار نہیں کر سکا اور ہم سب گورنر کے گھر کی جانب چل پڑے۔

جب ہم بہت بڑے دروازے سے چار پہلو میں داخل ہو گئے تو کپتان ٹرینچ نے گورنر سے پوچھا کہ ذخیرہ کرنے کے گودام کہاں پر ہیں؟ گورنر نے ایک ایک مخصوص دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس نے چپراسی سے چابیاں لانے کو کہا۔ یہ چپراسی دیر تک غائب رہا لہٰذا گورنر نے پھر کپتان ٹرینچ سے کہا کہ دریں اثنا اس کے گھر میں چائے پی جائے۔ تب تک چپراسی چابیاں بھی لے کر آئے گا۔ مگر کپتان ٹرینچ اپنی بات پر اڑا رہا کہ وہ پہلے گوداموں ہی کو دیکھے گا۔ اس نے گورنر سے کہا کہ وہ چپراسی کو فوراً لانے کا انتظام کرے۔ ایک اور شخص کو چپراسی کو لانے کی خاطر بھیجا گیا، آخر کار چپراسی ہانپتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک بڑا گچھا تھا جس سے اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ ہر چابی کو آزماتا رہا لیکن کوئی بھی چابی قفل کے سوراخ میں گھس نہیں سکی۔

گورنر نے پھر چائے کی بات چھیڑ دی اور اپنے چپراسی کی بیوقوفی پر معافی کا خواستگار ہوا۔ گورنر نے یہ بھی بیان کیا کہ اصل چابی لانے دوسرا شخص گیا ہے۔ ٹرینچ نے ہدایت دی کہ اس شخص کے پیچھے بھی ایک اور شخص کو بھیجا جائے۔ گورنر نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اصل چابی لانے میں دیر ہوگی لہازا بہتر یہی ہوگا کہ فی الحال چائے نوش کی جائے۔ اب کپتان کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا تھا۔ اس نے کہا: ''اب چابیوں کی ضرورت نہیں۔ ہم اس دروازے کو اس بھاری کھمبے سے توڑ ڈالیں گے'' جو وہیں پر دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ گورنر نے ایسا نہ کرنے کی منت کی اور وعدہ کیا کہ وہ ایک اور شخص کو دوڑتا ہوا چابی کے لیے بھیج دے گا۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ شخص دھونکنی کی طرح سانسیں لیتا ہوا اور کھانستا ہوا ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد بہت جد واپس آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک اور قسم کی چابیوں کا گچھا تھا۔ ان چابیوں کو بھی استعمال میں لایا گیا مگر قفل نے کھلنے سے پھر انکار کیا۔ گورنر نے اس بلاوجہ تاخیر پر اظہارِ افسوس کیا۔ وہ چائے کی پیش کش دوہرانے والا ہی تھا کہ لوہے کے دمدمے کو کام میں لایا گیا۔ گورنر نے سوچا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے، وہ ایک طرف کو ہو لیا۔ دمدمے نے اپنی طاقت دکھائی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر پوری طرح خالی تھا اور اس میں اناج کی ایک بوری بھی موجود نہیں تھی۔

کپتان ٹرینچ گودام سے باہر آیا اور گورنر سے خشم آگیں لہجے میں پوچھنے لگا: ''آپ مجھے اس خالی گودام میں کیوں لائے؟ میں تو اناج سے بھرے ہوئے گودام دیکھنا چاہتا ہوں''۔ گورنر معافی کا خواستگار ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ نوکروں نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔ پھر اس نے اپنے اہل کاروں کو وہ گودام کھولنے کی ہدایت دی جن میں غلہ بھرا تھا۔ ان نوکروں کی ٹانگیں تذبذب میں تھرتھرانے لگیں۔ وہ سوچنے لگے کہ کیا وہ اُس حکم کی تعمیل کریں گے جو گورنر نے

کپتان کی آمد سے پہلے دیا تھا یا اُس ہدایت پر عمل کریں جو انھیں اب دی گئی ہے؟

چابیوں کے اس اضطراب میں پھر وقت کا زیاں ہوا اور کپتان نے اس سارے معاملے کو اُس وقت ختم کر دیا جب وہ لوہے کے دمدمے کی طرف بڑھا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کی مدد کروں۔

دروازہ کھل گیا لیکن ہم نے اس گودام کو بھی سراسر خالی پایا۔ بالآخر یہ کھیل اس وقت تمام ہوا جب اس کا مرکزی کردار یعنی گورنر کپتان کے پاؤں پڑھ کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے رحم کرنے کو کہا۔ کپتان ٹرینچ نے اس سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے اور وہ اسے اگلے دن عوامی دربار میں ملے گا۔ لہازا گورنر کے ساتھ ہماری چائے منسوخ ہوئی اور ہم اس واقعے کے بارے میں سوچتے ہوئے واپس کیمپ میں پہنچ گئے۔ کپتان ٹرینچ نے اس بدمعاش کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہاں فاقہ کشی میں مبتلا لوگوں تک ایک خالی گودام سے کس طرح خوراک پہنچائی جائے؟

اگلا دن ایک شاندار دن تھا۔ کئی اہل کار ہر طرف سے ٹٹوؤں پر سوار ہو کر آئے جن میں سے چند ایک سو میل کی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ ان میں چوکیدار، چکدار، نمبردار، ذیل دار، تحصیل دار، تھانے دار اور نہ جانے کون کون راجے اور وزیر شامل تھے۔ وہ ایسے اعلی کپڑوں میں ملبوس تھے کہ ان کا نظارہ آنکھوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ سبھی نہایت خوش تھے کیونکہ انھوں نے سُن لیا تھا کہ صاحب نے کس طرح ایک برہمن گورنر کو پکڑ لیا تھا۔ البتہ کچھ تو غم زدہ اور پریشان تھے کیونکہ گورنر کی اس ذلت آمیز لوٹ مار میں وہ بھی اُس کے شریکِ کار رہے تھے۔ اگرچہ انھیں بھی اس ڈاکہ زنی کا پتہ چل چکا تھا مگر انھوں نے اس پر سے پردہ اٹھانے کی جرات نہیں کی تھی کیونکہ گورنر ایک زبردست شخصیت تھا، وہ ایک اعلی خاندان کا فرد تھا اور اسے دربار میں خوشنودی حاصل تھی۔

کپتان ٹرینچ نے اپنا اگلا قدم مشتہر کر دیا کہ اس بدمعاش کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پھر اسے اس بلند تر جگہ پر حیوانوں کے لیے پکائی گئی غذا کھلائی گئی کہ اس کے چہرے کا رنگ کالا پڑ گیا۔ میں نے آج تک ایسی سزا کا ذکر تک نہیں سنا تھا۔ ہم یہ عجیب نظارہ بہتے دریا کے پاس ایک باغ میں بیٹھ کر دیکھتے رہے جس کے چاروں طرف خاموش پہاڑ اس عدالتی فیصلے کے چشم دید گواہ تھے۔

کپتان ٹرینچ اس تگ ودو کے بعد تھک چکا تھا لیکن وہ ایک زندہ دل شخص تھا اور ہر وقت بلند خیالی اور مزاحیہ اندازِ کلام کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس نے دن میں ایک غیر دلچسپ کام غیر متوقع طور پر انجام دیا تھا اور اسے اس پر واقعی فخر ہونا چاہیے تھا۔ وہ رات گورنر کے لیے نہایت دل آزار رہی ہوگی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ دریا کے کنارے ہمیں زور کی آندھی نے جگایا۔ ہم فوراً بستروں سے باہر نکل آئے اور اپنے سامان کو بچانے میں لگ گئے۔ میں نے دیکھا کہ میں بستر پر لیٹا ہوں اور میرا خیمہ سارے کا سارا مجھ پر آن گرا ہے۔ یہ خیمہ مجھ پر اسی طرح براجمان رہا جب تک کہ آندھی رکی نہیں تھی۔ مجھے اس طرح اپنی شکست دیکھ کر اپنے آپ پر غصہ آ گیا لیکن اس سلسلے کا ایک دلچسپ پہلو بھی ہے۔

اگلے روز ہم نے لیہہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہ سفر بہت طویل اور موسم کی گرمی کا شکار تھا کیونکہ راستے میں کہیں کوئی چھاؤں نہیں تھی۔ پہاڑوں پر سے روشنی اور حدت کا عکس ہمارے لیے تکلیف دہ بن گیا تھا۔ ہم میں سے ایک شخص کی آنکھوں پر کالا چشمہ لگا تھا جس سے وہ قدرے مطمئن تھا۔ ہم ہر صبح ساڑھے چار بجے نکل کر دس بجے تک چلتے رہتے اور کوئی چھاؤں دیکھنے کے بعد وہاں شام تک قیام کرتے۔ پھر رات کی ٹھنڈ میں سفر جاری رکھتے۔

وسط ایشیا اور چین سے دو کاروان آرہے تھے جنھیں دیکھ کر ہم میں ایک عجیب سی دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ سُرا گایوں پر بوجھ لادے ہوئے تھے اور چند ایک نے تو اپنا سامان بھیڑوں پر لادر کھا تھا۔ یہ وہی بھیڑیں تھیں جن کی دُم کافی موٹی اور کشادہ ہوتی ہے۔ بھیڑوں سے سامان اٹھوانا ایک عملی اقدام ہے کیونکہ جب ان پر لدی ہوئی خوراک کھائی جاتی ہے تو ان کی کوئی ضرورت نہیں رہتی اور انہیں ذبح کرکے کھایا جاتا ہے اور موٹی دم کا گوشت سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ان کاروانوں میں سے چند ایک تو گھر پہنچنے سے پہلے تین سال تک سفر میں رہے تھے۔ ان میں سے اکثر عازم مکہ شریف گئے تھے اور پھر سبز دستاروں پر یہ عبارت جلی حروف میں لکھوا کر لوٹ رہے تھے کہ: ''میں ایک زائر ہوں جس نے حج کا فریضہ ادا کیا ہے''۔

پہلی بودھ خانقاہ ہم نے ملبے کی جگہ پر دیکھی جو ایک بلند مقام پر ایک چٹان کے سرے پر کوئی پانچ سو فٹ کی اونچائی پر واقع تھی۔ اس خانقاہ تک پہنچنے سے پہلے گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا بُت ہے جسے ایک چٹان سے تراشا گیا ہے اور جو تیس فٹ اونچا ہے۔ ہمارے واپسی کے سفر میں ڈاکٹر نیو اور میں اس جگہ اس وقت پہنچے جب وہاں ایک مخصوص رسم ادا کی جارہی تھی۔

اس بُت کے سامنے ایک کھمبے کو ایستادہ کیا گیا تھا جسے رنگین کپڑوں کے چھیتڑوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پھر تیس بچوں کا ایک گروہ نمودار ہوا جو رنگین اور چمکدار کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پھولوں کے تاج تھے۔ وہ اس کھمبے کے ارد گرد ناچ کر گاتے رہے۔ پھر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک لاما آ گیا جو کسی عیسائی راہب کا جیسا لباس زیبِ تن کیے تھا اور اس کے سر پر احمقوں کی سی سرخ ٹوپی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کشمیری کانگڑی تھی جس میں انگارے دہک رہے تھے اور ان کے ساتھ بھنگ یا افیون کی نشہ آور ملاوٹ تھی۔ وہ

اس کانگڑی سے دھویں کو زور زور سے ناک کے اندر کھینچتا رہا جس کی بنا پر وہ جوش میں آگیا۔اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک مخروطی تلوار تھامی تھی جسے وہ ایک خطرناک انداز میں ہوا میں لہراتا رہا۔ پھر وہ بھی کھمبے کے ارد گرد ناچنے لگا اور بچے بھی اس کے ساتھ رقص کرنے لگے۔ یہ لاما زور زور سے چلاتا اور اپنے جسم کو پوری رفتار سے لہراتا رہا۔اس دوران اس کی تلوار بھی لہراتی اور ہر طرف گھومتی رہی۔

ایک شخص نے جو میری جان پہچان کا تھا اور جو اپنے آپ کو نیک بندہ کہتا تھا، میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ لاما الہامی کتابوں کا ورد کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ افیون کے نشے میں چور تھا اور مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلد ہی زمین کی مٹی چاٹ لے گا مگر ہم یہ سارا تماشہ دیکھنے سے پہلے ہی وہاں سے چلے گئے۔

مُلبے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہم نے باشان کے بیلوں جیسی آوازیں سنی تھیں۔ یہ آوازیں عام چیخ و پکار سے بالکل مختلف تھیں۔ اسی طرح ایک اور طرف سے بھی ڈھول بجنے کا شور سنا جس کے ساتھ جھنڈے بھی لہراتے ہوئے دیکھے گئے۔ اب ہم بودھ خانقاہ کے بینڈ کو دیکھ رہے تھے۔ لاما اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس تھے جن میں ان کے سروں پر بندھی ہوئی پگڑی نما ٹوپی نہایت خوبصورت تھی۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی نوکیں ہیملٹ جیسی ٹوپی کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ یہ ڈھول کوئی سات یا آٹھ فٹ لمبے تھے اور ان کی آواز سے سارا ماحول دہل رہا تھا۔ پھر خانقاہ کا راہبِ اعلیٰ آیا جس کے ساتھ لاماؤں کی ایک فوج اور ملبے کی مشہور شخصیات بھی تھیں۔ یہ سبھی کمشنر صاحب کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ کھانے سے بھرے برتن اور اپنے گھروں میں بنائی ہوئی وہ شراب بڑی صراحیوں میں بھر کے لائے تھے جسے مقامی زبان میں چھنگ کہتے ہیں۔

ملبے میں ادلیس بادشاہ کا ایک کتبہ دیکھا جاسکتا ہے جس کی رو سے جاندار حیات کی قربانی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس حکم نامے پر بہر حال عمل نہیں کیا گیا اور بودھ مت کے آغاز سے قبل قربان گاہوں میں بکریوں کی قربانی کا چلن جاری رہا۔ اس عمل میں زندہ حیوان کا دل نکالا جاتا تھا۔

بعد دوپہر ہمیں پولو کے کھیل سے محظوظ کیا گیا۔ یہاں ہر بڑے گاؤں میں پولو گراونڈ موجود ہے جس کی پوری دیکھ بال کی جاتی ہے اور پانی کی متواتر بہم رسانی سے اسے سرسبز و شاداب رکھا جاتا ہے۔ یہ کھیل جن عوامل کے لحاظ سے مغربی پولو سے مختلف ہے، وہ کچھ یوں ہیں:

اول: میدان میں آر پار دونوں طرف پتھروں کی تین فٹ اونچی دیواریں بنائی جاتی ہیں جن کے ساتھ بال ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ ان دیواروں کے ساتھ کسی نافرمان ٹٹو کو بھی وہاں پر بکھرے ہوئے پتھروں سے باندھا جاتا ہے جس سے اسے زبردست جسمانی اذیّت پہنچتی ہے۔

دوم: یہاں سبھی کھلاڑی ایک ساتھ اور ایک ہی طرف سے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ کھیل کا ناظم، قبل اس کے کہ یہ زمین پر آجائے، بال کو اپنی چھڑی کی پوری قوت سے ہوا میں پھینک دیتا ہے۔ بال سارے میدان کا احاطہ کر کے اگلے گول کے کھمبوں تک جاتی ہے جن کی نشان دہی دو پتھروں سے کی گئی ہوتی ہے۔ لیکن تب تک گول کو تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک کوئی بھی کھلاڑی گھوڑے سے اتر کر اس بال کو گول پوسٹ کے اندر نہیں پھینکتا۔ جب گول ہوتا ہے تو بینڈ باجے والے ترنگ میں آکر بجانا شروع کرتے ہیں۔ اس موسیقی کی ادائیگی میں ڈھولوں کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ پولو کھلاڑی انتہائی لاپروائی سے کھیلتے ہیں۔ میں نے بچشمِ خود کھلاڑیوں اور ٹٹوؤں کا خون بہتے دیکھا ہے جو دوڑ میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تماشائی بھی دیوار کے زیادہ قریب

ہونے کی وجہ سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ اس علاقے میں بہت قدیم اور عزت دار کھیل مانا جاتا ہے۔

بودھ خانقاہوں اور لاماؤں کی اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی جو جذبات باہر سے آئے ہوئے شخص پر حاوی ہوتے ہیں انھیں وضاحت سے بیان کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ چکا ہے جو انسانی تصور اور خواب وخیال سے معمور ہے۔ وہ اپنے بدن کی چٹکی لینا چاہتا ہے تاکہ اسے یہ احساس ہو کہ کیا وہ واقعی جاگ رہا ہے یا کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔

سڑک پر انسان کو ایک سو سے تین سو لمبے دروں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو آٹھ فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے ہوتے ہیں۔ ان کی چھتیں تراشے ہوئے پتھروں کی بنی ہوتی ہیں۔ ان پر جگہ جگہ یہ الفاظ کندہ کیے گئے دکھائی دیتے ہیں: ''اوم مانے پدماہوں'' ان کے معنی مجھے اس طرح بتائے گئے۔:''میرے خدا! میری روح پانی میں ایک زیور کی طرح ہو جو کنول کے پتے کے لبوں پر اس طرح رہتا ہے گویا یہ جھیل میں گرنے والا ہی ہے اور یہ پانی کے سمندر میں کھو جائے گا۔'' جس کے معنی نروان میں گم ہونا ہے۔

یہاں لاما یہ نیک کام کرتے ہیں اور اس کے عوض انھیں لوگ پیسے دیتے ہیں جو یہ پتھر دیواروں پر نصب کرتے ہیں۔ وہ سفر کرنے والے بھی عزت کماتے ہیں جو دیوار کے بائیں طرف چلتے ہیں، لیکن ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے جو غلط سمت میں چلتے ہیں۔ یہاں پولیس والوں کی ضرورت نہیں جو ٹریفک والوں سے کہیں کہ بائیں طرف چلو۔ ہر سیاح خود ہی ایسا کر کے قابلیت کا نام کماتا ہے۔ پھر سڑک پر سیاح مسلسل طور پر چورتان کے سنگی پگوڑوں کو دیکھتا ہے جن پر سفید چونے سے لپائی کی گئی ہوتی ہے۔ یہ پگوڑے کھیتوں میں اور پہاڑی اطراف میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تین سے چالیس فٹ اونچے ہوتے ہیں۔

یہ اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان میں کسی بھی شخص کو مٹی کے بنے ہوئے لاما ملتے ہیں جو اصل میں مردہ لاماؤں کی خاک سے بنے ہوتے ہیں۔ ان پر دل نشین نقوش بنے ہوتے ہیں جن میں بدھ کی صورت خاص طور پر ہر پگوڑے میں موجود ہوتی ہے۔

مکانوں کی چھتوں اور درختوں پر رنگین چھیتڑوں کے بنے جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں۔ جن پر بھی یہی دعا لکھی ہوتی ہے۔ جب یہ پرچم ہوا میں لہراتے ہیں تو اس پر لکھی دعا اوپر چڑھ کر جھنڈے والے کی دعائے خیر کا باعث بن جاتی ہے۔

ہم نے ایک دیہات سے گذرتے ہوئے چھتوں پر کاغذ کی ہوائی ملز (Wind Mills) دیکھیں جو گھروں کے اندر خیر و برکت کا سبب مانی جاتی ہے۔ ان پر بھی کئی بار ''اوم مانے پدما ہوں'' کی دعا درج کی گئی ہے۔ چند مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اور خانقاہوں میں گول گول شکل کی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جنھیں یہاں آنے والے ہاتھوں سے گھما گھما کر ثواب کما لیتے ہیں۔ کئی دیہاتوں میں عبادت کے ایسے ہی گول پہیے پانی سے گھومتے ہوئے دیکھے جو خود بخود دن رات دعا کرتے رہتے ہیں۔ اخیر پر آپ کی ملاقات مرد اور عورتوں دونوں سے ہوگی جو سڑک پر دھات کے بنے ان پہیوں کو اٹھاتے ہوئے چلتے نظر آتے ہیں۔ انھیں وہ کہنی کو موڑ کر کلائی پر اٹھاتے ہیں۔ ان خوبصورت عبادتی پہیوں کو چاندی کے نقش و نگار سے سنوارا جاتا ہے۔

یہاں کے لوگ رنگین تصاویر والے رنگوں کا لباس پہنتے ہیں۔ مرد اور عورتیں عام طور پر ایک لمبا سا اونی چغہ پہنتی ہیں جو بالعموم سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ کبھی اس کا رنگ سبز یا کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ مردوں کے پاس ایک لوہے کا بٹوہ جیسا ہوتا ہے جس میں وہ قسم قسم کے چاقو، ایک لمبا قلم دان اور روشنائی، تین

لہروں والا چابک جس کا دستہ ہمیشہ دھات اور روغن سے سجا ہوتا ہے، چائے کے لیے ایک پیالہ، دلیا، اور آٹے کا ایک تھیلا شامل ہیں جسے دورانِ سفر خوراک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کا کھانا ہر وقت سادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیالے کو ٹھنڈے پانی سے بھر لیتے ہیں، اس میں آٹا ڈالتے ہیں، اسے اپنی شہادت کی انگلی سے ہلاتے ہیں اور پھر جب یہ آبی روغن سا ہو جاتا ہے تو اسے پیا جاتا ہے۔ ایسے خوراک سے کسی کی بھوک نہیں مٹ سکتی بلکہ اس سے ان کا نظامِ ہاضمہ ہر وقت خراب رہتا ہے۔ ان میں سے اکثر اپنے ایزار بند کے ساتھ ایک نشان رکھتے ہیں جو سونے یا چاندی سے بنی ہوئی بدھ کی تصویر ہوتی ہے۔

تبت کے بودھے ایک مذہبی رسم میں روٹی اور دیودار کا استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسم نیستوریائی عیسائیوں کے ہاتھوں چین سے آئی ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ سینٹ تھامس نے چین میں عیسائیت کو متعارف کیا۔ یہاں ہر بودھ کے لیے اس کا اپنا لاما ہوتا ہے جسے وہ نذرانے بھی دیتا ہے۔ ان کے سر کو کپڑے کی ایک ٹوپی ڈھانپتی ہے جس کے رنگ ان کے لباس سے الگ ہوتے ہیں۔ لیکن میں اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے آج تک ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہے۔ یہ رنگین اور بدزیب بھی ہے۔ یہ جسمانی ملبوسات بعینہ منگول خدوخال کے عین مطابق ہیں۔ جس میں کمر پر لٹکا ہوا بالوں کا لمبا گچھا بھی ہوتا ہے۔ عورتیں زیادہ تر مردوں ہی کی طرح کا پوشاک پہنتی ہیں۔ صرف ان کا سروں کا لباس مختلف دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک فراک پہنتی ہیں جو سرخ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اور جس کی چوڑائی چھ سے آٹھ انچ ہوتی ہے۔ یہ پیشانی سے لٹک کر کمر سے ہوتا ہوا اس کی نچلے طرف تک پہنچتا ہے۔ اسے قیمتی پتھروں سے آراستہ کیا جاتا ہے جن میں کھردرے قسم کے نقرئی زیورات بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ رسم جس کی رو سے ان کی روسیان کی دولت ان کے سروں

پر لدی ہوتی ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کس قدر ایماندار ہیں۔ پھر چہرے کے دونوں طرف کپڑے کے ایک ٹکڑے پر استر خوان کے دو حصے سلے ہوتے ہیں جو بوقتِ ضرورت صحیح طرف سے کالے پروں کی شکل میں تقریباً چھ انچ باہر نکلتے ہیں۔

اس خطے میں عورتیں پردے میں نہیں رہتیں۔ ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ وہ نہ تو شرمیلی ہیں اور نہ ہی بہادر۔ وہ ہمیشہ اپنے مردوں کی طرح مسکراتی رہتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی چند صفحات میں کہا ہے کہ جب کوئی لداخ میں داخل ہوتا ہے تو گویا وہ ایک خواب دیکھتا ہے کیونکہ یہ ملک اور یہاں کے لوگ ہرلحاظ سے مختلف ہیں۔ یہاں کے عوام اور عمارات ہی نہیں بلکہ ارد گرد کی پہاڑیاں بھی الگ تھلگ نظر آتی ہیں۔ یہ لاماؤں کا رواج ہے کہ وہ اپنی خانقاہوں کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر تعمیر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی خانقاہ سے پہاڑی چوٹی کو اور چوٹی کو خانقاہ سے الگ کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ یہاں کی ہوا بھی عام ہوا سے زیادہ قریب لگتی ہے لہازا یہ حقیقت میں جہاں ہوتی ہے وہاں سے نزدیک محسوس ہوتی ہے۔ پہاڑیاں اور کھائیاں جن پر درخت یا گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا خوبصورت رنگوں میں نہا جاتی ہیں اور روشنی اور سائے بھی اسی طرح واضح ہو جاتے ہیں جس طرح ہم نے انھیں نہیں دیکھا ہے۔

چلئے اب ہم ایک بودھ خانقاہ کو دیکھ لیں۔ جونہی ہم لاما یارو کے قریب پہنچے ہمیں وہاں پر شور اور گرد وغبار کا سامنا کرنا پڑا۔ خانقاہ کا باجا گویا کسی جنگی مہم پر نکلا تھا۔ اس نے زور زور سے آلاتِ موسیقی بجا بجا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر خانقاہ کے اہل کاروں کے ہجوم اور دیہات کی سرکردہ شخصیات نے ہر طرف گرد کے انبار اڑائے۔ خانقاہ ہمیں ایک اعلیٰ مرتبے کے لاما نے دکھائی۔ ہم پتھروں

کے زینے سے ٹائلیں بچھی ہوئی خانقاہ کی طرف اوپر چڑھ گئے جو حسب معمول چوٹی کے اوپر واقع تھی۔ لیکن اسے اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ چٹان کا سایہ دیکھنے میں نہیں آسکتا تھا۔ زینے کے اطراف میں دیواروں سے مناجاتی پہیئے لگے تھے۔ جو روایتی انداز میں گھومنے کے لیے رکھے گئے تھے۔ ہم نے انھیں صحیح طریقے سے دائیں سے بائیں گھمایا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھے طریقے سے کیا کیونکہ ہمارا سفر ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ یہ جگہ بہت سی دلچسپی کی چیزوں سے بھری پڑی تھی اوراب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کونسی چیز دیکھی جائے۔ اس عبادت گھر میں ایسی ایسی مصنوعات تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ عمارت ایک وسیع ہال کی طرح تھی جس کی چھت کو لکڑی کے ستونوں نے سہارا دیا تھا۔ اردگرد ایک غلام گردش سے کئی اقسام کے پھرپھرے لٹک رہے تھے جن پر خاص طور پر چینی اژدہے کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ اس ہال کے ایک طرف مجسموں کی ایک قطار تھی۔ جو قد آدم گوتم بدھ اور مقدس لاماؤں کی شبیہیں دکھاتی تھیں۔ ان میں سے ہر مجسمے کے سامنے ایک میز یا ذبح خانہ رکھا گیا تھا جس کے نقوش عجیب کاریگری کے نمونے تھے۔ ان پر تیز لال، سبز، زرد اور طلائی رنگوں سے گل کاری اور اژدھوں اور پاکیزہ نشانات کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

میزوں پر دھات کے پیالے اور صراحیاں تھیں اور ہر میز پر مقدس پانی کا ایک برتن رکھا گیا تھا جس کے ساتھ مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ یہاں چھنگ کے پیالے اور دورجی نام کی نقرئی گھنٹی، جو لاما عبادت کے دوران استعمال کرتے ہیں رکھی گئی تھی۔ مزید برآں انسانی کھوپڑی سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا ڈھول، ایسی ہی کھوپڑیوں سے بنی صُراحیاں اور انسان کی ران کی ہڈی بھی دیکھی گئی جو ڈھول بجانے کے کام آتی تھی۔

خانقاہ کے بیچوں بیچ بینچوں کی قطار ہے۔ جو مجسموں کے ساتھ لگی ہے اور جہاں لاما اپنی مقدس کتابیں پڑھتے وقت ذبح خانے کی طرف جھکتے ہیں۔ بائیں طرف تانبے کے برتن ہیں جن میں چھنگ نام کی شراب بھری ہے۔ اس کی مے خوری سے لاما اس وقت راحت محسوس کرتے ہیں جب وہ مقدس کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔ بائیں طرف بہت سی درازیں ہیں جن میں یہ کتابیں رکھی گئی ہیں۔ یہ مخطوطات اطلس کے لمبے ٹکڑوں پر تحریر کیے گئے ہیں۔

اس خانقاہ میں پانچ ایسی الگ تھلگ جگہیں ہیں جنھیں برابر صاف رکھا جاتا ہے۔ جب کسی مشہور ہستی کی موت ہو جائے تو لاماوؤں کو مقدس کتابوں سے عبارات پڑھنے کے لیے پیسے دئے جاتے ہیں۔ وہ الگ الگ کتابوں سے مخصوص صفحات منتخب کر کے انھی سے اونچی آواز میں پاٹھ کرتے ہیں۔ ان کے متن الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کی آوازیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں میں نہیں جانتا کہ کیا اس پڑھنے کے ساتھ بلند آواز کا بھی کوئی فائدہ ہے جو ہزاروں الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے ظاہری طور پر ایک میکانکی طریقے سے مغفرت کی دعائیں پڑھنے کا گُر سیکھ لیا ہے۔ جب لداخ میں بجلی آئے گی اور دعا کے پہیے موٹروں سے چلائیں گے تو اس سے اس عمل کی افادیت بڑھے گی اور نروان ہر ایک کی قسمت میں شامل ہوگا۔ اس جگہ کی صفائی ضروری لگتی تھی۔ اس کے اندر چراغ کے تیل اور جلتی چربی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ دراصل یہ بدبو ہر اُس چیز سے آرہی تھی جسے لاماوؤں نے چھوا تھا کیونکہ وہ انتہائی گندے ہوتے ہیں۔ ان کے سرخ لباس تیل سے کالے پڑے ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ وہ کئی کئی بھائی تھے اور ہمیشہ ہنسنے ہنسانے اور لطیفے سنانے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ وہ قدیم مغرب میں لاماوؤں کی تصویروں کے ہم

شکل دکھائی دیتے تھے۔ یہاں الگ مکانوں میں خواتین لامائیں رہتی ہیں جن میں سے اکثر مردوں کی شکل وصورت کی ہیں اور انھیں عورت کی حیثیت میں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ خاص کر اگر وہاں پر کوئی انجانا شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے جس کی مثال مندرجہ ذیل واقعے سے دی جاسکتی ہے۔

کچھ دن بعد میں ڈاکٹر نیو کے ساتھ لیہہ میں تھا۔ وہ ہسپتال میں مریضوں کے علاج معالجے میں مصروف تھا۔ میں باہر اُن بیماروں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا رہی جو اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر مضطرب اور خوف زدہ تھے۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جو بہت ہی غم زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک لاما تھا اور کسی حد تک بے اطمینانی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور اس سے کہا کہ وہ خوش رہے۔ اسی وقت مجھے پیچھے سے یہ بلند آواز سنائی دی: ''ارے ذرا خیال کرو کہ تم کیا کر رہے ہو کیونکہ یہ ایک خاتون لاما ہے''۔ میں نے ایک انگریز کی طرح معافی مانگ لی مگر اس کا اس عورت پر کوئی اثر نہیں پڑا کیونکہ وہ بدستور منہ لٹکائے بیٹھی رہی۔

ہم شان وشوکت سے صدر مقام لیہہ پہنچ گئے جس کی آبادی سرما میں تین ہزار نفوس اور گرمیوں میں چھ ہزار افراد ہوتی ہے جب مشرق ومغرب سے سبھی تاجر یہاں وارد ہوتے ہیں۔ یہ شہر بہت ہی محظوظ کرنے والا اور دل چسپ تھا۔ خانقاہوں اور قصبوں کے بینڈ باجے، دعوتیں اور پولو کے میچ ایک دوسرے کے بعد ہی واقع ہوتے تھے۔ لیکن لیہہ میں جو استقبالیہ کمشنر صاحب کو دیا گیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ لیہہ سے سات میل دور وادیٔ سندھ میں، جو ایک وسیع ریتلا میدان ہے، ہماری آو بھگت مقامی لوک فن کاروں نے کی جو قسم قسم کے رنگارنگ اور روایتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ اشخاص چینی ریشم کے کپڑوں

میں ملبوس تھے جن کے سروں پر نیلی اور سنہری ٹوپیاں ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ ان میں مختلف عہدوں کے لداخی اہل کار بھی تھے جن میں ایک قبول صورت مسلمان جوائینٹ کمشنر بھی تھا، ہاتھی کی جسامت کا اس کا بابوٹٹو پر ایک بندر کی طرح بیٹھتا تھا۔ وہ اتنے موٹے جسم کا مالک اور کوتاہ قد تھا کہ اس کی کہنیاں اور پھولا ہوا پیٹ ایک دوسرے کے ساتھ گویا جڑے ہوئے تھے۔ البتہ جس شخص نے میری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ کیتھولک گرجے کا پادری تھا۔ اس کی شکل ان سارے پادریوں سے ملتی جلتی تھی جو حکایتاً عدم سے واپس آ گئے تھے۔ وہ ایک لمبا چغہ پہنے ہوئے تھا جو ٹٹو کی پیٹھ سے پیچھے کی طرف نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی پادریوں کی ٹوپی اس کے سر کو تکلیف دے رہی تھی۔ اگر میں کسی خچر پر سوار ہوتا تو میں ایسی ٹوپی کا انتخاب کسی صورت میں نہیں کرتا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا مرتبہ اسے اپنی بے اطمینانی کا برملا اظہار کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ بہر حال اس پادری کے سوا ہر ایک صبح کی اس گل گشت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم سبھی ایک منظّم صورت میں صدر مقام کی طرف چل پڑے۔

لیہہ کو آپ کئی میل کی دوری سے بھی دیکھ سکتے ہیں کیونکہ یہ پہاڑی چٹانوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس پر خانقاہیں اور محل نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیہہ سطح سمندر سے گیارہ ہزار سات سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے لہازا یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے کی خاطر کچھ وقت لگتا ہے۔

جب ہم مرکزی اندرون سے اہم شاہراہ پر پہنچے تو دیکھا کہ اس کے دونوں طرف ہز ہائی نیس کی فوج قطاروں میں ایستادہ ہے اور اس کے پیچھے شہریوں کا ایک ہجوم کھڑا ہے۔ خانقاہ کا باجا ایک عمارت کی چھت پر پوری شد و مد سے گونج رہا تھا اور اس کی موسیقی مدھر لگتی تھی۔ اس مرکزی کاروباری سڑک پر

سفیدے کے درخت قطار اندر قطار کھڑے ہیں جن سے گرما کے موسم میں آرام دہ ٹھنڈ نصیب ہوتی ہے۔

یہاں کا پولو گراونڈ وسیع و عریض ہے۔ یہاں کھلاڑی سڑک پر ادھر سے اُدھر گھومتے نظر آتے ہیں۔ جو اپنی بالیں بار بار دکانوں پر دے مارتے ہیں۔ خوش قسمتی سے لیہہ کی دکانوں میں شیشے نہیں لگے ہیں ورنہ سڑکوں پر کھیلا جانے والا یہ پولو بہت مہنگا ثابت ہوتا۔

کپتان ٹرینچ کو بالآخر ریذیڈنسی پر بحفاظت لے جایا گیا جو ایک خوبصورت باغ میں دو منزلہ سنگی عمارت تھی۔ لیہہ میں چونکہ درختوں کا مرضی کا انتخاب نہیں ہوسکتا اور میں نے یہاں صرف سفیدے اور بید کے درخت ہی دیکھے ہیں۔ لیکن لداخ کے نچلے خطے میں خوبانی، سیب اور آڑو کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

کمشنر کے ترجیحی فرائض میں اُن تاجروں کے مفادات کا خیال کرنا ہے جو مرکزی کاروان کی شاہراہ سے ہندوستان سے وسط ایشیا، یارقند، ترکستان اور چین جاتے ہیں۔

میں موراوی مشنریوں کے پاس گیا جنھوں نے از راہِ عنایت ڈاکٹر ای۔ ایف۔ نیو کو اور مجھے اپنے ہاں قیام کرنے کی دعوت دی تھی۔ وہ یہاں کئی سال سے ایک قابل ستایش اور فایدہ مند کام سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ ہسپتالوں اور سکولوں اور لوگوں کے گھروں میں بھی جاتے ہیں۔ اب ان کے پاس کوئی تیس عیسائیوں کی جماعت موجود ہے۔ ان میں سے چند سال تک میرے رابطے میں رہنے والے ایک مشنری کی کہانی دلچسپ ہے۔

نوبرا میں ایک خانقاہ کا لاما قریب المرگ تھا۔ اس نے جان پہچان کے ایک مشنری کو بلاوا بھیجا۔ نوبرا وادی کھردنگ درے کی دوسری طرف لیہہ سے

کوئی پچاس میل کی دوری پر ہے جو سترہ ہزار چار سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ مشنری فوراً وہاں چلا گیا اور اس نے اُسے مرنے سے پہلے دیکھا۔ لاما نے اس سے کہا کہ اس نے مشنریوں کی تعلیمات کے ذریعہ اس آسمانی حقیقت کو سنا تھا کہ حضرت عیسی ہی اُس کا نجات دہندہ ہے۔ البتہ اس نے اس حقیقت کا برملا اظہار دوسروں کے ہاتھوں ستائے جانے کے خوف سے نہیں کیا تھا۔ اگر چہ وہ خود ایسا کرنے میں ناکام ہی رہا لیکن وہ اپنے بیٹے کو مشنریوں کے حوالے کر کے اسے ایک عیسائی کی طرح پرورش کروانے کا خواہش مند ہے۔ اس لاما کی موت اس طرح ہوئی جیسے شبنم کا کوئی قطرہ کنول کے پتے سے گر پڑے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے بیٹے کو لیہہ میں مشن پر لے گئے ہیں جہاں وہ تیرہ سال تک رہے گا اور پھر اسے سری نگر میں مشن سکول میں داخل کیا جائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ مشنریوں نے اسے چند تبّتی دوستوں کی تحویل میں دیا جو تجارت کے لئے جا رہے تھے۔ اس لڑکے کا عیسائی نام جوزف رکھا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس ننھے لداخی کا سکول میں خیر مقدم کیا گیا۔ وہ یہاں تبّتی لباس میں پہنچا۔ وہ عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ میں نے صرف چند ہی تبتیوں کو دیکھا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ اپنے قومی لباس پر کتنا اِترا رہا تھا جسے وہ سکول میں ہر وقت پہنتا رہا۔

دوسری طرف جوزف کو دیگر برہمن طلباء کے ساتھ ملنے جلنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے عجیب و غریب کپڑوں کو دیکھ کر ہنستے رہے اور اس کا مذاق اُڑاتے رہے۔ وہ اس کے عیسائی ہونے پر بھی اسے ستاتے رہے۔

جوزف نے کبھی اپنے عذاب رسانوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس نے ان کی باتوں کا کوئی جواب دیا، نہ ہی اس نے کسی بھی طرح ان کا خوف محسوس کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ برہمن لڑکے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے تھے۔ میں اس طالب علم کو پسند کرتا ہوں جو اپنے معاملات خود

سنبھالے اور کسی دوسرے کی حمایت کا محتاج نہ بن جائے۔ لہازا میں نے بھی اسے اچھی تربیت دینے کی ٹھان لی۔ وہ جلد ہی ایک بہتر شاگرد ثابت ہوا جس کے دل میں میں نے کوئی وسواس یا ڈر کبھی نہیں دیکھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک مختصر سے وقت میں ہر ایک اس کی عزت کرنے لگا۔ جس پر اس کا مذہب یا پوشاک بھی اثر انداز نہیں ہو سکا۔ سکول چھوڑنے پہلے وہ سب سے زیادہ محترم لڑکا بن چکا تھا۔ اب وہ اپنے ملک واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کونسا پیشہ اختیار کرے گا؟ کیا وہ سرکاری ملازمت اختیار کرے گا کیونکہ لداخی باشندے بہت کم پڑھے لکھے تھے اور حکومت کے سبھی عہدوں پر یا تو کشمیری برہمنوں کا قبضہ تھا یا وہ ہندوتانیوں کے پاس تھے۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر چند لداخی بھی سرکاری نوکریوں میں شامل ہو جائیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ بھی ایسا کرے تو ایک وقت اسے اقتدار اور رسوخ حاصل ہوگا جسے وہ نیک کارکردگی کیلئے کام میں لائے گا۔ اُس نے جواباً کہا: ''مجھے اقتدار یا دولت نہیں چاہیے۔ جو میں چاہتا ہوں وہ بس اتنا ہے کہ میں اپنے لوگوں کو عیسی کی تعلیمات سے بہرہ ور کروں۔ میں ایک مشنری بننے کو ہی ترجیح دوگا''۔

وہ واپس لیہہ چلا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ وہاں مشن سکول کا ہیڈ ماسٹر بن گیا۔ اس عہدے پر وہ کئی سال تک رہا۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں کو عیسی کی تعلیم دے رہا ہے جس میں اس کی تقریر اور عمل دونوں شامل ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی تعلیم نے اسے ایک بابو بننے کی ترغیب نہیں دی۔ اس کے برعکس وہ ایک شریف النفس محنتی شخص بن گیا۔ میں نے کئی بار اسے سراگائے کا جوڑا ہانکتے ہوئے اپنی پیٹھ پر ایک ٹوکرے میں کھاد اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی تعلیم نے اسے انسانیت سے دور نہیں کیا جیسا کہ کشمیر اور ہندوستان میں کئی لوگوں کے ساتھ ہوا ہے۔

مجھے یاد آگیا کہ خانقاہ میں دم توڑتے ہوئے لاما نے اپنے ملک کی

خاطر کیا کیا اگر چہ کئی اور لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آسکتا کہ اپنے بچوں کو کس طرح راہِ راست پر ڈالنا چاہیے۔

لیہہ میں مشن کو چند عمدہ قسم کے مشنریوں کی خدمات کا اعزاز حاصل ہوا ہے جو ایک صاف دل افراد کی جماعت ہے۔ان کی تنخواہ اگر چہ بہت ہی کم ہے اور ابھی حال ہی تک وہ گھر جانے کے لیے زادِراہ بھی نہیں رکھتے تھے اور بعد میں اپنے کام پر ہی وفات پا گئے۔لیکن مجھے خوشی ہے کہ آئے دن ایک دانشمندانہ اور انسان نواز پالیسی کے پیش نظر اگر بزرگ مشنریوں کی عمر دراز ہو تو نئے اور نا تجربہ کار جانشینوں سے کسی حد تک نپٹنا نہیں پڑے گا۔اس کے لیے انھیں وقت وقت پر لمبے آرام کی سہولت دی جانی چاہئے۔سرینگر اور لیہہ میں مشنری کئی لحاظ سے ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔دورانِ جنگ ڈاکٹر اور مسز ہیبر سری نگر مشن ہسپتال میں امداد دینے کے لیے آگئے جب وہاں اس کی ضرورت تھی اور وہ تعریف و تحسین کے درخور کہلائے۔

قصبے کے باہر ریت کے ویرانے میں ایک چھوٹا سا نخلستان ہے جو عیسائیوں کا قبرستان ہے جس میں دیگر مقدس باقیات کے علاوہ ایک ممتاز مشنری مِس ایرینی پیٹری بھی شامل ہے جس نے صرف تین سال کے بہت ہی مختصر دورانیہ میں خواتین اور بچوں کو سری نگر میں روزی کمانے کے ہنر سکھائے۔وہ چھٹیوں کے لیے لداخ آئی لیکن وہاں پہنچتے ہی ٹائی فائیڈ کے بخار سے اس کا انتقال ہوا جس کی لاگ اسے سری نگر میں لگی تھی۔مسز ایشلے کارس ولسن نے اپنے سوانح لکھے جو ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے جو اعلیٰ خدمت میں گزاری ہوئی اس کی زندگی کا حال بیان کرتی ہے۔

میں نے کھرڈُنگ درے کے بارے میں بہت کچھ سُنا تھا جو لیہہ سے چند میل کے فاصلے پر سترہ ہزار چار سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔اس پر اکثر و بیشتر

بوجھ ڈھونے والے حیوانوں کی ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ یہاں ہوا اس قدر گھٹی ہوئی ہے کہ ٹٹو اور گدھے والے ان کی ناک کو چیر کر اسے پھیلاتے ہیں تاکہ ان کے نتھنوں میں زیادہ سے زیادہ ہوا گھس جائے۔ اس درے پر تاجر زیادہ تر سُرا گائے ہی کو استعمال میں لاتے ہیں جن پر وہ اپنے آپ کو پہاڑی بیماری سے بچانے کے لیے سوار ہوتے ہیں۔

سورج بہت گرم تھا کہ میں نے رات ہی کو سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے ٹٹو پر شام کے آٹھ بجے روانہ ہوا کیونکہ سُرا گائے بہت سست رفتار ثابت ہوسکتی تھی۔ میرے ساتھ لداخ کا ایک ٹٹو سوار پہاڑی رہ نما بھی تھا۔ بارہ بجے کا وقت تھا کہ میرا یہ رہ نما غائب ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس سمت میں گیا اور گہرے اندھیرے میں اسے ڈھونڈنا میرے لیے ناممکن تھا۔ مجھے راستہ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا لہٰذا میں ٹٹو سے اتر گیا تاکہ میرے پاؤں زمین کے ساتھ رہیں۔ ٹٹو بھی ملنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے ایک چٹان کے ساتھ باندھ لیا اور خود کوئی نشان پانے کی غرض سے چل پڑا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں پہاڑی کی چوٹی پر اس کے نوکیلے سرے پر پہنچا ہوں۔ مجھے بہرحال محسوس ہوا کہ میں بیک وقت بیس سے زیادہ قدم نہیں چل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اذیت ناک سر درد نے مجھے آلیا۔ یہ ایک ایسا احساس تھا کہ جیسے میرے سر میں خون کی رگیں جل اٹھیں گی۔ کچھ دیر تک بے معنی آوارہ گردی کے بعد مجھے لگا کہ میں ایک چوٹی کے دہانے پر ہوں۔ چاند نکلا۔ یہ رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک گلیشیر کے دامن پر کھڑا ہوں۔ جو یخ کا ایک سو فٹ اونچا پہاڑ جیسا تھا جس کے بارے میں تصور کیا جاسکتا تھا کہ وہ کبھی بھی ٹوٹ کر ایک آفت بن سکتا ہے۔ یہ نظارہ بے حد پُرکشش تھا اور میں اس کی وجہ سے کچھ دیر تک اپنا سر درد بھول چکا تھا۔

میں نے چاہا تھا کہ میں اس درے کے پاس بیٹھ کر سورج کو چڑھتے

دیکھوں لیکن میری قوت جواب دی چکی تھی اور اب میں ہر حال میں پہاڑ سے نیچے اترنا چاہتا تھا تا کہ میں اطمینان سے سانس لے سکوں۔ میں اس چٹان پر اتر گیا جہاں میں نے اپنے خچر کو باندھا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ میں اپنی قوت واپس حاصل کر رہا ہوں۔ جب میں لیہہ پہنچا تو میں نے اپنے رہنما کے بارے میں دریافت کیا لیکن مجھے کچھ بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا اور میں یہ نہیں جان سکا کہ اس نے کیوں مجھے چکمہ دیا؟

لیہہ سے کوئی بیس میل دور ہیمس کے نام سے ایک بہت بڑی اور اہم خانقاہ ہے جہاں ہر بیس سال کے بعد ایک بہت بڑا مذہبی جشن منایا جاتا ہے۔ لہذا ڈاکٹر نیو اور میں نے ٹٹو کرایہ پر لیے اور ہیمس جانے والے زائرین کے قافلے سے جا ملے۔

یہ ایک دلچسپ اور فرحت بخش نظارہ تھا کہ ہر طبقے کے لوگ پیدل یا گھوڑوں پر سوار ہو کر اس دور دراز خانقاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ کئی ٹٹوؤں پر تو دو دو شخص سوار تھے جن میں مرد آگے اور اس کی بیوی پیچھے بیٹھی تھی۔ لداخ میں چونکہ ایک عورت ایک سے زیادہ شوہر رکھتی ہے لہازا بیوی مالک اور آقا ہوتی ہے۔ اس لیے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بیوی آگے بیٹھی ہوگی اور ایک یا ایک سے زیادہ شوہر اس کے پیچھے بیٹھے ہوں گے۔ ہم نے بھی ایک گھوڑے پر تین سواروں کو دیکھا۔ ان میں دو خواتین تھیں، ایک بوڑھی عورت اور ایک خوبصورت دوشیزہ جس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے تھے۔ جب ہم ان کے پاس سے گزرے تو انھوں نے ہمیں اشارہ کیا اور مسکرائیں۔ ہم نے سوچا کہ وہ بہت ہی ماڈرن قسم کی عورتیں ہوں گی پھر ہمیں خیال آیا کہ وہ چند روز پہلے ہماری میزبان تھیں جب ایک بندۂ خدا تبّتی، اس کی بیوی اور بیٹی نے چائے پر ہمیں دعوت دی تھی۔ البتہ ہم انھیں نہیں پہچان سکے کیونکہ یہاں ایک رسم یہ ہے کہ معزز خاندانوں کی خواتین اپنے

چہروں پر کیچڑ کی لپائی کر کے انھیں چھپاتی ہیں۔ لیکن ایک مذہبی سفر کے دوران اپنے چہروں کو اس طرح بگاڑ نہیں لیتیں۔

ہیمس پہنچنے میں ہمیں دو دن لگ گئے۔ یہ خانقاہ پہاڑ کے ایک طرف ایک تنگ وادی میں واقع ہے۔ اس کو بہت اونچائی پر تعمیر کیا گیا ہے جس کی وجہ مجھے یہ بتائی گئی کہ جب سکھوں نے اس ملک پر حملہ کیا تو اسے لوٹے جانے سے بچانے کی خاطر اس کی عمارت اس بلندی پر بنائی گئی۔ اس کے اندر بہت ہی نایاب خزینے ہیں جن میں چینی ملبوسات اور جواہرات کی وافر تعداد شامل ہے۔

اس سلسلے میں جشن ایک کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ جہاں سے یہ خانقاہ ایک عالیشان محل کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں تین سو لاما ہیں۔ جو زرد چغے پہنتے ہیں اور سرخ لباس پہننے والوں سے افضل مانے جاتے ہیں۔ یہ جشن سارا دن اور اگلے دن دوپہر تک جاری رہتا ہے۔ اس میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا جس سے یہ بے حد تکان دہ ہوتا ہے۔ اس تماشے کا مقصد لوگوں کو اس طاقت سے آگاہ کرنا ہے جو لاماؤں کو بعد از مرگ نصیب ہوتی ہے۔ اس میں جہنم کا سارا ایذا رسان عمل پیش کیا جاتا ہے اور دیکھنے والوں پر باور کیا جاتا ہے کہ اس عذاب سے صرف لاماؤں کے تقدس سے ہی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک بھی لفظ بولا نہیں جاتا، صرف اسے دکھائی جاتا ہے۔ اس جشن کو خانقاہ کے باجے سے ترنم میں رکھا جاتا ہے۔ باجا بجانے والوں کو ایک اور شخص ہدایات دیتا رہتا ہے جس کے سامنے ایک بہت بڑی کتاب ہوتی ہے۔ بڑے کمرے کے بیچوں بیچ آگ جلائی جاتی ہے۔ اس میں لاما داخل ہوتے ہیں جن کے منہ پر حیوانوں کے چہروں والے خوف ناک مکھڑے لگے ہوتے ہیں۔ ان حیوانوں میں کتے، چیتے، اژدہے وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں سہ طرفہ کانٹے لے کر ایک آدمی کا کیچڑ سے بنا پتلا اسی آگ کی نذر کرتے ہیں پھر وہ شیطان نما

انسان والہانہ رقص کرتے ہوئے اس پُتلے میں اپنے کانٹے چبھوتے ہیں تا کہ وہ اپنے شکار پر جسمانی عذاب نازل کریں۔ یہ نظارے ایک طویل وقت پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر خانقاہ کے مرکزی دروازے سے لاماؤں کی ایک جماعت نمودار ہوتی ہے۔ وہ بھی رنگین چینی ریشمی کپڑے پہنے ہوئے اور بڑے بڑے مکھوٹے لگائے ہوتے ہیں۔ وہ اس آگ کے گرد ناچتے رہتے ہیں جس میں اپنے بازوؤں سے شعلوں کی طرف عجیب اشارے کرتے ہیں۔ پہلے وہ گویا تکلیف کے عالم میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ عمل اس قدر بھاری بھر کم لگتا ہے کہ اس سے انسانی اعصاب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس دوران باجا دہشت ناک انداز سے دھیمی رفتار کے ساتھ بجتا رہتا ہے۔

پھر موسیقی دھیرے دھیرے تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے جب تک کہ یہ مقدس لامار قصندہ درویشوں کی گرداب کے دائرے کی طرح ناچتے ہیں۔ باجے والے بھی جیسے شہنائیوں کی چیخ پکار، ڈھولوں کی پرشور تھاپ اور دوسرے آلاتِ موسیقی سے وجد میں آجاتے ہیں۔ پھر یکا یک سارے ماحول پر قبرستان کی سی خاموشی چھا جاتی ہے اور ہر ایک کو اس دھما چوکڑی سے سکون ملتا ہے۔ ہم سب اس راحت کے لیے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ پھر یہ ناچ شروع سے آخر تک دوبارہ ناچا جاتا ہے جس میں ہر تین سیکنڈ کے بعد ایک قدم اٹھایا جاتا ہے۔ اب یہ رقاص لاما تھک کر چور ہوئے ہیں اور وہ ایک ایک کر کے خانقاہ کے اسی دروازے سے واپس کھسکتے ہیں جہاں سے وہ اپنے کرتب سکھانے نکلے تھے۔ اس کے فوراً بعد لاماؤں کی ایک اور جماعت مختلف اور زیادہ بڑے مکھوٹے پہنے سامنے آجاتی ہے۔ ان میں سے کئی ایک کے چہرے بھیانک لگتے ہیں۔ وہ بھی باجے کے سہارے ناچ گانے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح ایک جماعت دوسری کے بعد پورے دن اور اگلے دن کی دوپہر تک وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہے۔ آگ ابھی تک

جلی ہے اور شیطان اسے اپنی مرضی سے جلانے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد مقدس ترین لاماوؤں کی آمد ہوتی ہے جو اپنے ساتھ پاکیزہ پانی لاتے ہیں جس سے وہ شعلوں کو بجھا دیتے ہیں۔ پھر شیطان ایک ایک کر کے شور وغل مچاتے ہوئے منظر سے نکل جاتے ہیں۔ اصل میں یہ شور وغل زوردار آندھی کی وجہ سے سنائی دیتا ہے جس کے بعد شیطان، مکھڑے، نوکیلے کانٹے، سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جو اصل میں خانقاہ میں ہی داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ حاضرین کے لیے ایک خاص دعائیہ مجلس کا انعقاد کرنا تھا۔ ایک کھلے احاطے میں جو خانقاہ کے برآمدے کے سامنے تھا، ایک مذبح تھا جسے روایتی زیورات، چراغوں، صاف پانی، جامِ مئے اور کھانے کے قابوں سے سجایا گیا تھا۔ پجاری ایک مخصوص لباس پہن کر داخل ہوا، اس نے بھیڑ کی طرف پیٹھ کر لی اور ذبح خانے کی طرف منہ پھیر کر کچھ ورد کرنے لگا۔

دریں اثنا ایک مسخرہ اپنے ہاتھ میں رنگین غبارہ لے کر آیا جسے اس نے پجاری کے سر پر دے مارا اور خود ایک ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ دوبارہ نمودار ہوا، اس نے پجاری کو دھتکارا اور اس پر ایک اور ضرب رسید کر لی۔ پجاری نے اس کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے عبادتی عمل میں پوری طرح محو تھا۔ پھر پجاری نے مزید طمانچے کھانے کے بعد پلٹ کر دیکھا کہ یہ کہاں سے آتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس نے غلط سمت میں نظریں دوڑائیں اور مسخرے نے پھر اُسے جالیا۔ ہمیں مشکل سے یقین آ رہا تھا کہ ہم بودھوں کی ایک سنجیدہ مذہبی رسم کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لوگ اس تماشے سے محظوظ ہو کر زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

مجھے اس تماشے کا آخری عمل سمجھ میں نہیں آسکا۔ میرا قیاس ہے کہ پجاری بھی جب اپنی مذہبی عبادتوں میں گم ہوتے ہیں تو وہ بھی شیطان صفت قوتوں سے

مداخلت کو رد نہیں کرتے۔ بہر حال یہ ایک دلچسپ منظر تھا اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ جو لوگ میلوں کا سفر طے کر کے یہاں آئے تھے وہ کس حد تک ان حرکتوں پر یقین کرتے ہونگے؟ میرا خیال ہے کہ وہ شیطانوں پر زیادہ یقین رکھتے تھے اور ان کے مزاج فطری طور پر مزاح پسند اور خوش مزاج تھے۔ خانقاہ کے سربراہ نے مجھ سے کہا کہ لاما پورے ایک سال تک اس جشن کی تربیت حاصل کرتے تھے، اسی لیے انھیں صحیح انداز میں عبادتی کارکردگی انجام نہ دینے کے لیے طمانچے برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اب ایک موٹی چھڑی لائی گئی جسے پیتل کے لپیٹے سے اور بھاری بنایا گیا تھا۔ مجھے ان لاماؤں سے ہمدردی پیدا ہوئی جو اپنی مذہبی کارکردگی میں پورے نہیں اترے تھے۔ ان کے جسموں پر چربی کی ایسی تہہ بھی نہیں کہ وہ اپنی ہڈیاں اس چھڑی کی مار سے محفوظ رکھ سکیں۔

خانقاہ کے کتوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ لیکن وہ زنجیروں میں بندھے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان کتوں کو قبروں کے آس پاس رکھا جاتا ہے تا کہ وہ مردوں کی ہڈیاں چبا سکیں۔ ان میں سے چند ایک تو وحشی درندے تھے۔ میرے ایک دوست پر جب ان درندوں نے حملہ کیا تو اس کے ایک پہلوان ہونے کے باوجود اسے بستر میں دو دن گزارنے پڑے۔ میں خود ایسی صورت بحال سے بال بال بچا۔ میں ایک دن بغیر بلائے ایک خانقاہ کو دیکھنے گیا۔ جب میں وہاں کی ایک تنگ گلی سے گزر رہا تھا تو میں نے ایک کتے کو گہری نیند میں دیکھا۔ میں نے اپنی نادانی میں سوچا کہ اگر میں ہلکے ہلکے قدم اٹھاؤں گا تو شاید اس کے پاس سے گزر سکوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ خفتہ کتا اصل میں جاگ رہا تھا۔ وہ زنجیروں میں بھی بندھا نہیں تھا اور وہ دم زدن میں مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ خوش قسمتی سے میرے ہاتھ میں ایک عصا تھا جسے میں نے اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ چونکہ یہ راستہ نہایت تنگ تھا، میں اپنے اس ہتھیار کو اسے ڈرانے کے لیے گھما بھی

نہیں سکتا تھا۔ میں ایک بُت کی طرح ساکن و جامد ہو کر کھڑا رہا اور دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف مُڑنے لگا۔ کتا بھی ایک ایک انچ چل کے میری طرف آ رہا تھا۔ اس طرح میں آخر کار وہاں سے کسی جسمانی چوٹ کے بغیر نکل آیا۔ میں نے یہاں یہ سبق سیکھ لیا کہ مذہب داروں کی مذہبی قیام گاہوں میں اس طرح ہرگز نہیں گھسنا چاہئے۔

اب ہمیں لیہہ اور اس کے بعد سری نگر کی طرف کوچ کرنا تھا۔ ہم نے ہیمس پر پادریوں، پجاریوں اور گرجے کو الوداع کہا جو تبت کی سطع مرتفع سے یہاں یہ لہو ولعب دیکھنے آئے تھے۔ ہم دوسرے دن لیہہ پہنچے جہاں ہم نے اپنے مہربان دوستوں کمشنر اور مشنریوں سے رخصت لی اور مغرب کی سمت سفر پر روانہ ہوئے۔ ان جگہوں پر ہم نے ہر وقت اپنے خیمے گاڑھ کر انھی میں رات کو سونے کو ترجیح دی ورنہ ڈاک بنگلوں میں ہمیں کیڑوں مکوڑوں اور ٹڈیوں کے حملے کا شکار ہونا پڑتا۔ ایک موقعے پر ایک نوجوان افسر نے ہمیں کھانے کی عوت دی۔ نیو نے دیکھا کہ افسر کے پاس ایک ایسی پلیٹ بھی تھی جو نیو ہی کی تھی اور وہ اس نے پہچان لی تھی۔ دراصل ایک مرتبہ یہ افسر نیو کے گھر میں مہمان تھا اور اس کے ساتھ اُس کا نوکر بھی تھا۔ اس نوکر نے اپنے افسر کی خوشنودی کے لیے نیو کی میز سے ایک پلیٹ چرا کر افسر کو دی تھی اور اب وہی پلیٹ میز پر جلوہ نما تھی۔ نوکر عام طور پر ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ ذاتی طور پر میرا ایک نوکر جو اس چال سے واقف ہے۔ وہ مجھ سے ہر بار کہتا ہے کہ میں اپنے دوستوں کو یاد دلاؤں کہ جب بھی نوکر اُن کے گھروں سے باہر جائیں تو وہ سارے چمچے اور چھری کانٹے وغیرہ گن کر وہاں سے چلیں۔

ایک دوسرا رواج بھی مجھے دلچسپ لگا:

میں نے ایک قلی کو سڑک پر دیکھا جس کا منہ زمین پر تھا جس سے دھواں

نکل رہا تھا۔ جب میں نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ گھر سے اپنا حقہ لانا بھول گیا تھا۔ چونکہ وہ تمباکو کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لہازا اس نے زمین میں ایک چھوٹی سرنگ کھود کر اس میں دو سوراخ کیے تھے۔ ایک سوراخ کے اوپر اس نے تمباکو اور چند انگارے رکھے تھے اور دوسری طرف وہ کش لگا کر تمباکو نوشی کررہا تھا۔ تعجب ہے کہ کس طرح ایک شخص سیکھتا اور زندہ رہتا ہے۔

ملبے سے گزر کر ہم نے کاروان کی سڑک چھوڑ دی تا کہ ہم سورو کے راستے نُن کُن کے نیچے سے وارڈون نالے پر پہنچ سکیں۔

ہم شیر گل خانقاہ سے گزرے جسے ایک چٹان میں بنایا گیا ہے۔ اس کی کھڑکیاں چٹانوں میں سے نکلی ہوئی ہیں۔ اس میں اندر جانے اور باہر آنے کے راستے بھی عجیب ہیں۔ رسی سے باندھی گئی ایک ٹوکری میں آنے والے شخص کو بٹھا کر اسے انتہائی نفاست سے اوپر کھینچا جاتا ہے تا کہ بن بلائے لوگوں کو اندر آنے نہ دیا جائے۔ ہم نے جب سورو دریا کو پہلی بار دیکھا تو یہ نظارہ قابل دید تھا۔ اس نے مجھے جنت کی وہ تصویریں یاد دلائیں جو میں نے بچوں کی تصویری کتابوں میں دیکھی تھیں۔ ہم ایک چوٹی سے سورو کو دیکھ رہے تھے جہاں اس میں وسعت پیدا ہوئی تھی اور یہاں چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بید کے درخت قطار اندر قطار اُگے تھے۔ پیچھے اور اوپر دیو قامت چوٹیاں بلند ہوتی ہوئی بیچ میں ایک وادی کو گود لئے ہوئے تھیں۔

جب ہم پُل پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ یہ ہمارے ٹٹوؤں کے لیے بہت کمزور تھا۔ دریا کو بھی پار نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس کی رفتار طوفانی تھی اور وہ گھن گرج والا موجیں مارتا تھا۔ ٹٹو اسے پار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ اب کیا کریں؟ ٹٹوؤں کے مالکوں نے جلد ہی اس معمے کو حل کیا۔ انھوں نے ٹٹوؤں سے بوجھ اتار کر انھیں دریا پار کروانے کا قصد کیا۔ انھوں نے ٹٹوؤں کی گردنوں

میں ایک رسی باندھی۔ٹٹوؤں کو پانی میں گھسیٹا گیا اور ٹٹو والوں نے پل پر چلتے ہوئے رسی کو زور سے اوپر کی طرف کھینچ کر رکھا تاکہ ٹٹوؤں کے سر پانی کی سطح سے اوپر رہیں۔اس طرح ہمارا ذہنی تناؤ کم ہوگیا۔ہمارے سبھی ٹٹو بحفاظت پار پہنچے لیکن ایک ٹٹو والے کو پل پر اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیےبہت مزاحمت کرنا پڑی۔

سورو کا گاؤں نُن کُن چوٹیوں کے نیچے واقع ہے جو سطح سمندر سے ساڑھے تیئس ہزار فٹ اونچی ہیں۔یہی وہ چوٹیاں ہیں جو سری نگر سے دکھائی دیتی ہیں اور یہ سفید اہرام مصر کی شکل رکھتی ہیں۔ہم جہاں سورو دریا کے پاس کھڑے تھے وہ ایک شاندار نظارہ تھا اور اس کے دیوہیکل گلیشیر سورج کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔

سورو سے نکلنے کے بعد ہم نے مارموت جانوروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو دیکھا جو خرگوشوں کی طرح اپنے جھنڈوں میں رہتے ہیں۔وہ گاجر کے رنگ کے ہوتے ہیں اور ان کا قد چھوٹی لومڑی جتنا ہوتا ہے۔وہ اپنے گاؤں کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کا کام کرتے ہیں جب وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر دیہاتیوں کے دشمن پر نظر رکھتے ہیں۔اگر انھیں ایسا کوئی آدمی نظر آجائے تو وہ زور زور سے سیٹی بجاتے ہیں اور پھر اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔یہ ایک پُرکشش جانور ہے۔انھیں جنگلی لہسن پسند ہے جو اس خطے میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

ہم دونالہ درے سے وارڈن وادی میں داخل ہوئے اور ہمیں ایک گلیشیر پر سات میل تک چلنا پڑا۔جب ہم یہاں اونچائیوں سے نیچے چھلانگ لگاتے تھے تو ہمارے خون میں حرارت کی لہر دوڑتی لیکن ہمیں اس یخ بستہ برفانی تودے پر پھسلنے سے بچنے کی خاطر جتن کرنے پڑتے۔ہمارا ایک قلی ایک ایسی ہی گہرائی میں گر گیا مگر اس کی پیٹھ پر جو بوجھ تھا وہ یخ کی سلوں میں اٹک گیا اور وہ بال بال

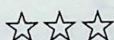
بچ گیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے سبھی ساتھی کیمپ تک سلامت پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں اپنے خیموں کے لیے محفوظ جگہ کو تلاش کرنا تھا کیونکہ ہم اُس جگہ سے گزر رہے تھے جہاں جنرل آئی۔ ایم۔ ایس خیمہ زن تھا۔ رات کو ایک بھاری پسّی نے اسے اوراس کے سارے نوکروں کو موت کی نیند سلا دیا۔

وارڈن ایک تنگ وادی ہے جو بہت ترچھی اور عمودی چٹانوں سے بھری ہے۔ لہازا برفانی تودے اور پسّیاں بار بار گرتی ہیں اور ہر ایک کو چاروں پہر اپنی آنکھ کھلی رکھنا پڑتی ہے۔

ہمارے سفر کے دوران ڈاکٹر نیو نے اچھا خاصا طبی کام سرانجام دیا۔ وہ چائے کے بعد بیماروں کو دیکھتا اور یہ کام صبح بھی جاری رہتا۔ کچھ بیمار ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک ہمارے ساتھ ساتھ آجاتے جب انھیں متواتر علاج کی ضرورت رہتی۔ اس سفر میں ڈاکٹر نیو نے موتیا بند کے بیالیس اوپریشن کیے۔ ہمیں ان لوگوں کی شادمانی دیکھ کر خود بھی خوشی ہوتی جن کی بینائی بحال ہو چکی تھی۔ اوپریشن کے بعد، جو صرف چند لمحوں میں کیا گیا تھا، ڈاکٹر نیو بیمار کے ہاتھ پکڑ کر اس سے کہتا کہ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں گن لے۔ جب کسی بیمار نے انگلیوں کی صحیح تعداد بتائی تو ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر یہ مسکراہٹ قہقہوں میں تبدیل ہوگئی جب بیمار کو پتہ چلا کہ یہ کوئی خواب یا جادو نہیں تھا ایک حقیقت تھی۔ پھر آنکھوں پر پٹی باندی گئی اور بیمار سے تاکیداً کہا گیا کہ وہ دو ہفتوں تک اسے نہ کھولے۔ موتیا بند کا اوپریشن ایک صاف ستھرا اور جراحی کا حیران کن عمل ہے۔ اس شخص پر واقعی رشک آتا ہے جو صرف چند لمحوں میں دوسروں کو بینائی بخشے۔ اسے کسی حد تک ایک معجزہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ اُس معالج (یعنی حضرت عیسیٰ) کی طرح کا کارنامہ ہے جس نے گلیلی میں سبھی بیماروں کا علاج کیا تھا۔

وارڈن سے ہم درے پر چڑھ گئے اور پھر صنوبر کے درختوں کے جنگل سے گزر کر وادیٔ کشمیر میں داخل ہو گئے۔اس دوران ہم نے گھاس سے بھری پیاری مرگیں اور جگمگاتی ندیاں دیکھیں جب تک کہ ہم اسلام آباد میں دریا تک نہیں پہنچے۔

اب ہمیں کتنا اچھا لگ رہا تھا کہ ہم کشتی میں ٹانگیں ہلائے بغیر سفر جاری رکھیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس سفر کا اتنا لطف کس طرح لیا؟ اب میں رفتہ رفتہ اڑتالیس میل دوسری نگر میں اپنے گھر پہنچ رہا تھا۔



شاعرِ کشمیر، مہجورؔ

(معروف ترقی پسند دانشور اور فلم اور تھیٹر کے سرکردہ اداکار مرحوم بلراج ساہنی نے یہ مضمون 1934ء میں انگریزی میں تحریر کیا، جس کی بدولت غلام احمد مہجور پہلی بار ایک کشمیری شاعر کی حیثیت سے باہر کی دنیا میں متعارف ہوا۔ یہ مقالہ سہ ماہی ''وشوا بھارتی'' نام کے ایک اعلیٰ معیاری رسالے میں اس کے نومبر 1938ء تا جنوری 1939ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس انگریزی جریدے کو رابندر ناتھ ٹیگور نے شروع کیا تھا اور یہ بنگال میں شانتی نکیتن سے اشاعت پذیر ہوتا تھا۔ یہاں پر اس دستاویزی مضمون کا اُردو ترجمہ پہلی بار نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔ خیالؔ)

یہ آج سے چار سال پہلے کی بات ہے۔ جھیل کے اوپر چلتی ہوا گویا یخ بستہ تھی۔ سورج توسہ میدان کے برف پوش پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو چکا تھا، جس سے وادی وقت سے پہلے ہی ایک غمگین ماحول میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہماری کشتی بھی ہچکولے کھاتی ہوئی جھیل میں تین گھنٹوں سے زیادہ دیر سے چل رہی تھی۔ کشتی بان کی معمولی غفلت سے آدھ سیر وزنی پانی کے چھینٹے ہماری نشستوں پر پھیل چکے تھے۔ ہمارے پاس اس خدشہ کے وافر ثبوت تھے کہ ہم ابھی نہ ابھی پانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر ایک سرد موت مرجائیں گے۔ اصل میں اس بے زبان اور بے چاری کشتی کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ ایک تیر کی طرح بھیں بھیں کرتی ہوئی چل سکتی تھی بشرطیکہ اس پر متوازن بوجھ لدا ہوتا، لیکن اس

میں کم از کم سات سواریاں براجمان تھیں، جن میں ہمارا میزبان جو چپ چاپ اس طرح بیٹھا ہوا تھا گویا اُس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ پروفیسر دیویندر ستھیارتھی جو میونسپل کمیٹی کے چوہے پکڑنے والے اہلکاروں کی طرح لوک گیت جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ میں، میزبان کا منشی، اُس کا نوکر جو سماوار میں پھونک مار مار کر اپنے گلے کو بے حد دُکھ دے رہا تھا، مقامی مانجھی کا دوست اور خود مانجھی، جس کے بارے میں ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ وہ بہرا بھی تھا اور اس کی قوت بینائی بھی زائل ہوتے ہوتے آدھی رہ گئی تھی اور اس کا ایک دوست جو نہ جانے کیوں کشتی میں موجود تھا۔ بہر حال میرے دوست کا یہ کہنا کہ اس قسم کی کشتیاں مغلوں نے عاشقوں اور معشوقوں کی عشقیہ سرگرمیوں کے لیے بنوائی تھیں، کسی طرح ہضم نہیں ہو سکا۔

اگر ہم نے کشتی کو صحیح راہ پر لگایا ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم اس قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے، کیونکہ جس گاؤں میں ہمیں جانا تھا وہ صرف آٹھ میل کی دوری پر تھا، جہاں ہم دو گھنٹوں میں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن بہرا انجی راستہ بھول چکا تھا اور وہ ہماری بے چینی سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ ہم نے جب بھی اُس سے کچھ کہا تو وہ اپنا سر ہلانے لگتا اور وہی کرتا رہا جو ہماری مرضی کے برعکس تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دیر تک جھیل میں گھاس سے بھری جھاڑیوں اور سبزی کے چلتے پھرتے کھیتوں کا چکر لگاتے رہے۔ میزبان کے کہنے پر اب ہم خاموش ہو گئے۔ ہم اپنے ہاتھ گھٹنوں میں ڈال کر احمقوں کی طرح بیٹھے رہے اور آسمان پر اُن ستاروں کو دیکھتے رہے جو ہمیں بے کار سوراخوں کی طرح لگتے تھے۔

اس منحوس گھڑی پر مانجھی کا دوست جو اب تک کمبل میں سر چھپائے بیٹھا تھا یکا یک زور سے گانے لگا۔ یہ گانا نہیں بلکہ ایک چیخ و پکار تھی۔ اُس کا گانا اتنا پُرشور اور وحشیانہ انداز کا تھا کہ درختوں پر سوئے ہوئے پرندے بھی خوف سے جاگ اُٹھے:

مہجور افسانۂ حسن سنائے گا

پھر وہ دوست میرا محبوب بن جائے گا

اس کے معنی بھلا ہندوارہ دیہات کے لوگ کیا جانیں؟

اے جنگل کی مینا! ذرا میرا سوزِ دل تو سن لے

ظاہر ہے کہ اسے ہمارے اُترے ہوئے چہرے دیکھ کر بھی ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اگر کشتی ڈوب جاتی تو وہ اپنی چادر دور پھینک کر کوئی دوسری کشتی پکڑ لیتا، اور اگر نزدیکی فاصلے پر کوئی کشتی نظر نہیں آتی تو کنارے تک تیرتے تیرتے پہنچ جاتا۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آئی تھی کہ وہ اُن دیہاتیوں میں سے تھا جو ایک سیب بیچنے کے بعد خریدار کے اہل وعیال کو دعائیں دیتے ہیں۔ اس نے یہ باور کیا تھا کہ ایک پنجابی کی دوستی کسی کمزور لکڑی کے درخت کی آگ کی طرح عارضی ہوتی ہے۔ بہرحال اس کے بے ہنگم شور نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں نے میزبان سے دریافت کیا کہ ان اشعار کے کیا معنی ہیں؟

اس گیت کی نغمگی نے مجھے بے حد متاثر کیا، کیونکہ دوسرے ہزاروں سیاحوں کی طرح میں بھی سالہا سال سے وادیٔ کشمیر کے فقید المثال حسن کی خوبصورتی سے آسیب زدہ ہو چکا تھا۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں بھی محبت اور عشق کی آگ دھیمے دھیمے جل رہی ہوگی۔ میں نے اپنے بارے میں محسوس کیا کہ میں ہندوارہ گاؤں کے اُن دیہاتیوں سے بھی گیا گزرا گنوار ہوں جن پر مہجور نے اسی گیت میں طنز کے تیر چلائے تھے۔ میں اس گیت کے خالق سے ملاقات کے لیے بیتاب ہوا۔ میں نے اس کشمیری سے پوچھا کہ یہ نغمہ کس نے لکھا ہے؟

"مہجور شریف نے" وہ اُس مصنوعی بہادری کے انداز میں بولا جو ہر کشمیری کا خاصہ ہے۔

''اچھا، وہ کہاں رہتا ہے؟''

''مہجور شریف! وہ بہت دور رہتا ہے''

پھر اُس نے اپنے ہاتھ ہر طرف ہلا ہلا کر کہا، ''وہ اجمیر شریف میں رہتا ہے''۔

وہ ایک دروغ گو نکلا، کیونکہ سرینگر واپس لوٹنے پر چند مشکلات کے بعد میں نے معلوم کر لیا کہ مہجور کا پورا نام غلام احمد ہے اور وہ سوپور میں ایک پٹواری ہے۔ وہ اپنی شاعری کی بدولت اُن لوگوں میں بھی مقبول ہے جو اُس کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کبھی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اب زندہ نہیں ہے اور کبھی اس کے ساتھ اختراعی رومانوی افسانے جوڑے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی کام کے سلسلے میں سرینگر آتا ہے تو اُسے کوئی نہیں پہچانتا۔ اس کے باوجود اس کے نغمے اور گیت ہر کوئی پسند کرتا ہے جن میں بارہمولہ سے لے کر پیر پنچال تک کے مرد وزن اور بچے شامل ہیں۔

اگر مہجور آج کوئی گیت لکھتا ہے تو وہ صرف پندرہ دنوں میں ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے، جن میں سکول جاتے ہوئے بچے، دھان کوٹتی ہوئی لڑکیاں، کشتی کھیتے ہوئے مانجھی، بوجھ ڈھوتے ہوئے مزدور اور ہر ایک فرد بشر شامل ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے، اگر مہجور کے گیتوں کا مجموعہ فروخت کے لیے چھاپا جائے تو اس کی دس کاپیاں مشکل سے بک سکتی ہیں لیکن زبانی زبانی یہ نغمے ایک دوسرے تک دم زدن میں پہنچنا ایک حیران کن معجزے سے کم نہیں۔ اس زبانی ترسیل کے سلسلے کو تعجب خیز ہی کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال میں کچھ عرصے تک مہجور کے کلام کی جمع بندی کرتا رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مہجور کی شاعری کا حسن صرف خیال کی گہرائی ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایسی شاعری ہے جس میں محسوسات اور موسیقی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں:

آ ! گلِ گلشنِ نشاط — کھول دے ناز کی بساط
شوق سے مسکراتے آ — لعل و گہر لُٹاتے آ
باغ میں تم کیا آ گئے — بوسے سمن نے لے لیے
نرگسوں کا بھی شوق ہے — جام چھلکتے لے کے آ
جھیل کی سیر کر نگار — گھوم بہ سوئے شالیمار
آنکھوں کے بجرے ہیں تیار — پار انھیں کراتے آ
مجھ حسیں کی ہے کیا خطا — بے رحم سنگ دل بتا
مار نہ مجھ کو برملا — پیار سے گنگناتے آ
کس کو سناؤں رنج و غم — میرے پیا تیرے ستم
میں گھلی جاؤں دم بہ دم — پیار جتا جتا کے آ
ڈھونڈوں میں تجھ کو کوبہ کو — جانے کہاں چھپا ہے تو
کس کی ہے تجھ کو آرزو — راز یہ اب بتا کے آ
کھیل کہیں بگڑ نہ جائے — دوست پلٹ کے رہ نہ جائے
جانے وہ آئے یا نہ آئے — سوزِ مہجور سناتے آ

آخر کار میں اچانک مہجور کے ساتھ ملاقی ہوا۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ میں ایک تانگے پر سوار تھا جو تقریباً اُسے کچلنے والا ہی تھا کہ وہ بال بال بچ گیا۔ کیونکہ وہ خاموشی سے ایک طرف ہولیا، میرے ہم سفر نے مجھے اشارے سے کہا، ''دیکھو! یہی مہجور ہے''۔ وہ ایک عجیب طرح سے پگڑی باندھے ہوئے تھا جس کی لاٹوں تلے اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ یہی وہ شخص تھا جس نے لاکھوں لوگوں کے دل جیتے تھے اور اُنھیں بے قرار کیا تھا۔ مہجور اگر اپنی ایک انگلی سے اشارہ کرے تو وہ عوام کو اُسی راہ پر چلنے پر آمادہ کرے گا جس پر وہ انھیں گامزن کرنا چاہتا ہو۔

مگر مہجور کو اپنی غلط تشہیر کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اُسے چاپلوسی سے نفرت ہے۔ حال ہی کے فسادات میں اُسے بڑی بڑی رقومات کی پیش کش کی گئی تھی کہ وہ ایسے گیت لکھے جن سے فرقہ وارانہ مفاہمت کو زک پہنچے، لیکن سفید پوش اور مسکین ہونے کے باوجود بھی اُسے پیسے کا لالچ نہیں ہوا۔ مہجور کی انسان دوستی اور تنہا پسندی میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔

بہر حال میں نے تانگے سے چھلانگ لگائی اور اس سخن گو کو جا لیا۔ میں اس بات کو دوہرا کر بے حد خوشی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔

مہجور کا جنم 1888ء میں یہاں سے بیس میل دور اونتی پورہ کے متری گاؤں میں ہوا۔ اس کا باپ پیر عبداللہ شاہ ایک زمیندار اور خاندانی پیر تھا۔ مہجور نے ایک آرام دہ اور عزت کے ماحول میں پرورش پائی۔ لیکن باپ کے انتقال کے بعد اُس نے پیری فقیری ترک کر کے ایک عام آدمی کی سی سادہ زندگی کو اپنا لیا۔ اسی وجہ سے آج تک اس کے دل میں پیروں اور پجاریوں کے لیے کوئی احترام نہیں۔

مہجور کو اپنے باپ سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل ہوئی، لیکن اس کے دل میں اپنی مادری زبان سے محبت روز بروز گہری ہوتی گئی اور اس کے دل میں شاعری کا شوق بھی جاگنے لگا۔ اسے مقبول شاہ جیسے اُستاد کی غائبانہ صحبت حاصل ہوئی اور اس نے عجب ملک اور اس کی معشوقہ نوش لب کا افسانہ از بر یاد کر لیا۔

مہجور نے پہلے پہلے فارسی میں شاعری کی، کیونکہ بدقسمتی یہ ہے کہ پڑھے لکھے کشمیری بھی اپنی مادری زبان کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مہجور فارسی سے متاثر نہیں ہو سکا۔ 1911ء میں اسے پنجاب جانے کا موقعہ ملا۔ وہاں بڑے بڑے باکمال عالموں اور اساتذہ نے اس کی توجہ فارسی سے اُردو کی طرف

پھیرنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی اور مہجؔور چودہ سال تک فارسی اور اُردو کے دائرے کے اردگرد بے مقصد گھومتا رہا۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے ذہین نوجوان اکثر و بیشتر اپنا قیمتی وقت مُختلف زبانوں میں تجربے کر کر کے ضائع کرتے ہیں۔

پھر بالآخر ایک دن ایسا آیا کہ ایک معمولی واقعہ مہجؔور کے نظریے میں انقلاب لانے کا باعث بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا غمگین اور اُترا ہوا چہرہ لے کر ایک شام کسی گاؤں میں رات کے وقت گھوم رہا تھا کہ وہ ایک چنار کے درخت تلے بیٹھ کر اپنی ناکام زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ دریں اثنا اُس نے دیہاتی لڑکیوں کی ایک ٹولی دیکھی جو مشہور کشمیری شاعرہ حبہ خاتون کا یہ مقبول عام نغمہ اپنی رسیلی اور پُرسوز آواز میں گا رہی تھیں:

آؤ میرے پھولوں کے رسیا — قدم قدم گلزار کھلائیں
موت کے بعد ہے اللہ بیلی — آؤ چلیں ہم چنیں چنبیلی
آؤ میرے پھولوں کے رسیا — راہ تکوں میں بیٹھ اکیلی
کیوں روٹھے ہو ساجن ہم سے — آؤ چلیں باندھے گلدستے
آؤ میرے پھولوں کے رسیا — دور دیس میں کیا سکھ لوگے
دنیا والے تہمت جوڑیں — آؤ چلیں ہم کاہو توڑیں
آؤ میرے پھولوں کے رسیا — لیکھ کی دھارا کیسے موڑیں
مست پڑے ہیں نیند کے مارے — آؤ چلیں ہم ندی کنارے
آؤ میرے پھولوں کے رسیا — بیٹھی ہوں سندیس سہارے

اس گیت نے مہجؔور کو مست و مخمور کر دیا۔ اُسے اسی وقت جیسے الہام ہوا، اور وہ کچھ دیر تک ایک عالم مدہوشی میں بیٹھا رہا۔ وہاں سے جب اُٹھا تو اُس کے ہونٹوں پر حبہ خاتون کا اسی طرز پر موزون کیا ہوا ایک نغمہ مچل رہا تھا جو چند دنوں

میں مکمل ہوا۔ پھر مہجور نے دوبارہ اُردو کی طرف کبھی نہیں دیکھا۔

کشمیری میں اس کی یہ کوشش کامیاب رہی۔ یہ گانا آج بھی اہل کشمیر کے لئے ایک محبوب فن پارہ ہے۔ اس کا یہ ابتدائی بند وادیٔ کشمیر میں زبان زدِ خاص وعام ہے:

اے پھولوں کے رسیا — تو کیوں مجھ سے روٹھا
اے پھولوں کے رسیا — ٹھہرے رہتا سنتا
میرا چارہ کرنا — اے پھولوں کے رسیا
کب تک دور سے تکتی — حور میں تم پر مرتی
چپ چاپ ہوں میں روتی — اے پھولوں کے رسیا
پڑی میں پربت پر ہوں — خون میں میرے آنسو
سن تیرے ذمہ ہوں — اے پھولوں کے رسیا
پیار نے دی بدنامی — جانے خاص اور عامی
جھڑکی تانا کانی — اے پھولوں کے رسیا
رات گئے روتی ہوں — پریتم پر واری ہوں
مینا طوطے کی ہوں — اے پھولوں کے رسیا
لیکھ کو کون جانے — جس کی ہوں کب آئے
بھرتی ہوں میں آہیں — اے پھولوں کے رسیا
چل بن سہیلی، اس کے — کان بھرے ہیں کس نے
جانے وہ کب دیکھے — آ پھولوں کے رسیا
سوختہ دل دکھلاتی — آتے حال بتاتی
تب کیا جب نہ ہونگی — اے پھولوں کے رسیا
شکوے کون سنائے — کون اسے بتلائے

سیج گلوں کی دیکھے آپھولوں کے رسیا
البیلے اٹھلاتے جال میں پھانسا اس نے
دل ٹکڑے ٹکڑے ہے اے پھولوں کے رسیا
لاگے ہے وہ ان بن جوگی گھومے بن بن
ہوں تیری سنیاسن اے پھولوں کے رسیا
سن پربت سے نالے پیچھے مڑ شہزادے
ایفا کرلے وعدے اے پھولوں کے رسیا
شکوے لکھ لکھ بھیجوں حیلے کیا میں مانوں
کب میں داد کو پہنچوں اے پھولوں کے رسیا
آدھی رات کو نکلوں ناگراج اپنا کھوجوں
گیت ابھاگن گاؤں اے پھولوں کے رسیا
رستے میں منہ موڑا آگے لگے پر چھوڑا
کس کو سناؤں دکھڑا اے پھولوں کے رسیا
تھی میں نیند کی ماتی بن گئی تیری داسی
راتوں راتوں جاگی اے پھولوں کے رسیا
مکھ درشن جو کرتی حسرت پھر نہیں رہتی
تجھ پر قربان ہوتی اے پھولوں کے رسیا
ڈھونڈے ہے وہ مہجور ساحر کے وفا سے دور
جانے کیا ہو منظور اے پھولوں کے رسیا

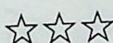
(یہ ترجمہ سلطان الحق شہیدی نے کیا ہے)

اپنی شاعری عوام تک پہنچانے کے لیے مہجور نے ایک انوکھا راستہ اختیار کیا۔ وہ جانتا تھا کہ کشمیر میں جو پڑھے لکھے لوگ اپنے آپ کو دانشور کہتے ہیں

انھیں کشمیری زبان سے کوئی محبت نہیں ہے۔ اُس نے چند لڑکوں کو اپنے گیت ازبر یاد کروائے اور اُن سے کہا کہ وہ یہ نغمے اپنی اونچی آواز میں شہر کی سڑکوں پر گاتے پھریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک ہی ہفتے کے اندر مہجورؔ کا نام ہر زبان پر تھا۔

مہجور اس وقت اپنی عمر کے پچاسویں سال میں ہے۔ مجھے اس کا وہ کلام دستیاب نہیں جو اس نے گزشتہ چار سال میں موزون کیا ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے اچھی شاعری کی ہوگی اور میں جانتا ہوں کہ اس کا تازہ کلام زیادہ سے زیادہ پختہ اور خوبصورت ہوگا۔

کشمیری زبان سے ناآشنا ہونے کی بنا پر میں اس کے شعری سرمایے سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی میں مہجورؔ کے کلام پر تنقیدی نظر ڈال سکتا ہوں، لیکن عام لوگوں میں اس کی مقبولیت اور اس کی پیاری شخصیت کے پیش نظر مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس نے کشمیری شاعری میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہوگا۔



حسین علی تنہا انصاری

بیسویں صدی کے دوران کشمیر میں اردو کے چند ہی ایسے سخن گو گذرے ہیں جنھوں نے اپنی استعداد اور فطری صلاحیت کی بدولت اردو ادبیات کی آبیاری کی اور اپنا نام اس سرزمین کی ادبی دنیا میں جاوداں بنایا۔

بد قسمتی کا مقام ہے کہ ان گنے چنے نامور سخن وروں کو بھی ان کے وقتی مداح اور قرابت دار بھی کم و بیش تغافل کے کھاتے میں ڈال چکے ہیں۔ اس حوالے سے کم از کم ہم اردو دان اور اردو ادب کے شیدائیوں پر یہ اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ انھیں وقتاً فوقتاً یاد کریں اور ان کے فن اور سخن کو تجزیاتی مطالعہ اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام بھی مسلسل طور پر جاری رکھیں۔

حسین علی تنہا انصاری ایک ایسے ہی معروف سخن ور، نقاد اور صاحب علم و دانش شخصیت تھے۔ جنھیں اعلی ترین انسانی خصائص، مہذبانہ طرز کلام اور حسن اخلاق کی ودیعت ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتے اور میں نے کبھی ان کی زبان سے کوئی عامیانہ یا غیر پارلیمانی لفظ یا جملہ نہیں سنا۔

تنہا صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کب کیا اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ اردو اور کشمیری زبانوں میں ان کی نثری اور منظوم تخلیقات کی اشاعت کا آغاز 1953ء میں مرزا عارف کے سہ لسانی ماہوار جریدے ''گل ریز'' سے ہوا اور مختلف موضوعات پر سخن گوئی کے علاوہ انھوں نے اسی ماہنامے میں مختلف موضوعات پر کئی مضامین تحریر کیے جن میں ''غنی کشمیری، ادبی پس منظر اور

دلیل ودعوی کا عنصر‘‘،’’والدین کے ہاتھوں میں تعلیم وتربیت اور’’اقبال‘‘اور فکاہیہ: دروغ برگردن راوی اورترقی قابل ذکر ہیں۔

ایک سرکاری مدرس ہونے کی بنا پرتنہا صاحب اگرچہ عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے مگرایک مخصوص سیاسی نظریہ کی تلاطم خیز موجیں ان کے فکرو ذہن میں ہمیشہ متحرک رہتی تھیں او اس کا اظہاروہ صرف بااعتماداحباب کے سامنے ہی کیا کرتے تھے۔وہ کٹر پاکستان نوازاورخطرناک حدتک ہندمخالف تھے۔

یہ ستمبر 1965ء کے بعدکاواقعہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خون ریز جنگ چھڑگئی تھی۔ایک دن تنہا صاحب نے مجھےفون پراُن کے گھر دلنہ (Delina) بارہمولہ آنے کی دعوت دی تاکہ ہم باہمی دلچسپی کے معاملات پرکھل کر بات کریں۔اس کے لیے انھوں نے یہ شرط رکھی کہ ہم رات انھی کے دولت خانے پر بسر کریں گے۔میرے سوا انھوں نے رشید ناز کی کوبھی اس سہ نفری محفل میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔

میں وہاں پہنچا تووہ سراپا منتظر تھے۔ان کے برادراصغرنشاط انصاری اس دوران ہماری بھرپور خاطرتواضع کرنے لگے۔تنہا صاحب نے گفتگوکا آغاز براہِ راست ہندپاک جنگ کے واقعات سے کیا۔پاکستانی افواج کے جان بازوں کی اختراعی فتوحات کا وہ بار باراور پُر جوش لہجے میں ذکرکرتے رہے۔یہ مبالغہ آمیزی مبنی پرحقیقت نہیں تھی کہ بقول اُن کے ان جانبازوں نے اپنے آپ کو بارود کے ڈھیروں سے باندھ کر بھارتی ٹینکوں کونشانہ بنایااور دشمن پرشاہینوں کی طرح ٹوٹ پڑے،شہادت کاجام نوش کیااور فتح پائی۔حالانکہ جنگ میں کبھی کسی فریق کی فتح نہیں ہوئی۔

میں اس احمقانہ جنگ کے یہ فرضی واقعات سننے کے لیے ہرگز تیارنہیں تھا لیکن تنہا صاحب کے خلوص جیت گئی اورہمارے دلوں میں ان کی تعظیم وتکریم کی

وجہ سے ہم دونوں ہمہ تن گوش رہے۔ اگلے دن علی الصباح مجھ سے کہا گیا کہ میں گاؤں ہی میں بہتے ہوئے آبِ رواں کے ایک نالے پر جا کر منہ ہاتھ دھولوں جب میں وہاں پہنچا تو میری نظر مقابل کے کنارے پر ایک حسینۂ دلنواز پر پڑی جو برتنوں میں پانی بھرنے آئی تھی۔ حسنِ قاتل کا یہ ایک ایسا وار تھا جس نے بقول غالب:

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

حالانکہ یہ لمحاتی تخیل جیسا آنکھوں کا ملنا دم زدن میں ہوا میں تحلیل ہوا تھا لیکن اس کی شدت رونمائی نے ایک غزل کی صورت اختیار کی جو مرقع چغتائی کی مانند آج بھی میرے انگ انگ پر طرح طرح کے رنگ بکھیرتی ہے۔ چونکہ یہ غزل کشمیری میں موزون ہوئی ہے لہازا اسے یہاں درج کرنا خارج از موضوع ہوگا۔ البتہ اسے دوہرانے سے میری چٹکتی ہوئی ہڈیوں میں آتشیں جوانی کا خون شعلہ فشاں ہو جاتا ہے اور میرے اندر گویا ایک نورِ مجسم پگھل پگھل کر ہلچل مچا رہا ہے۔

میں نے اپنے کشمیری ہفت روزہ اخبار ''وطن'' کا نوروز نمبر شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے فوراً اس کے لیے دل کھول کر اعانت کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ بارہ مولہ اور سوپور کے سارے علاقے میں قدرومنزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے رئیس بارہمولہ خواجہ صمد پنڈت سے رابطہ کر کے اس خصوصی اشاعت کے لیے ایک صفحے کا اشتہار مانگا جو فوراً بھیجا گیا اور ''وطن'' کے اس خاص نمبر میں یہ اشتہار پورے ایک صفحے پر شائع کیا گیا۔ اس دوران تنہا صاحب نے مجھ سے یہ درخواست کی تھی کہ پنڈت صاحب کی خوشنودی کی خاطر ایک کشمیری شعر بھی اشتہار کے ساتھ شامل کیا جائے۔ یہ

عامیانہ شعر میں نے اس طرح موزون کیا:

غریبن ہُند چھ خادم، امیری تس مبارک
کران لوکن چھُ خدمت صمد پنڈتس مبارک

اس اشتہار کے لیے چالیس روپے کا معاوضہ دیا گیا۔تنہا صاحب کے معنی آفرین مراسلے وقتاً فوقتاً ''وطن'' کی زینت بنتے رہے۔

جولائی 1968ء میں جب ''وطن'' کی اشاعت غیر متوقع طور پر منقطع ہوئی تو میں نے اردو میں ہفت روزہ ''اقبال'' جاری کیا۔اس مرحلے پر بھی وہ اس کوشش کو بھی سراہنے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اقبال نام کے اخبار کی شروعات کے تناظر میں انھوں نے اپنے خط کا آغاز یوں کیا:

گل اقبال تو دائم شگفتہ
نصیب دشمنانت خار بادا

دو ہفتے ہو گئے کہ غیر متوقع طور پر آپ کا نیا شاہکار ''اقبال'' نظر نواز ہوا۔ یہ آپ کے شاداب دماغ کا ایک حسین خیال ہے جو آپ کی نئی تمناؤں کا کاغذی پیرہن بھی ہے اور پیکر تصویر بھی۔اس مسرت طرح سے میں نے بھی اپنا حصہ پایا۔لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اقبال پر نگاہ پڑتے ہی مجھے وطن یاد آیا اور دل سے ہوک اٹھنے لگی۔مسرت کی جو کیفیت پیدا ہو چکی تھی اس کی جگہ رنج و قلق نے لے لی۔ بہت دیر تک وطن بند ہونے کا حسرت ناک انجام مجھے تڑپاتا

رہا اور پھر میں سوچنے لگا کہ آپ کے دوستوں اور نامور کشمیری ادیبوں نے وطن کو ہر قیمت پر زندہ رکھنے کے لیے آپ کو اپنی ہر ممکن معاونت کا یقین دلایا تھا تو پھر وہ اس الم ناک انجام سے دوچار کیوں ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر اتنا زور دار وعدہ دینے والے یہ حضرات اپنا وعدہ وفا کرتے، وطن جوان مرگ نہ ہو جاتا اور نہ ہی اقبال کے پہلے ہی شمارے میں آپ کا قلم یہ رقت آمیز اداریہ اگل دیتا۔ اداریہ آپ نے اس شعر سے شروع کیا ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

لیکن اس سے وہ مضمون و مفہوم نہیں ٹپکتا جو جلے دل کے ساتھ آپ نے اپنے اداریہ کے حروف و الفاظ میں سمو دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس فارسی شعر کے بجائے اردو کا یہ شعر زیادہ موزون تھا:

پلٹا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یہ شعر آپ کی قابل رحم پوزیشن کا بھی آئینہ دار ہے اور آپ کے دوستوں کی وطن تراشی کا بھی۔

اس سے قبل اپریل 1967ء کو ایک طویل خط میں تنہا صاحب نے سانحہ کربلا کے پس منظر میں ایک پر اثر ارنثری مرثیہ میں اپنے فکری اور ذہنی اضطراب کا یوں اظہار کیا ہے۔ اس خط کی صرف، متعلقہ سطور پیش کی جاتی ہیں:

"آج نویں محرم ہے۔ آج جناب سید الشہدا پر یزیدیوں کی ستم کوشیوں نے پانی بند کر رکھا ہے۔ ساقئ کوثر کی اولاد پر عمر ابن سعد نے بہتے فرات کا پانی روک دیا ہے اور ارض کربلا احسان فراموشیوں کا ایک ہوشربا اور روح فرسا منظر دیکھ رہی ہے:

سبزہ ہرا تھا، خشک تھی کھیتی رسول کی
رو کے ہوئے تھی نہر کو امت رسول کی

محرم کی پہلی تاریخ سے میرا ذہنی منظر یک سر بدل جاتا ہے امام انسانیت مصباح راہ ہدیٰ جناب سید الشہدا حضرت حسینؑ کے ماتم اور غم کے اثرات میرے قلب و دماغ اور فضائے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ جوں جوں عاشورہ قریب آجاتا ہے یہ اثرات شدت کے ساتھ مجھے متاثر کیے رکھتے ہیں اور میرے غم حسین کا سرمایہ تیزی کے ساتھ بڑھنے لگتا ہے۔ اس دوران میں میرے لیے کسی کو خط لکھنا تو درکنار، خط کا جواب دینا مشکل ہی نہیں ناممکن معلوم ہوا کرتا ہے۔ لیکن آج جبکہ آہوں اور آنسوؤں کے درمیان ذکر حسین سے اپنے قلب و ذہن کو منور کر رہا تھا، آپ کا خط مل گیا اور پہلی فرصت میں جو کام شروع کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ یقین رکھئے کہ میں وہی ہوں جو وطن کو متاع عزیز سمجھ کر اس کی مدد کرتا ہے''۔

چند احباب کا خیال ہے کہ تنہا صاحب کے کشمیری کلام کا نمونہ بھی دستیاب نہیں لیکن یہاں یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تنہا صاحب کی کئی کشمیری اور اردو شعری تخلیقات وطن میں وقفے وقفے سے شایع ہوتی رہیں۔ وطن کی اشاعت پر جو ایک اور طویل خط تنہا صاحب نے ارسال کیا اور جو اس کے 28 اپریل کے شمارے میں شائع ہوا اس کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

''وطن کا اولین شمارہ سامنے ہے۔ مضامین اور عنوانات نہایت دل آویز اور خوب ہیں۔ رو بہ رو ہوتے تو قند و نبات سے آپ کا منہ بھر لیتا۔ اداریہ مختصر مگر بر محل ہے۔ دیگر عنوانات میں وچھان چھس پکان چھس، جامِ جم، شش رنگ، زان پہچان، اسن تہ گندن، پوز چھا اپز، اس لیے پسند آئے کہ ان میں ایک انفرادیت اور جدت موجود ہے۔ وطن کا مجموعی رنگ آپ کی بلند خیالی اور جدت

پسندی کے ساتھ ساتھ آپ کا ایک صاحب طرز ادیب اور حسن صحافت کا اداشناس ہونا ثابت کرتا ہے جس کی تردید ناممکن ہے''۔

تنہاؔ انصاری نے اگرچہ کشمیری شاعری کے حوالے سے بہت کم لکھا تو اردو میں بھی وہ بسیار گوئی سے دور ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کی اردو شاعری کا ان کا صرف ایک مجموعہ ''شبنمستان'' شائع ہوا ہے۔ کشمیری میں بھی انھوں نے اپنے مختصر کلام کی شیرازہ بندی کر کے اسے ''فرات'' کے نام سے منظر عام پر لایا ہے۔

''شبنمستان'' کے ترتیب کار اور تنہا کے برادر اصغر مرحوم نشاط انصاری نے تنہا کی دیگر تخلیقات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا یوں تذکرہ کیا ہے۔

''نثر میں انھوں نے اس قدر علمی وادبی مقالے، تعلیمی وفکاہیہ مضامین اور طنز و مزاح پر مبنی آرٹیکل لکھے ہیں کہ اگر انھیں اکٹھا کر کے شائع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ 1947ء سے قبل ادب لطیف اور ادب کثیف کے زیر عنوان ان کے بہت سارے دلچسپ اور اصلاحی مضامین مرد معمر، ہزار داستان، علامہ برزخی اور علامہ مجہول کے فرضی ناموں کے تحت یہاں کے مقامی اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔ 1952ء کے بعد ان کا جو کچھ کلام اور مقالے ابو ریحان کشمیری، ابو ریحان البیرونی، ابوالاحرار کشمیری اور ابوداؤد کے فرضی ناموں کے تحت یہاں کے مقامی رسائل میں شائع ہوتے رہے ان کا تعلق یہاں کی ادلتی بدلتی سیاست کے ساتھ ہے''۔

تنہاؔ انصاری جب بھی لکھتے سوچ سمجھ کر لکھتے اور ہر اُس موضوع کے ساتھ کما حقہ انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کرتے جس پر انھوں نے قلم اٹھایا ہو۔ ان کی غزلیات میں عمومی طور پر شورِ عشق و مستی کی جگہ دنیا کے سماجی اور دیگر غیر ادبی کوائف کا بیان نمایاں ہے۔ غلام محمد طاؤس کا بھی خیال ہے کہ۔ ''تنہا کا سارا کلام، ان کے مکاتیب اور مضامین ایک اداس اداس سی کیف زندگی کے

مختلف النواع احساسات کی عکاسی کرتے ہیں''۔اس ضمن میں ذیل کی چند مثالوں سے اس خیال کی تصدیق مراد ہے:

غم زدوں کے پاس آنے جانے والا کون ہے
کون بہلائے ہمیں بہلانے والا کون ہے
کیا کروں سیرِ چمن درپے ہے جب اس کے خزاں
چار دن کے حسن پر اترانے والا کون ہے
خوب تنہا تو نے جانچے یار بھی، اغیار بھی
سختیوں میں جز خدا کام آنے والا کون ہے
عالم ہستی میں برگشتہ میری تقدیر ہے
ہو چکا بے کار ثابت ناخن تدبیر ہے
کیا ملیں بیمار کی نبضیں تجھے ناداں طبیبؔ
یاس کے عالم میں وہ اب پیکر تصویر ہے
پیامی فصل گل کا آرہا ہے
نوید زندگانی لارہا ہے
زمیں پر جھومتے ہیں ماہ پارے
ستارے آسماں برسا رہا ہے

تنہا کی غزلیات اُس تغزل، رومانی آہنگ اور ترنم ریزی کے خوبصورت امتزاج سے محروم ہی رہی ہیں جو ایک کامیاب غزل کے لئے اہم جز کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ غالباً تنہا نے اپنی زندگی میں غم جاناں سے زیادہ غم دوراں ہی کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی ہے اور اسی کا مسلسل اظہار ان کی غزلوں پر غالب ہے۔ میر، غالب اور داغ کے لہجے اور طرز بیان اور موضوع سخن سے ہم رنگ غزلیات تنہا کے یہاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کی غزل

مولانا حالی، حسرت موہانی، فانی بدایونی اور شبلی نعمانی کے خزینۂ غزل کے ساتھ کسی حد تک مماثلت رکھتی ہے۔

نظم کے حوالے سے تنہا اپنے آس پاس رونما ہونے والے واقعات سے اکثر متاثر ہوتے تھے اور ان کے ردعمل میں اپنے شعری فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ عام طور سے ایسی تخلیقات وقت گزرنے کے ساتھ اپنی افادیت اور تاثر کھودیتی ہیں۔ تنہا صاحب کی اس قبیل کی نظموں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی منظومات تاشقند، خطاب بہ محکمۂ دیہات سدھار اور ترہگام کو اگر موجودہ صورت حال کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا جائے تو یہ احساس خود بخود جاگتا ہے کہ یہ گئے گزرے زمانے کے وقتی محسوسات کا وقتی نتیجہ ہیں اور اس وقت انھیں حالات کے موافق اور برمحل نہیں کہا جاسکتا۔

عبدالقادر سروری کا کہنا ہے کہ ''نئے شعور کے طلوع ہونے کے بعد بہت سی غزلیں تنہا نے ایسی لکھی ہیں جن میں فکر کا پورا تسلسل نہیں صرف آہنگ کا تسلسل ملتا ہے۔'' سروری صاحب کی اس رائے سے اتفاق اور اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ جس پر یہاں بحث نہیں کی جائے گی۔

ہر حال تنہا صاحب مدتوں تک ہمارے دلوں میں جاگزین رہیں گے اور ان کے یہاں سے کوچ کرنے کے بعد انھی کا شعر بار بار دوہرایا جائے گا:

بزم رنداں میرے اٹھ جانے سے سونی ہوگئی
پوچھتے پھرتے ہیں سب، تنہا ہمارا کیا ہوا



منٹو کی مناجات بحضورِ خالق کائنات

اے میرے پیارے خدا! جو رحمٰن بھی ہے اور رحم کرنے والا بھی۔ ہم جو خود گھنٹوں تک گناہوں میں ڈوب چکے ہیں، تمہارے سامنے سر بسجود ہو کر تم سے التجا کرتے ہیں کہ تو ایک پارسا شخص غلام حسن منٹو کے بیٹے سعادت حسن منٹو کو اس دنیا سے اُٹھا لے۔

اُسے یہاں سے اُٹھا لے خدایا! کیونکہ وہ خوشبو سے بھاگتا ہے اور غلاظت کو گلے لگاتا ہے۔ اسے خورشید تاباں سے نفرت ہے اور وہ تاریک بھول بھلیاں پسند کرتا ہے۔ وہ پاکیزگی کی تضحیک کرتا ہے، لیکن ننگے پن اور بے شرمی سے اُس کا دل شاد ہو جاتا ہے۔ اُسے لذت سے کوئی واسطہ نہیں، مگر وہ تند و ترش کھانے کی خاطر اپنی جان بھی دے گا۔ وہ گھریلو خواتین پر نظر بھی نہیں ڈالتا، لیکن طوائفوں کی صحبت میں اُسے ایسا لگتا ہے گویا وہ ساتویں جنت میں ہو۔

وہ آبِ رواں کے پاس نہیں جائے گا، البتہ وہ گندگی میں رہ کر سرشار ہوگا۔ جب دوسرے روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے اور جب دوسرے ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے۔ قباحت سے آلودہ سیاہ چہروں کو وہ احتیاط سے دھونا چاہتا ہے تاکہ اُن کی اصلی شکلیں سامنے آسکیں۔

اُسے کبھی تمہارا خیال نہیں آتا، کیونکہ وہ ہر مرحلے پر اُسی شیطان کا پیروکار ہے جو ایک عتاب زدہ فرشتہ تھا اور جس نے ایک بار تمہاری نافرمانی کی تھی۔

عام طور سے جب کسی اخبار یا جریدے میں کسی شخص کے انتقال کی خبر شائع ہو، تو اسے سیاہ حاشیے میں چھپایا جاتا ہے۔ تقسیم ہند کے دوران جو دہشت گردی، قتل و غارت اور تشدد چھ لاکھ انسانوں کا خون بہا کر بھی آج تک ختم نہیں ہوئی، اُسی کے ردّ عمل میں منٹو نے سیاہ حاشیے لکھے اور اسی منٹو کے بارے میں سماء ٹی وی لاہور سے ایک داڑھی والے بزرگ نے نہایت اطمینان سے کہا کہ وہ منٹو کو صرف اسی لئے جانتا ہے کہ وہ ایک فحش نگار تھا۔

منٹو کہتا ہے، اگر آپ کو میرے افسانے گندے لگتے ہیں تو جس معاشرے میں آپ رہتے ہیں وہی تو گندہ ہے۔ میں اپنی کہانیوں میں صرف سچائی سامنے لاتا ہوں۔ منٹو پر لاتعداد کتابیں، مضامین اور ہزاروں تبصرے موجود ہیں، مگر اس ایک مختصر ترین جملے میں ان سبھی میں سے منفرد اور برمحل اظہار خیال موجود ہے جو کرشن چندر نے اُس کے بارے میں یہ کہہ کر لکھا، ''خدا تمہارے قلم میں اور زہر بھر دے''۔

منٹو نے اپنے قلم کو اسی زہر میں ڈبو کر اس کے نوکیلے نشتر سے معاشرے کے اُن رستے ہوئے ناسوروں کی جراحی کی جنھوں نے انسانی معاشرے کو نہ صرف ناپاک بلکہ نیم مردہ بنا کے چھوڑا تھا۔ ان نشتروں کی کاری ضرب منٹو نے خاص کر نیم خواندہ ملاؤں، مذہب سے ناواقف مذہب کے ٹھیکہ داروں اور ہر طرح کی برائیوں میں ملوث سیاست دانوں کے اجسام پر لگائی جو اُس کی نظروں میں جس قدر عریاں کیے جائیں اُسی قدر سماج میں اخلاقی قدریں، صداقت اور انسان پروری کے پامال رشتے اپنا تار تار لباس دوبارہ جوڑ کر اپنے وجود کو سالم و ثابت صورت میں ڈھال سکتے ہیں۔

منٹو اگر چہ عملی طور پر سیاست دان نہیں تھا لیکن سیاسی کوائف اور حالات پر اُس کی نظر نہایت گہری تھی۔ خاص طور سے وہ کشمیر کے سیاسی حالات سے بخوبی

آگاہ رہنے کی مسلسل کوشش میں رہتا تھا، کیونکہ وہ خود کشمیری الاصل تھا اور کشمیر منٹو کے زمانے میں ہندوپاک کے درمیان ایک ایسے تنازعہ کا مرکز بنا ہوا تھا جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ کشمیر کے حوالے سے اُس کا اپنا ایک مخصوص نظریہ تھا جس کے ساتھ اتفاق یا اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اُس کے ظاہر کردہ محسوسات کو تحریر و تقریر میں پوری طرح تلف کرنا ادبی بددیانتی کے مترادف ہوگا۔

جواہر لال نہرو کے نام 27 اگست 1954ء کو لکھے گئے خط میں وہ کشمیر کے نئے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے برسرِ اقتدار آنے کا مخالف ہے۔ یہ اُس کی اپنی رائے ہے جسے اس مراسلے کے متن میں بعینہ شامل کیا جانا چاہیے۔ یہ اقتباس یوں ہے، ''یہ بخشی وغیرہ جو ہیں اُن کو فوراً ہٹا دیجئے، یہ اوّل درجے کے فریبی ہیں۔ آپ نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کو اقتدار دیا ہے، کیونکہ یہ آپ کو راس آتا ہے، لیکن کیوں؟ ہم جانتے ہیں کہ آپ سیاست دان ہیں جو کہ میں نہیں ہوں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں کچھ نہیں جانتا''۔

اسی خط میں منٹو برصغیر کے حالات پر یہ رائے زنی کرتا ہے، ''ملک تقسیم کیا گیا۔ ریڈ کلف نے پٹیل کو یہ گندہ کام کرنے کو کہا۔ آپ نے جونا گڑھ پر غیر قانونی طور پر قبضہ کیا ہے، ایک کشمیری صرف ایک مراٹھا یعنی پٹیل کے زیر اثر ہی کر سکتا ہے، خدا اس کے گناہ معاف کرے''۔ مزید برآں، ''ایک شکایت یہ ہے کہ آپ ہمارے پانی کو ہمارے دریاؤں میں بہنے سے روکتے تو ہیں، لیکن آپ اُن ناشروں کو نہیں روکتے جو میری کتابیں میری اجازت کے بغیر آپ کی راجدھانی اور لکھنو اور جالندھر میں دھڑا دھڑ شائع کر رہے ہیں''۔

اخیر پر اردو زبان کے بارے میں منٹو یہ اظہار خیال کرتا ہے، ''آپ ایک معتبر انگریزی داں ہیں۔ یہاں میں اردو افسانے لکھتا ہوں جس زبان کو آپ

کے ملک میں مٹایا جا رہا ہے۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم کشمیریوں نے کبھی کسی بھی شعبے میں شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ میں سیاست کی دنیا میں آپ کا نام فخر سے لے سکتا ہوں، کیونکہ آپ اپنے کہے ہوئے کی تردید کرنے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں''۔

کشمیر کے حوالے سے منٹو کے افسانے صرف چند ایک تک محدود ہیں۔ ''آخری سیلیوٹ'' کی کہانی 1947ء کے بعد کی اُس مخاصمت کو بے نقاب کرتی ہے جس کا مظاہرہ ہندوستانی اور پاکستانی افواج کو ایک دوسرے کے خلاف کرنا پڑا۔ پاکستانی صوبیدار رب نواز اور ہندوستانی فوجی رام سنگھ غیر منقسم پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ساتھ ساتھ جئے، پلے، بڑھے اور بچپن اور جوانی کا اکثر حصہ اکٹھے گزارا۔ لیکن تقسیم ہند نے اُنھیں بھی ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا اور وہ کشمیر کے ایک سرحدی علاقے ٹیٹوال میں بندوقیں تانے اپنے دشمن کو نشانہ بنانے پر مجبور ہوئے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ لڑے تھے۔ ایک دوسرے کے بہترین دوست ہونے کے باوجود کل کے یہ یاران وطن آج برصغیر کے نقشے پر ایک لکیر کھینچے جانے کی وجہ سے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اُن کی کل کی ہنستی مسکراتی کہانی اسی ویران سرحد کے آر پار ایک کربناک المیہ پر اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

''ٹیٹوال کا کتا'' نام کا منٹو کا افسانہ بھی اُس کے وطن مالوف کی اُس وقت کی کہانی کا دردناک پہلو بیان کرتا ہے جس کا پہلا باب کشمیر میں 1947ء کی برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی نفرت اور خون ریزی کی روشنائی سے لکھا گیا۔ کشمیر پر قبائلی حملے کی جنگ بندی کا اعلان ہوا تو وادیٔ کشمیر کے شمال مغرب میں سرحدی گاؤں ٹیٹوال بھی اس غیر فطری حد بندی کی زد میں آ گیا جہاں ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں کسی بھی ناخوشگوار صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار بیٹھی

تھیں۔ اسی دوران ایک کتا خوراک کی تلاش میں اس علاقے میں گھستا ہے جس کی موجودگی کے دوران فوجیوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اس حیوان کو دشمن ملک کا جاسوس سمجھ کر اُسے گولیاں مار مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ اسے یہ کہنے کی بھی مہلت نہیں دی گئی تا کہ وہ کہتا کہ ''میں نہ ہندوستانی ہوں نہ ہی پاکستانی، میں تو تم جیسے بے رحم انسانوں سے بدرجہا بہتر ایک بے زبان جانور ہوں''۔

کشمیر پر بہت کم لکھنے کے باوجود منٹو کے فکر و ذہن پر اپنے وطن مالوف سے وابستہ محسوسات اور خیالات ایک یا دوسری شکل میں ظاہر ہوتے رہے۔ اگر چہ یہ تخلیقات معدودے چند ہی ہیں لیکن ان میں بھی اُس کا درد وطن پنہاں ہے۔

1934ء میں جب منٹو کو اس جرم کی پاداش میں صرف نو مہینے کے بعد ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایک بہانہ تراش کر خارج کیا گیا کہ وہ درس و تدریس سے زیادہ افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہے تو اس کے چند حریفوں نے یہ مفروضہ گڑھ لیا کہ منٹو تپ دق کا مریض ہے اور اُسے علاج کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اُس کی اپنی ہی خواہش کے مطابق اسے بٹوٹ (کشمیر) کے پہاڑی قصبے میں واقع ایک سینی ٹوریم میں داخل کیا گیا۔ منٹو نے یہاں بھی اپنا تخلیقی عمل جاری رکھا اور تفنن طبع کی خاطر ایک سال تک ایک مقامی لڑکی سے عشق بھی لڑایا۔

ایک اور جگہ منٹو نے کشمیر کے حال زار کو ایک مختصر سی تخلیق میں اس طرح بیان کیا ہے:

''تقسیم ہند کے دوران فسادات میں ایک کشمیری مزدور ایک فساد زدہ سڑک کے بیچوں بیچ پھنس جاتا ہے جہاں لوگ دکانوں کو لوٹنے اور اُن سے اشیا چرانے میں لگے ہیں۔ یہ مزدور بھی چاول کی ایک بوری اُٹھا کر بھاگ جانے کی

کوشش میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور اس کی ٹانگ میں گولی ماردی جاتی ہے۔ زخمی ہوکر مزدور زمین پر گر جاتا ہے مگر پولیس اُسے حکم دیتی ہے کہ وہ یہ بوری اُٹھا کر تھانے تک پہنچائے۔ آخر میں وہ اُن سے عاجزی سے کہتا ہے، ''جناب! یہ بوری آپ ہی رکھیئے، مجھے صرف یہ بوری اُٹھانے کی مزدوری کے چار آنے دیجیے''۔

سیاہ حاشیے کی اس مختصر تخلیق میں منٹو نے دراصل اُس وقت کے کشمیر کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ منٹو کے ساتھ فیض احمد فیض بھی اسی قبیل کا ایک اور عظیم قلم کار ہے جو کشمیر کے ساتھ کئی طرح کی وابستگی کے باوجود اپنے جاندار اور شاندار فن کا نذرانہ کشمیر اور اہل کشمیر کو پیش کرنے سے قاصر ہی رہا۔ غالباً سالہا سال کا احاطہ کیے ہوئے کشمیر کے خون آشام واقعات فیض اور منٹو کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے عمل میں ان دونوں کے ذاتی نقطہ نظر کے سامنے بھرپور توجہ کے درخور ثابت نہیں ہو سکے، حالانکہ ان دونوں کے تخلیقی دور میں کشمیر میں ایسے تاریخ ساز واقعات پیش آئے جنھوں نے یہاں کی سیاسی اور سماجی دنیا میں ایک انقلاب لایا۔

منٹو برصغیر کے سبھی ادیبوں میں غالباً سب سے زیادہ خودآگاہ، خودشناس اور خود پرست تھا۔ اُس نے کبھی اپنی غیر ادبی تحریروں میں بھی کسی مصلحت کو پیش نظر نہیں رکھا اور ہر بات کو اُس کے صحیح تناظر میں پیش کیا۔ ایک بار کسی نے اُس سے سوال کیا کہ آپ عورت کے سینے کا اس طرح عیاں طور پر کیوں ذکر کرتے ہیں؟ تو اُس نے جواباً کہا میں عورت کے سینے کو سینہ نہیں لکھوں گا تو کیا اُسے مونگ پھلی لکھوں گا۔

پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں خواتین کے جسمی اعضاء کو جس والہانہ پن کے ساتھ افسانوی ادب میں بار بار اُچھالا گیا ہے اُس پر یہاں تو کبھی

اعتراض نہیں ہوا۔ جب کہ واجدہ تبسم نے ایک عورت کی چھاتیوں کی تصویر کشی اس طرح سے کی کہ وہ ایسی گنبد والی اور سخت تھیں کہ کنکر مارو تو ٹھن سے بج اُٹھیں۔

منٹو نے اپنے کئی ہم عصروں کو بھی معمولی اختلافات کی بنا پر نہیں بخشا۔ اوپندر ناتھ اشک کی کنجوسی کے بارے میں لکھا کہ وہ بلی کے پیٹ سے بھی شراب نکال لیتے، چراغ حسن حسرت برہنہ گفتاری میں طاق تھے اور یہ کہ احمد ندیم قاسمی گویا وضو کے قطروں سے بنے ہوئے تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندو مسلم فسادات پر منٹو کی کتاب سیاہ حاشیے پر یہ تبصرہ کیا تھا کہ، ''یہ کتاب پڑھنے کے بعد جو میں نے محسوس کیا وہ یوں ہے، گویا لاشوں سے بھرا ہوا ایک میدان ہے جہاں مصنف مقتولوں کی جیبوں سے سگریٹ کے ٹکڑے اور پیسے چرا رہا ہے''۔

جواہر لال نہرو کے نام اپنے تاریخی خط میں اگر چہ اس نے بھارت کی کشمیر پالیسی کو کسی حد تک رد کیا ہے، وہاں اُسے اپنے ملک پاکستان کی سیاسیات یا معاشرے میں بھی جہاں کہیں خامیاں نظر آئیں وہاں وہ علی الاعلان اُن کی نشاندہی کرنے میں بھی ایک بے باک اور نڈر قلم کار ثابت ہوا۔

چچا سام کے نام ساتویں مراسلے میں منٹو لکھتا ہے، ''پاکستان۔ میرا پاکستان اپنے فنکاروں کی قدر دانی میں غافل نہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ مجھ سے جو زیادہ حقدار ہیں اُن کی فہرست بہت لمبی ہے۔ پچھلے دنوں میری حکومت نے خان بہادر محمد عبدالرحمٰن چغتائی کے لیے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کیا۔ خان بہادر صاحب اللہ کے فضل سے صاحب جائیداد ہیں، اس لیے وہ مجھ سے کہیں زیادہ مستحق تھے۔ اس کے بعد خان بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب کے لیے بھی تاحیات اتنا ہی وظیفہ منظور کیا گیا۔ اس لیے وہ بھی صاحب

ثروت ہیں۔ میری باری خدا جانے کب آئے گی، اس لیے کہ میں الاٹ شدہ مکان میں رہتا ہوں جس کا کرایہ بھی میں ادا نہیں کرسکتا۔ بہت سے مستحق اصحاب پڑے ہیں۔ مثال کے طور پر میاں بشیر احمد بی۔ اے (سابق سفیر ترکی)، سید امتیاز علی تاج، فضل احمد کریم فضلی وغیرہ۔ اُن کا نمبر پہلے آتا ہے، اس لیے کہ ان کو کسی وظیفے کی احتیاج نہیں۔ لیکن میری حکومت کا دل صاف ہے، وہ خدمات دیکھتی ہے دولت نہیں دیکھتی۔

اس موقعے پر منٹو کا تحریر کردہ ایک دلچسپ لطیفہ ذائقہ بدلنے کے لیے دوہرایا جاتا ہے، جس میں بھی حسبِ ضرورت ہلکی پھلکی طنز موجود ہے۔ وہ کہتا ہے، ''میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔ مسٹر ریڈ کلف کی مہربانی سے یہ اب بھارت میں چلا گیا ہے۔ اس میں ایک حکیم تھے، محمد ابوتراب۔ آپ نے اپنی زندگی میں دس شادیاں کیں۔ چار چار کر کے نہیں، ایک ایک کر کے۔ ان بیویوں سے اُن کی بے شمار اولادیں ہوئیں۔ جب انہوں نے 90 سال کی عمر میں آخری شادی کرلی، تو اُن کے بڑے لڑکے کی عمر 75 برس کی اور سب سے چھوٹے کی جو اُس کی آخری بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا صرف 2 برس کی تھی۔ 112 برس کی عمر میں آپ کا انتقال یہاں لاہور میں ایک مہاجر کی حیثیت سے ہوا۔ کسی شاعر نے اُن کی تاریخ وفات اس مشہور مصرعے سے نکالی تھی:

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

آغا شورش کشمیری کے بقول: ''منٹو اپنے سوا کسی کو شاذ ہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتے تھے۔ اُن کا دعویٰ کسی حد تک درست تھا۔ اور اسی پس منظر میں منٹو نے اپنی وفات سے پہلے اپنے کتبے کے لیے بھی منفرد تحریر قلم بند کی:

''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اُس کے سینے میں فن افسانہ نگاری

کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟"

ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات پر جس تیکھے اور طنزیہ انداز میں منٹو نے انسان کُش واقعات کو اپنے خاص اسلوب اور اندازِ بیان میں بیان کیا اُس کی نظیر سارے اُردو ادب میں ملنا مشکل ہے۔ اُس نے اپنی کسی تخلیق میں ایک یا دوسرے مذہب یا عقیدے کی پاسداری نہیں کی۔ ایک یہودن موزیل، ایک نوجوان سکھ ترلوچن کو بچاتے بچاتے خود جان دیتی ہے۔ جب وہ جان بلب ہوتی ہے تو ترلوچن اُس کے برہنہ جسم کو اپنی پگڑی سے ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ چیخ کر اُسے ڈھانٹتی ہے، "دفع کرو اپنے اس دھرم کو!" ٹھنڈے گوشت میں زخمی ایشر سنگھ کا وہ غلیظ خون موجود ہے جو مذہب، ذات پات اور نسل کا تصور اُلٹ پُلٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔

اپنے ایک خاکے میں منٹو خود کہتا ہے کہ اُس نے کبھی مارکس یا فرائڈ کو نہیں پڑھا۔ وہ ہیگل کو صرف نام سے جانتا ہے اور ان مفکروں نے کبھی اُسے متاثر نہیں کیا۔

منٹو صرف اپنے ہندوستان اور پاکستان کو جانتا اور پہچانتا تھا۔ وہ ریڑھی پر برف بیچنے والے اُس ہندو کو جانتا تھا جس کی سڑک پر پڑی لاش پر اُس کی ریڑھی سے برف پگھل پگھل کر اُس کے سرخ لہو پر ٹپک ٹپک کر گر رہی تھی۔ وہ اُس اخبار فروش سے واقف تھا جس نے قتل ہونے سے چند لمحے پہلے ایک اور اخبار بیچنے والے سے تاکیداً کہا تھا کہ دیکھو! میرے سبھی گاہکوں کو برابر اخبار پہنچاتے رہنا، اُنہیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

اسی موضوع پر دیگر واقعات کے حوالے سے منٹو کی چند تحریروں کے یہ اقتباسات دلچسپی کا مطالعہ ہو سکتے ہیں:

''اب آپ بھنڈی بازار کی سنیے۔ یہ بمبئی کا مشہور بازار ہے جو بمبئی کی زبان میں میاں بھائیوں یعنی مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ اس میں بے شمار ہوٹل اور ریسٹورانٹ ہیں۔ کسی کا نام بسم اللہ اور کسی کا نام سبحان اللہ، سارا قرآن اس بازار میں ختم ہو گیا ہے۔ لیکن نعوذ باللہ نام کا کوئی ہوٹل یہاں موجود نہیں''

اب نئے پاکستان کے بارے میں بھی ایک دو تحریریں درج کی جاتی ہیں:

''میں رہنا پاکستان میں ہی چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی خاک بہت عزیز ہے، جو میرے پھیپھڑوں میں مستقل جگہ بنا چکی ہے۔ چچا سام! یہ خط ملتے ہی امریکی ماچسوں کا ایک جہاز روانہ کر دیجیے۔ یہاں جو بنتی ہے اُسے جلانے کے لیے ایرانی ماچس خریدنی پڑتی ہے، لیکن آدھی ختم ہونے کے بعد یہ بیکار ہو جاتی ہے اور بقایا تیلیاں جلانے کے لیے روسی ماچس لینا پڑتی ہے جو پٹاخے زیادہ چھوڑتی ہے جلتی کم ہے۔ ہندو مسلم فساد کے دنوں میں ہم لوگ جب باہر جاتے تھے تو دو ٹوپیاں، ایک ہندو ٹوپی اور دوسری مسلمان ٹوپی ساتھ رکھتے تھے۔ اس فساد میں ہم لوگوں نے گاندھی ٹوپی خریدی۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوتی جھٹ سے پہن لیتے تھے۔ پہلے مذہب سینوں میں ہوتا تھا، آج کل ٹوپیوں میں ہوتا ہے''۔

''نصرت'' لاہور کے کشمیر نمبر میں منٹو نے کشمیر کے مسئلے پر 19 نومبر 1956ء کے ایک مختصر مضمون میں اپنی خیال آرائی یوں کی ہے:

''ایک عجیب بات اور ہے کہ آج کل پاکستان اور ہندوستان میں کشمیر کا جھگڑا چل رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی کشمیری ہے اور اُسے کشمیر سے محبت ہے، جیسی مجھے ہے، جیسی کسی اور کشمیری کو ہو سکتی ہے۔ کاش مہجور زندہ ہوتا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ نظام الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا

کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں۔ کشمیری خواہ مسلمان ہو یا ہندو۔ وہ ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لال نہرو ہو۔ یہ نظام الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ حالانکہ تم کشمیر کے باشندے نہیں ہو سکتے لیکن تمہاری روح کشمیری ہے۔ تم گوگجی اور بتہ (شلغم اور چاول) کو اپنے دستر خوان سے کبھی نکال نہیں سکتے۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو۔ آؤ اور اسی بتہ کی قسم کھاؤ، کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو؟''۔

فیض نے بھی اگرچہ خصوصی طور پر اپنی زندانی شاعری میں بالواسطہ سیاست پر ایک تیکھے انداز میں طنز کیا ہے، لیکن منٹو جو منہ پھٹ بھی ہے اس معاملے میں کھل کر بات کرتا ہے۔ اس کے باوجود منٹو کے یہاں شائستگی اور تہذیب کے عناصر برابر موجود ہیں۔ اس کے تیکھے لہجے کے نشتروں سے اس کا اپنا ملک پاکستان بھی نہیں بچ سکا ہے۔ ایک جگہ انکل سام کے نام خط لکھتے ہیں:

''پنڈت جواہر لال نہرو کشمیری ہیں۔ اُن کو تحفے میں ایک ایسی بندوق ضرور بھیجئے گا جو دھوپ میں رکھنے سے ٹھس کرے۔ کشمیری میں بھی ہوں مگر مسلمان، میں نے اپنے لیے آپ سے ننھا منا ایٹم بم مانگ لیا ہے۔ ایک بات اور یہاں دستور بننے میں ہی نہیں آتا، خدا کے لیے آپ وہاں سے کوئی ماہر جلد از جلد روانہ کریں۔ قوم بغیر ترانے کے تو چل سکتی ہے، لیکن دستور کے بغیر نہیں چل سکتی۔ لیکن آپ چاہیں تو بابا چل بھی سکتی ہے:

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہاں یہ دوہرانا مناسب ہوگا کہ پاکستان میں اگرچہ 1947ء میں ایک آئین بنایا گیا تھا لیکن 1956ء میں اُسے ملک کی پارلیمنٹ نے کالعدم قرار دے کر منسوخ کیا۔

آگے چل کر منٹو انکل سام کے نام اس مراسلے میں لکھتا ہے:

''سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔لیڈروں اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ دوا فروش اور لیڈر دوسروں کے نسخے استعمال کرتے ہیں۔خیر کہنا یہ ہے کہ سیاست سے مجھے اُتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سنیما سے۔گاندھی جی سنیما نہیں دیکھتے تھے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنی چاہیے اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں''۔

سعادت حسن منٹو کے بارے میں ایک دلچسپ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں منٹو کی زندگی کے آخری تین سالوں کے حوالے سے چند واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔

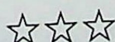
منٹو کی سفید پوشی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔وہ پاکستان کی بنی ہوئی نہایت گھٹیا اور مہلک شراب چوری چھپے اپنے ایک پارسی مے فروش دوست ایڈل جی سے لاہور میں مال روڈ پر اُس کی دکان سے لاتے تھے۔چونکہ وہاں شراب پر سخت پابندی تھی اور صرف پرمٹ پر ملتی تھی، لہذا منٹو جب بھی ایڈل جی کی دکان پر جاتے تو اُن کا یہ دوست بوتل کو ردی اخبار میں اچھی طرح لپیٹ کر اُنھیں دیتا۔ابوالحسن نغمی کے بقول:

''منٹو پاکستان میں یہی شراب پیتے تھے جس کا نام جم خانہ رکھا گیا تھا،مگر وہ اُسے یتیم خانہ کہتے تھے۔اس کے برعکس ہندوستان میں بمبئی کے قیام کے دوران وہ اچھے فلیٹ میں رہتے تھے، نہایت نفیس کھانا کھاتے تھے، قیمتی شراب کے ساتھ اعلیٰ قسم کے سگریٹ پیتے تھے اور نہایت نفیس کیس میں رکھ کر دوسروں کو بھی پیش کرتے تھے، لیکن پاکستان جانے کے بعد جب کبھی کسی نے اُن سے پوچھا کہ آپ کون سا سگریٹ پینا پسند کریں گے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ ''جس میں سے دھواں نکلے''۔

منٹو نے جب لاہور جانے کی ٹھان لی تو عصمت چغتائی نے اُن سے پوچھا کہ آپ پاکستان جا کر کیا کیجئے گا، وہاں آپ کی کیا حیثیت ہوگی؟ تو منٹو نے کہا تھا کہ ''وہاں تو ہم ہی ہم ہوں گے''۔

منٹو نے خودکشی کرنے کی جو کوشش کی تھی اُس کے بارے میں معلوم ہے کہ کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ منٹو کو کسی نے بتایا تھا کہ کڑوے تیل میں نیم کا گولہ ڈال کر پینے سے موت آجاتی ہے۔ منٹو نے اسے آزمایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خواجہ! میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ منٹو کی موت کے 57 سال بعد پاکستان کی حکومت نے جہاں اُسے بار بار عدالتوں میں گھسیٹا گیا، اُس سال یعنی 2012 میں 14 اگست کو یومِ پاکستان کے موقعے پر نشانِ امتیاز کے اعزاز سے نوازا اور پورے 30 سال کے بعد اسلام آباد کو ہلال امتیاز کے لیے جوش ملیح آبادی کی بھی یاد آگئی:

کی میرے مرنے کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا



چند یادگار ملاقاتیں

یہ 1957ء کی بات ہے کہ سری نگر میں سیاحوں کے استقبالیہ مرکز کے وسیع و عریض ہال میں منعقدہ کُل ہند مشاعرے کی محفل جمی تھی۔ ''تاریخ اردو ادب'' کے تحقیق کار مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مسندِ صدارت پر تشریف فرما تھے۔ مشاعرے میں ایک دلکش مترنم آواز میں یہ غزل ماحول کو مسحور کر رہی تھی:

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

یہ تھے حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی جو اقامت نماز کی طرح سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اپنے منفرد اور مخصوص ترنم میں غزل سرا تھے۔ ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ اُن دنوں کشمیر میں جشنِ کشمیر کی دھوم تھی اور ہر ہفتے ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب بخشی صاحب نے جگر صاحب کو کشمیر آنے کی دعوت دی اور انھیں ریل کے سفر کی پیش کش کی تو جگر صاحب نے جواب دیا کہ وہ صرف ہوائی جہاز سے ہی سفر کر سکتے ہیں۔ پھر بخشی صاحب نے اپنی دریا دلی کا ظاہرہ کرتے یہ پیش کش کی کہ ''اگر آپ سارا کشمیر مانگیں تو میں خوشی خوشی پیش کروں گا''۔

جگر صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں تو دیکھا کہ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتے تھے اور اگر بات ادب کی ہو تو کھل کر اظہار خیال کرتے تھے۔ اسی

طرح وہ کبھی عجیب سے اطوار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ایک بار ریڈیو سرینگر کے دفتر میں وہ اپنی ایک غزل نقل کرنے لگے تو وہاں کے ایک اہل کار پروفیسر جیالال کول نے احتراماً ان کے ہاتھ میں تختی تھمانے کی کوشش کی۔جگر نے فوراً اسے زور سے کھینچ لیا اور غزل رقم کرلی۔یہ غزل اُسی دن جگر صاحب کو ریڈیو کے لیے صدا بند کرنی تھی:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے

غالباً یہ خوبصورت غزل ابھی اس نشریاتی ادارے کے متعلقہ شعبے میں محفوظ ہوگی۔اُن دنوں کشمیر میں جشنِ کشمیر کا خوب چرچا تھا اور حکومت کی طرف سے مسلسل طور پر کل ہند مشاعرے ہوا کرتے تھے۔انھی دنوں میں مجھے جگر مراد آبادی، اسرار الحق مجاز، شاذ تمکنت، انور صابری، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین وغیرہ سے بھی ملاقی ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔

اسی استقبالیہ مرکز میں مجھے سکندر علی وجد کو پہلی بار سننے کا موقعہ ملا۔جب انھوں نے اپنی مشہور غزل مترنم آواز میں چھیڑی:

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

تو اس پُرسوز کلام سے محفل میں ایک سماں بندھ گیا۔اس کے بعد وجد صاحب نے چند دن سری نگر میں قیام کیا اور اسی دوران ان سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔نہایت وضع دار شخص تھے اور ہر بات تول تول کر کرتے تا کہ گفتگو میں صحیح اسلوب اور زبان کا استعمال ہو۔غالباً اس سنجیدگی اور غیر رسمی طرز کلام سے گریز کے پس پردہ یہ حقیقت بھی کارفرما تھی کہ وہ پدم شری ہونے کے ساتھ راجیہ سبھا کے رکن بھی رہے۔ان کے ایک مجموعہ کلام ''اوراقِ مصور'' کا اجرا خود جواہر

لال نہرو نے کیا اور وہ اخیر پر سیشن جج کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ بہر حال جب بھی وہ ملے تو یار دوستوں نے ہر وقت ان سے ان کی وہ شہرہ آفاق نظم سنانے کی فرمائش کی جو انھوں نے اجنتا کے غاروں پر لکھی تھی اور جس کا یہ مصرعہ آج بھی ذہن میں بار بار گونجتا رہتا ہے:

جہاں پیتے رہے اہلِ ہنر خونِ جگر برسوں

وجد صاحب 16 جنوری 1983 کو انتقال کر گئے اور غالباً انھوں نے یہ بات اپنے ہی لیے کہی تھی:

جانے والے کبھی نہیں آتے

فراق گورکھپوری کے لیے سرکار نے سری نگر کے استقبالیہ مرکز ہی میں ایک کمرہ مخصوص رکھا تھا جہاں ہم نوجوان پہروں تک ان کے پاس بیٹھ کر ان سے ادب اور خاص کر مغربی ادبیات کے بارے میں عالمانہ خیالات سے مستفید ہوتے تھے۔ مغربی ادب پر انھیں خاصا عبور حاصل تھا۔ وہ عام طور پر بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ کر اپنی بصیرت افروز باتوں سے ہمیں مستفید کرتے۔ کئی بار انھوں نے ہماری فرمائش پر اپنے دلچسپ اشعار سنائے۔

ان مشاعروں میں ایک شاعر انور صابری کو بلا ناغہ بلایا جاتا تھا کیونکہ وہ علی العموم حاکم وقت کی قصیدہ خوانی یا مدح سرائی تک ہی اپنی شاعری محدود رکھتے تھے جس سے ان کے کلام کو محض تک بندی ہی کہا جا سکتا ہے۔ جسامت کے لحاظ سے ڈھیل ڈول والے انور صابری کے بارے میں انھی دنوں کسی دل جلے نے یہ شعر ان کے لیے موزون کیا:

جگر سے، جوش سے، مخمور سے واقف ہے میخانہ
یہ انور صابری کس ـــــــ کا نام ہے ساقی!

انور صاحب سے جب بھی اتفاقیہ ملاقات ہو جاتی تو وہ صرف اور صرف

بخشی غلام محمد کی ستائش کرتے کہ سننے والے کو اس میں حد درجے کی چاپلوسی اور ذاتی مصلحتوں پر مبنی مدح سرائی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس پس منظر میں میں نے ان سے زیادہ ملنے جلنے کو کبھی ترجیح نہیں دی۔

بخشی صاحب کے بعد غلام محمد صادق وزیر اعلی بنے تو نیاز حیدر نام کا ایک نام نہاد ترقی پسند اردو شاعر یہاں آیا اور آتے ہی حاکم اعلی کو شیشے میں اتارا اور ان کی سرکاری خاطر داری کے خوب مزے لیے۔ نیاز حیدر بلا کا مےٴ نوش تھا اور یہ شغل رات دن ان کے ہوش وحواس پر حاوی رہتا۔ اس طرح نیاز صاحب کی رندانہ مستیوں کی وجہ سے صادق صاحب کے نام پر بھی حرف آنے لگا۔ بالآخر تنگ آکر صادق صاحب نے انھیں ایک دن بس میں بٹھا کر کاما گاٹا مارونگر میں کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی دعوت کے بہانے کشمیر سے میلوں دور نہ جانے کس جگہ چھوڑ دیا۔ نیاز صاحب کے ساتھ ہماری چند ملاقاتیں ہالی وڈ ریسٹورینٹ میں ہی ہوتی رہیں اور ہم نے محسوس کیا کہ ان کی شخصیت میں ہمیں کاسہ گدائی ہاتھ میں لئے ایک مفت خور سے زیادہ کچھ اور نظر نہیں آیا۔ نیاز حیدر کو کشمیر کو خیر باد کرنے پر اس لیے بھی مجبور کیا گیا کہ جب وہ میخانوں میں بلا کی شراب نوشی کرتے تو عموماً خود بل کی ادائیگی کرنے کے برعکس اس پر یہ لکھتے: "CM to pay" جب وزیر اعلی تک یہ پریشان کن بات پہنچی تو انھوں نے انور صاحب کو کشمیر بدر کروایا اور راحت کی سانس لی۔ اردو کی دنیائے سخن میں آج نیاز حیدر ایک ورق گم گشتہ ہے۔

یہ 1955ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ میں اس وقت ریڈیو کشمیر میں ملازم تھا کہ ایک دن اسرار الحق مجاز وہاں آئے اور پنی چند غزلیں ریکارڈ کروائیں۔ میں اس عمل کے دوران برابر موجود رہا۔ وہ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں قیام پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے وہاں بھی گیا۔ چونکہ میں عمر میں ان

سے چھوٹا تھا لہذا انھوں نے مجھے درخور اعتنا نہیں سمجھا البتہ وہ دیر تک اپنی زندگی اور شاعری سے متعلق کھل کر باتیں سناتے رہے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ میں صرف اپنی مادری زبان کشمیری میں ہی شاعری کرتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ تاکید کی کہ ایک شاعر کو صرف اپنی مادری زبان ہی میں سخن گوئی کرنی چاہئے جس میں وہ اپنے محسوسات اور جذبات کا بہترین انداز میں اظہار کرسکتا ہے۔

1946ء میں کشمیر میں تحریک آزادی مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کے خلاف شروع ہوئی جس نے دیکھتے دیکھتے ایک عوامی بغاوت کا رنگ اختیار کرلیا۔ اس سے متاثر ہوکر اور اہل کشمیر کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجاز نے بھی کشمیر پر ایک یادگار نظم لکھی جس میں انھوں نے کشمیر کے روشن اور تابناک مستقبل کی بشارت دی:

اک شرارہ جھلملایا اور فضا میں کھوگیا
اک شرارہ جانب خلد جواں آیا تو کیا
کوئی طوفاں آئے اک کوہ گراں ہے اس طرف
کوئی طوفاں بر سر کوہ گراں آیا تو کیا
دست و بازو میں صلابت آچکی فولاد کی
اب مقابل اک حریف نیم جاں آیا تو کیا
خود حقیقت پر پڑے باطل کا سایہ تابہ کے
مہر عالم تاب کے آگے دھواں آیا تو کیا
دیر کی عظمت بھی ہے آخر مسلم ہم نفس
دیر کی محراب تک شور اذاں آیا تو کیا
چند بنیادی عناصر مایل پیکار ہیں
اک نئے کشمیر کی تشکیل کے آثار ہیں

ایک شام کو سری نگر کے پولو گراونڈ کی اُس عمارت کے وسیع و عریض صحن میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں اُس وقت ریڈیو کا سٹوڈیو تھا۔ اس مشاعرے میں مجاز بھی شریک تھے۔ سامعین میں کئی وزراء کے ساتھ ایک ادب شناس وزیر داخلہ درگا پرشاد در بھی موجود تھا۔

جب مجاز کی باری آئی تو انھوں نے پہلے ایک خوبصورت غزل پڑھی اور اسکے بعد سامعین کی فرمائش پر اپنی شہرہ آفاق نظم ''آوارہ'' اپنے کمزور جسم کو لہلہاتے ہوئے سنائی۔ در صاحب کی فرمائش پر یہ نظم سنانے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ اس طرح سے مجاز نے اس مشاعرے کو لوٹ لیا۔ مجاز کے واپس لکھنؤ لوٹنے کے بعد ہی اس کی افسوس ناک موت کی خبر آئی جب اسے 5/دسمبر 1955 کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات کی صبح میخانے کے باہر مردنی کی حالت میں پایا گیا۔ اس طرح سے ہندوستان میں اردو ادب کی رومانی فضاؤں کا یہ شہزادہ اپنے عقابی پروں پر اڑتا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا:

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

برادرم شبیب رضوی نے مجاز کے انتقال سے متعلق یہ تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ ''اُس رات لکھنو کے لال باغ علاقے میں مجاز جلال ملیح آبادی اور ایک شخص کے ساتھ مدن بار میں محوِ مے نوشی تھا۔ رات کو قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں ترقی پسند کانفرنس کی طرف سے ایک مشاعرہ ہوا جس میں مجاز نے یہ غزل پڑھی:

میری بادہ پرستی پر نہ جاؤ
جوانی کو سہارا مل گیا ہے

مشاعرے کے بعد بھی مجاز اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ پیتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھا اور پھر علی الصباح وہ تقریباً مردے کی حالت میں

پایا گیا۔اسے گولا گنج کے ہسپتال میں داخل کیا گیا جہاں وہ دماغ کی نس پھٹنے سے چار بجے بعد دوپہر وفات پا گیا"۔

1947ء میں جب کشمیر پر پاکستان کی طرف سے حملہ ہوا تو یہاں کے سیاسی رہنماؤں، ادیبوں اور دانشوروں نے قومی کلچرل فرنٹ کا قیام عمل میں لایا۔اس محاذ کا مقصد ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کو ایک جگہ پر جمع کر کے ان میں وطن پرستی اور قوم نوازی کے جذبات کو ازسرِ نو اجاگر کرنا تھا۔فرنٹ کے زیر اہتمام 1948ء کے موسم بہار میں انقلابی ترانوں اور حب الوطنی پر مبنی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "گائے جا کشمیر" کے عنوان سے شائع ہوا اور اس میں اردو اور کشمیری زبانوں کی تخلیقات شامل کی گئیں۔

مخدوم محی الدین کے ایک جوشیلے گیت کی ہمہ گیر مقبولیت اور عوامی دل پذیری کے پیش نظر ریاست کے مشہور مفکر اور سیاست دان مولانا محمد سعید مسعودی نے مخدوم کی اجازت سے اور اس نغمہ کو کشمیر کے حالات کا عکاس بنانے کی غرض سے اس کے ایک دو بندوں میں چند الفاظ تبدیل کیے اور اس طرح یہ نظم، جو اس مجموعہ میں "آزادی کا ترانہ" کے نام سے چھاپی گئی، ریاستی عوام کے احساسات اور جذبات کی ترجمان بن گئی۔نظم کے اشعار میں تبدیلی کے بعد اس میں کشمیر کی جنگِ آزادی کا ذکر یوں کیا گیا:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
کشمیر کے رہنے والوں کی — محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی، مزدوروں کی
جموں کشمیر ہمارا ہے — پورب، پچھّم، اتر، دکھن
ہم لداخی، ہم کشمیری — ہم جموی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن — آہن پیکر، فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

مخدوم کئی بار کشمیر آئے لیکن اس آمد و رفت کا تعلق زیادہ تر ادبی مناظروں، مباحثوں اور مشاعروں میں ان کی شرکت تک ہی محدود رہا۔

وہ زمانہ کشمیر کی سیاست میں اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ مخدوم بہر حال یہاں کی عوامی خواہشات اور جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے خاموشی سے کام کرتے رہے اور اس دوران ان کی طویل ملاقاتیں سرکردہ مقامی سیاست دانوں سے برابر ہوتی رہیں۔

28ء جون 1969ء کو میری ایک بہت بڑی خواہش پوری ہوئی کہ میں مخدوم صاحب سے ملاقی ہوا۔ اُس دن ریاستی کلچرل اکادمی نے ملک بھر سے آئے ہوئے اردو شعراء کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا تھا۔ فراق گورکھپوری اور سجاد ظہیر کے ساتھ ساتھ مخدوم بھی اس بزم کی زینت بنے تھے۔ جنگ آزادی کے آتش بار سپاہی اور جذبہ عشقِ آزادی سے سرشار اس شریف عاشق کو میں بار بار دیکھتا اور اس کی طرف نگاہیں پیہم مرکوز کرکے اس کے ذاتی خدوخال کی تصویر کشی کی کوششوں میں مگن ہوا۔ فراق شاعری میں فلسفۂ جدیدیت پر خیال آرائی کررہے تھے۔ سجاد ظہیر سوویت یونین میں پیدا شدہ نئے اور محرک شاعرانہ رجحانات کے بارے میں محوِ گفتگو تھے اور مخدوم متانت اور سنجیدگی کا ایک پیکر بنے خاموشی سے یہ ساری باتیں سن رہے تھے۔

اُسی شام کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مخدوم رات گئے تک ایک محفل ناؤ ونوش میں اس طرح پھنسے رہے کہ انھیں کھانا بھی نہیں مل سکا۔ رات گئے جب انھیں بھوک ستانے لگی تو شاذ تمکنت اور وحید اختر کو لے کر ہم سری نگر کے ایک ہوٹل میں پیٹ کی آگ بجھانے گئے۔ مخدوم مجھ سے پہلی بار گلدستۂ تبسم کی طرح ملے اور میرے دل و دماغ میں ابدی مہک چھوڑ گئے۔ اُس رات کوئی دو گھنٹے تک مجھے

مخدوم سے پہلی اور آخری بار باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ بولنا کم چاہتے تھے شاید اس وجہ سے بھی کہ نیند کا خمار اب ان کی جہاں دیدہ اور تھکی ہوئی آنکھوں پر اپنے ڈورے ڈال رہا تھا۔ اپنی قیام گاہ کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور بولے، خیال صاحب! اگر یہاں پھر نہیں ملے تو حیدر آباد ضرور آیئے، وہاں جی بھر کے باتیں کریں گے۔ لیکن اُن سے جدا ہوتے وقت میرا دل زبان حال سے کہہ رہا تھا:

آج کی رات نہ جا
آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے

ابھی دو ہی مہینے گذرے تھے کہ 25 اگست کو دلی میں مخدوم کے انتقال کی خبر آئی۔ مخدوم سے میری ملاقات کے سارے نقوش میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور مجھے ان ہی کا یہ مصرعہ یاد آیا:

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا

مخدوم کو اگلے روز حیدر آباد دکن میں درگاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

یہ 1960ء کے آس پاس کی بات ہے جب سری نگر میں ریزیڈنسی روڈ پر کیپری کے نام سے ایک مے خانہ آباد تھا۔ مشہور فلمی اداکار اور ترقی پسند دانشور بلراج ساہنی جب بھی کشمیر آتے تو اسی میکدے میں اکثر وقت دیکھے جاتے یا اُن کی بیٹھک واسطی رام کی فرنیچر کی وہ دکان ہوتی جو لیمبرٹ گلی کی نکڑ پر واقع تھی اور جہاں واسطی رام اپنی پنجابی برادری کے احباب کے ساتھ دن بھر گپیں ہانکتے رہتے۔ بلراج ساہنی بھی اسی دکان پر دنیا بھر کی باتیں سنتے اور سناتے۔ میں وہاں

سے روز گذرتا اور اسی دوران ساہنی صاحب کے ساتھ میری گہری دوستی ہو گئی۔ پھر ہم تقریباً ہر روز ملتے اور ایک دن انھوں نے مجھ پر یہ بات آشکارا کی کہ وہ اپنے محبوب کشمیری شاعر غلام احمد مہجور پر ایک فلم بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اُن کا یہ دورۂ کشمیر اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس فلم میں جو اردو اور کشمیری زبانوں میں تیار کی جائے گی ان کا بیٹا اجے ساہنی (جو بعد میں پریکھشت ساہنی کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہوا) مہجور کا کردار ادا کریں گے اور کلکتہ کے مشہور ہدایت کار پربھات مکرجی کو اس کی ہدایت سونپی گئی ہے۔ اجے ساہنی اس وقت ماسکو کے ایک فلم اِنسٹی ٹیوٹ میں فنِ اداکاری سیکھ رہے تھے۔ ساہنی صاحب نے دبے لہجے میں مجھے بتایا کہ انھیں خانوادۂ مہجور خاص کر ان کا بیٹا محمد امین ابن مہجور بے حد تنگ کر رہا ہے۔ اس کے بعد بلراج ساہنی یہاں سے گویا غایب ہی ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسے بے جا نکتہ چینی اور مخالفت سے بے حد صدمہ پہنچا اور جب کوئی ہفتے بعد مجھے بمبئی سے 28/اگست 1966ء کو انگریزی میں لکھا ہوا ان کا مراسلہ ملا تو معاملے کی گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ ان کے کئی خطوط میں سے ایک خط کا یہ اقتباس اس مسلے پر روشنی ڈالتا ہے:

"ڈیر خیال!

آج مجھے ایک دوست کی وساطت سے سری نگر کے ہفت روزہ "آئینہ" کا ایک تراشہ ملا ہے جس میں چند پریشان کن باتیں لکھی گئی ہیں۔ میرے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ مہجور کے گھر کے لوگ میری لاعلمی میں اس فلم کی مخالفت کا بازار گرم کریں گے۔

"جس طریقہ پر یہ فلم بن رہی ہے اور کچھ تیار شدہ مواد میں نے دیکھا ہے میں اس کی بنا پر بلا شبہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ فلم ہند کے ساتھ ساتھ بیرونی

مارکیٹ میں بھی کامیابی حاصل کرے گی۔ کیا اس صورتِ حال میں کوئی ذی ہوش شخص مجھے یا پربھات کو الزام دے سکتا ہے کہ ہم کشمیر یا مہجور کے ساتھ بے انصافی کرر ہے ہیں؟'' (اس خط کا اصل میرے پاس محفوظ ہے۔ خیالؔ)

اصل میں بات یہ تھی کہ محمد امین ابن مہجور بلراج ساہنی سے بے حساب پیسے اینٹھنا چاہتا تھا جس کی ساہنی میں سکت نہیں تھی کیونکہ ان کے بقول ساری فلم کا بجٹ صرف چار لاکھ روپے کا تھا۔

فلم جب تیار ہوئی تو اس کا پریمیر سری نگر کے ریگل سینما میں ہوا جس میں ریاست کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق بھی موجود تھے۔ البتہ فلم کے کشمیری version کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ اسے کن الماریوں میں دیمک کی نذر کیا گیا۔ دروغ بر گردنِ راوی، کہا جاتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے اس کی نمائش پر پابندی لگوائی کیونکہ ان کی شخصیت کو فلم میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔

بلراج ساہنی سے میری خط و کتابت ان کے آخری دم تک جاری رہی۔ کیا شاندار شخص تھا۔

احمد ندیم قاسمی کے ساتھ میری پہلی ملاقات جنوری 1990ء میں لاہور میں ان کے کام کاج کے دفتر مجلس ترقی ادب لاہور میں ہوئی جس کا اہتمام میرے بہت ہی پیارے دوست کشمیر نژاد کلیم اختر نے کیا تھا۔ کلیم اختر اُس وقت روزنامہ ''مشرق'' کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ کئی اخباروں میں ادبی اور سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے۔

جب ہم کلب روڈ پر واقع قاسمی صاحب کے دفتر میں پہنچے تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کے ایک انبار میں گویا اپنے آپ کو ڈبو کر کام میں لگے تھے۔ انھوں نے سدا بہار تبسم کے ساتھ میرا استقبال کیا اور ساتھ ہی بیٹھی ان کی صاحبزادی منصورہ احمد نے والہانہ خوش آمدید کے پھول ہم پر نچھاور

کیئے۔ قاسمی صاحب کی بغل میں دفتر کے کونے میں پڑی ایک کرسی پر قتیل شفائی پہلے ہی براجمان تھے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میں بھارتی کشمیر سے آیا ہوں تو انھوں نے اپنے خاص پٹھانی انداز میں مجھے گلے لگا کر اپنی محبت اور شفقت کا ظہار کیا۔ یہ محفل دیر تک چلی اور زیادہ تر گفتگو کشمیر کے مسلے کے گرد ہی گھومتی رہی۔ قتیل صاحب نے فخریہ لہجے میں کہا کہ تیس چالیس سال قبل جو نظم انھوں نے آزادیٔ کشمیر کے حق میں لکھی تھی وہ شعری تخلیق اب بھی انہیں پیاری ہے۔

خوش رو منصورہ احمد نے، جو خود بھی اردو کی شاعرہ تھی، مجھے قاسمی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے معتبر جریدے ''فنون'' کے ایک دو شمارے پیش کیے اور یہ اصرار کیا کہ میں کشمیر سے اس رسالے کے لیے اپنی کوئی تحریر ارسال کروں۔ اس ملاقات کا اختتام ایک گروپ فوٹو پر ہوا جس میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، کلیم اختر اور میں شامل ہیں اور جو آج بھی میرے ذاتی تصویر خانے کی زیب وزینت ہے۔

اس ملاقات کے دوران جب میں نے قاسمی صاحب سے پاکستان میں اردو ادب کے حوالے سے چند سوالات کیے تو انھوں نے جواباً کہا کہ پاکستان میں ادب کو کسی بھی فہرست کے اخیر پر ہی رکھا جاتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں بھی اردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔

20 نومبر 1997ء کو جب میں احمد ندیم قاسمی کو کوئی اطلاع دئے بغیر اُن کے دفتر میں گھس گیا تو ان کے کشادہ چہرے پر وہی مسکراہٹ اور تازگی پھیل گئی جس کا وہ ایک پیکر تھے۔ کمرے میں چند لوگ مٹھائیاں بانٹ رہے تھے اور معلوم ہوا کہ اس دن قاسمی صاحب کی اکیاسویں سالگرہ تھی۔ وہ خود اس شادمانی سے بے خبر اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے لیکن وقفے وقفے کے ساتھ اپنی پر وقار مسکراہٹ لے کر اپنے احباب اور قدردانوں کی طرف جو ملتفت نگاہ بھی ڈالتے تھے۔

جب میں نے ان سے درخواست کہ وہ میری اردو تصنیف ''کاروان خیال'' کے لیے پیش نامہ لکھنے کی عنایت کریں تو جو کچھ انہوں نے لکھا اس کا پہلا جملہ یوں ہے:

''غلام نبی خیال کی اس تصنیف کی مثال ایک چمن زار کی ہے جس میں ان تمام رنگوں کے پھول کھل رہے ہیں جو اب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آئے ہیں''۔

اس سے قبل اُسی سال 22 ستمبر کو جب مجھے قاسمی صاحب کی معیت میں ان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے گھنٹے گذر چکے تھے۔ میں نے ان سے رخصت مانگی۔ وہ کھڑے ہو کر پھر ایک بار مجھ سے گلے ملے اور منصورہ سے کہا۔ ''میری کتابیں خیال صاحب کی نذر کرو''۔ قاسمی صاحب نے اپنا مجموعہ کلام ''بسیط'' اور افسانوں کا مجموعہ ''کوہ پیما'' مجھے عنایت کیے اور ان پر اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔

''عزیزم غلام نبی خیال کی نذر''۔ یہ مشفقانہ تحریر میرے لیے ایک تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ بابا احمد ندیم قاسمی کے ساتھ وہ میری آخری ملاقات تھی۔ اُن کے بارے میں بہر حال یہی کہا جاسکتا ہے:

ہر گز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دنیائے ادب کی جن شخصیات کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے وہ سبھی میرے بزرگ اور قابل صد احترام شخصیات تھیں۔ البتہ اگر اردو دنیا کے کسی بھی پختہ مشق سخن ور کے ساتھ میرا رشتہ انتہائی غیر رسمی رہا، وہ تھے شاذ تمکنت۔

شاذ تمکنت بھی کشمیر آئے اور بار بار آئے۔ جب بھی آئے سب سے پہلے مجھی سے ملے اور یہ ملاقاتیں گہری دوستی میں تبدیل ہوئیں۔ میری نظروں میں شاذ ایک عدیم المثال اور اثر انگیز شاعر تھے۔

ان کی شاعری میں نفاست مضمون، سرتازگیٔ اسلوب، معنی آفرینی اور رومانوی فکر کی جلوہ سامانیاں موجود تھیں جو انھیں کئی اور شاعروں سے ممیّز کرتی تھیں۔ انھی دنوں جب میری شادی ہوئی تو میں نے انھیں ایک خط میں اس کی خبر دی۔ جواباً انھوں نے غالباً اسی کارخیر کی تقریب کے حوالے سے یہ چھوٹی سی نظم لکھی اور مجھے بھیج دی:

وا کرو کاسنی گل پوش دریچے جاناں
چاپ کرنوں کی چلی آتی ہے دھیرے دھیرے
تم بھی پردہ نہ کرو میں بھی تکلف نہ کروں
چاند چپ چاپ چلا آئے گا آجانے دو
جانے کیا کہتا ہے دیکھو تو سفیرِ شب تاب
کیسے کھل اٹھتے ہیں اس کے لب وعارض کے گلاب
کیا دعا دیتا ہے اس دولت یکجائی پر!

شاذ کے کئی پیارے خطوط ابھی میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ کرسمس 1960ء کے دن ایک خط کا یہ اقتباص ملاحظہ ہو:

''کشمیر کے دوران قیام میں تمہاری محبتیں کچھ ایسی رحمت آفرین ثابت ہوئیں کہ دل پر آج تک ایک نقش ہے اور یہ لوح تمہاری انگلیوں کے لمس سے آج بھی زرنگار محسوس ہوتی ہے۔ میں نے تمہارا اور تمہارے خلوص کا ذکر بار بار تمہاری بھابی سے بھی کیا۔ اب انھیں بھی تم سے ملنے کا اشتیاق ہو چلا ہے''۔

یہ سالم خط اور نظم میری تصنیف ''کاروانِ خیال'' میں شامل ہیں۔



دنیائے ادب کی دس عظیم کتابیں

جان کیننگ (John Canning) نے عظیم کتاب کی یہ تشریح کی ہے کہ وہ ادبی لحاظ سے غیر معمولی طور پر معیاری ہو۔ اس میں علم کے شعبہ جات کے ساتھ شاندار فکروذہن کی آگہی کا اظہار ہو اور روحانیت کے فقید المثال ادراک پر مبنی ہو۔

دنیا بھر میں جن کتابوں کو عظیم کہا جاتا ہے اُن میں مذہبی صحائف کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ اہل اسلام کے نزدیک دنیا کی سب سے عظیم بلکہ عظیم ترین کتاب الہامی صحیفہ قرآن پاک ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب کے پیروکار اپنی اپنی الہامی کتب کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے ہیں جو اُن کا حق بجانب عقیدہ ہے۔

ادبیات کے تعلق سے چند ہی تصانیف کو عظیم کہلائے جانے کا افتخار حاصل ہوسکا ہے۔ ان کے انتخاب میں بھی اختلافات کی گنجائش موجود ہے، لیکن یہاں بھی انتخاب کرنے والے کی ذاتی پسند وناپسند ہی کو ملحوظ نظر رکھا جاسکتا ہے۔ اسی امر کے پیش نظر اس مقالے میں چند ایسی کتب کو زیر بحث لایا گیا ہے جو میری نظروں میں بہت بڑی عظمت کی حامل ہیں۔ اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس زمرے میں مکالمات افلاطون، مادام بواری، مارکس کی کیپٹل، یولسز، ڈاکٹر ژواگو، دیوان حافظ، پیراڈائز لاسٹ، گڈارتھ، شیکسپیئر کے ڈرامے اور کئی اور لاجواب کتب کو بآسانی شامل کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ مقالہ محض میری ذاتی پسند کا ماحصل ہے اور اختصار کے پیش نظر اس میں بھی صرف دس کتابوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ہومر کی ایلیاڈ

ہومر (9th Century BC) قدیم یونان کا سب سے مشہور شاعر تھا جس کی پیدائش دنیا کے اولین مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق 850 قبل مسیح میں ہوئی۔ ہومر نے ایلیاڈ ***Iliad*** جیسا شاندار رزمیہ تخلیق کر کے دنیائے سخن گوئی میں ایک ایسی جگہ بنالی کہ تین ہزار سال گزرنے کے باوجود آج تک اس مرتبے کو کوئی اور نہیں پہنچ سکا ہے۔ البتہ رینان کی یہ پیش گوئی کہ ''ایک ہزار سال کے بعد دنیا کی ساری کتابیں دھول چاٹتی ہوں گی اور اگر کوئی باقی رہے گا تو وہ ہے ہومر'' اس کی اپنی صوابدید کی عکاسی کرتی تھی۔

سماجیات کے تناظر میں کہا جاتا ہے کہ فتنہ وفسادات کی جڑ 'ز' حرف سے ہی متعلق ہوتی ہے یعنی زر، زن اور زمین۔ ایلیاڈ کی کہانی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا مرکزی کردار بھی ایک خوبصورت عورت ہیلن ہی ہے جو دوممالک یعنی یونان اور ٹرائے کے درمیان دس سالہ خون ریز جنگ کا باعث بنی۔ اس جنگ کے نتیجے میں ٹرائے کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

ٹرائے کا اصلی نام ایلیم تھا۔ اسی مناسبت سے ہومر نے اپنی کتاب کا نام ایلیاڈ رکھا۔ ہومر قدیم یونان کا ایک نابینا گویا تھا جو گھر گھر جا کر یونان کی حکایاتی داستانیں اور سینہ بہ سینہ چلنے والی دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں سنا سنا کر لوگوں سے کچھ پیسے کما کر اپنا گزر بسر کر لیتا تھا۔ وہ رباب جیسا ایک آلۂ موسیقی بجا کر بھی عام لوگوں کے دل بہلاتا تھا۔

ایلیاڈ کا قصہ قدیم یونان کی دیومالائی حکایات پر مشتمل ہے جس میں انسان انھی دیوتاؤں کو خدائیت کا درجہ دے کر انھی کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔

ایلیاڈ میں یونان اور ٹرائے کے درمیان بارہویں صدی قبل مسیح میں لڑی گئی اُس جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے جو دس سال تک جاری رہی اور جس نے ہزاروں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ شاعر نے بہر حال اس جنگ کے دسویں سال یعنی 1184 قبل مسیح کا حال اپنے رزمیہ میں اس لیے نظم کیا ہے کہ اگر وہ اس جنگ کے سارے عرصے پر محیط واقعات کو قلم بند کرتا تو داستان کی چاشنی اور اثر انگیزی متاثر ہو جاتی۔

ہومر نے جن لوگوں کے لیے ایلیاڈ لکھی وہ اس کے تمام واقعات سے واقف تھے، لیکن شاعر نے جس انداز میں ان کی شیرازہ بندی کی اُس نے ہومر کو یونانِ قدیم کا سب سے مقبول اور محبوب سخن گو بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ دارا نے اپنی جنگی مہمات کے دوران لوٹ کا جو مال جمع کیا تھا اُس میں سے اُسے ایک چھوٹا سا صندوق بہت پسند آیا۔ مصاحبوں سے پوچھا کہ اس میں کون سی چیز رکھی جائے؟ ساتھیوں نے الگ الگ مشورے دیے جن میں سے کوئی بھی اس کی پسند کا نہیں تھا اور پھر وہ خود ہی اخیر پر بولا، ''میں اس میں ہومر کی ایلیاڈ رکھوں گا''۔

کالی داس کی شکنتلا

کالی داس کب اور کہاں پیدا ہوا؟ اس کے بارے میں متضاد آرا پیش کی گئی ہیں۔ اس کی جائے پیدائش کے سلسلے میں مالوا میں مندسور، اجین اور کشمیر کے نام زیرِ تذکرہ ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کہتے ہیں ''میں نے بھی کہیں پڑھا ہے کہ وہ کشمیر میں پیدا ہوا'' دلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر پنڈت لچھمی دھر شاستری نے انگریزی میں ''کالی داس کی جائے پیدائش'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی جو 1926ء میں شائع ہوئی۔ اس میں پروفیسر شاستری نے کالی داس کو کشمیری ثابت کرنے کی خاطر یہ دلائل پیش کیے ہیں:

(1) وہ کشمیر کے دھان کے کھیتوں اور باغات کا جذباتی انداز میں ذکر کرتا ہے۔

(2) اس نے زعفران کے پھولوں کا ہو بہو نقشہ پیش کیا ہے جو صرف کشمیر کی پیداوار ہے اور جس کے بارے میں کسی اور غیر کشمیری نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ دورِ گذشتہ میں کشمیری عورتیں اپنے سینوں پر زعفران کے نشان ثبت کرتی تھیں۔ اس کا ذکر بھی کالی داس نے کیا ہے۔

(3) جس خوبصورتی سے اُس نے دیودار کے جنگلوں، مرگوں، جھیلوں، شیروں کی گپھاؤں، پہاڑوں اور نافہ غزال کی تصویر کشی کی ہے وہ ایک کشمیری فن کار ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔

(4) شکنتلا ڈرامے میں ستی سر نامی ایک بہت بڑی جھیل سے کشمیر کا وجود عمل میں لانے کا کالی داس نے حوالہ بھی دیا ہے اور یہ کہ اس نے کشمیر کے حوالے سے اپنی جانبداری کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے۔

(5) میگھ دُوت نظم پڑھ کر بھی یہ احساس ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ کشمیری الاصل تھا۔ بدقسمتی سے مزید مطالعے اور تجزیے کے لیے انگریزی میں تحریر کردہ پروفیسر شاستری کی یہ کتاب

The Birthplace of Kalidasa بسیار کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکی۔

چند تحقیق کاروں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کالی داس کشمیر ہی میں لار کے دیہات کے قریب منہ گام میں پیدا ہوا۔ البتہ اپریل 1964ء میں اُجین سے سات میل دور کالی داس نام کے محلے میں ایک لمبا کتبہ دریافت ہوا جس پر یہ عبارت کندہ تھی کہ کالی داس بکرماجیت کے دور میں اُجین میں پیدا ہوا اور وہیں پر اُس کی پرورش ہوئی۔ کتبے پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کالی داس اُجین

ہی میں چورانوے سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔

کالی داس کے بارے میں کئی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ ابتدائے شباب میں بھی حد درجہ ابلہ اور نافہم شخص تھا۔ لیکن بعد میں کالی دیوی نے اس پر مہربان ہو کر اسے علم اور آگہی کے رموز سے واقف کیا اور اسی تناسب سے اس کا نام کالی داس یعنی کالی ماتا کا غلام پڑ گیا۔ کالی داس کی موت کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ ایک بار لنکا میں کمار داس کا مہمان تھا کہ اسی دوران ایک رقاصہ نے اسے قتل کیا۔ مزید تفصیل یوں ہے کہ اس قتالہ نے کالی داس کے سامنے یہ مصرعہ پڑھا:

کنول کے پھول پر کنول کا ہونا سنا ہے پر دیکھا نہیں

اور سبھی حاضرین سے کہا کہ وہ اس پر گرہ لگائیں۔ کئی سخن وروں نے کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ بالآخر کالی داس نے اس حسینہ سے مخاطب ہو کر کہا:

اے نازنین! تمہارے پھول جیسے چہرے پر کس طرح دونوں سج رہے ہیں؟

رقاصہ بے حد خوش ہوئی مگر اس اندیشے سے کہ کسی کو پتہ نہ لگے کہ یہ مصرعہ اُس کا نہیں ہے، اس نے کالی داس کو قتل کر ڈالا، لیکن اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔

کالی داس نے جو ڈرامے اور طویل نظمیں لکھیں اور جو ہم تک پہنچ سکیں اُن میں شکنتلا، میگھ دوت، کمار سمبھو، رگھو مش، رتو سنگھار، مالویکا گنی متر اور وکرم اُروشی شامل ہیں۔ شکنتلا کالی داس کی تمام تخلیقات میں ایک ایسا شاہکار ہے جس نے اس کی شہرت کو دور دور تک پہنچایا اور اس کے نام کو بقائے دوام بخشا۔ شکنتلا کی کہانی بھی ہندو دیومالا سے ماخوذ ہے۔ یہ کہانی مختصراً یوں ہے کہ راجہ دشینت

نے ایک جنگل میں ایک خوبصورت عورت شکنتلا کو دیکھا جو وہاں ماں باپ کو چھوڑ کر کنو ریشی کے پاس دن گزار رہی تھی۔ دشینت نے فوراً شکنتلا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی جو فوراً منظور ہوئی، کیونکہ شکنتلا خود بھی اس کے عشق میں کھوئی تھی۔ دونوں نے گاندھرو رسم کے مطابق شادی کی اور دشینت شکنتلا کو دربار میں بلانے کا وعدہ کر کے اور اسے یادگار کے طور پر ایک انگوٹھی دے کر واپس چلا گیا۔ دریں اثنا شکنتلا نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ شکنتلا دشینت کے دربار میں پہنچی تا کہ راجہ اُس کے بیٹے یعنی دشینت ہی کے بیٹے کو تخت نشین بنا دے۔ دشینت شکنتلا کو سرے سے ہی بھول چکا تھا اور اس نے اسے پہچاننے سے سراسر انکار کیا۔ شکنتلا نے ثبوت کے طور پر دشینت کی دی ہوئی انگوٹھی اُسے دکھانی چاہی، لیکن یہ دیکھ کر اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ انگوٹھی غائب تھی۔ دراصل یہ انگوٹھی شکنتلا کی انگلی سے نہاتے وقت دریا میں گر گئی تھی۔ شاہی محل میں دشینت اور شکنتلا کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ایک مچھیرا حاضر ہوا، اُس نے انگوٹھی پیش کرتے ہوئے راجہ سے کہا کہ یہ اُسے ایک مچھلی کا پیٹ چیرتے وقت ہاتھ لگی ہے۔ راجہ نے انگوٹھی اور شکنتلا دونوں کو پہچان لیا اور محل میں اُسے رانی بنا کر اور بیٹے کو تخت کا جانشین قرار دے کر خدا کے حضور سر بسجود ہوا۔

کالی داس نے تمام ہم عصر سنسکرت نگاروں اور اس سے پہلے کے تخلیق کاروں پر اس لحاظ سے سبقت حاصل کی ہے کہ وہ اپنے مصور قلم سے باریک ترنکتوں اور ایسی چیزوں کی شاندار تصویر کشی کرتا ہے جن پر دوسروں کی نظر نہ پڑی ہو۔ وہ فطرت کے الگ الگ رنگوں کی جادوگری میں محو ہو جاتا ہے اور پھر اس وجدانی کیفیت کو اپنے قلم کی مصوری سے مزین کرتا ہے۔ اس کے مشہور ترجمہ کار آرتھر ڈبلیو رائڈر نے اسی لیے کہا ہے کہ کالی داس کا مقام نہ صرف انا کریون، ہوریس اور شیلی کے ہم پلہ ہے بلکہ وہ سوفوکلیز، ورجل اور ملٹن کا بھی ہم نشین ہے،

اور جرمن شاعر اور ڈراما نویس گوئٹے نے اپنے اشعار کالی داس کو نذر کیے ہیں:

تم خواہ بہار کے خوبصورت پھولوں کا ذکر کرو!
یا خزاں کے رس بھرے میووں کا
یا اُن اشیا کا جو روح کو وجد میں لاتی ہیں
اسے آرام پہنچاتی ہیں اور شادماں کرتی ہیں
یا تم ہر اُس شے کو ایک ہی نام دو
جو زمین و آسمان میں موجود ہے
اس کا بس ایک ہی نام ہوگا۔ شکنتلا
بس یہی کافی ہے

ورجل کی اینیڈ

ورجل 70 قبل مسیح لاطینی شاعروں کا ملک الشعرا تھا۔ اس کی اینیڈ **Aeneid** کو اطالوی ادبیات میں ایک الہامی صحیفے کا رتبہ حاصل ہے۔

ورجل 15 اکتوبر 70 قبل مسیح کو اطالیہ کے مانتوا مقام پر پیدا ہوا اور وہ عمر میں آگسٹس سے سات سال بڑا تھا۔ ورجل کی جوانی کے دنوں میں جولیس سیزر روم کا بادشاہ تھا جس نے ورجل کو اپنے دربار میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس کی کوئی مصدقہ وجہ اگرچہ معلوم نہیں لیکن یہ اغلب ہے کہ ورجل سیزر سے عمر میں تیس سال چھوٹا تھا اور بادشاہِ وقت نے اسی لیے اسے دربار شاہی میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا۔ اڑتالیس قبل مسیح میں جولیس سیزر کے خلاف بغاوت ہوئی اور مارچ 44 قبل مسیح میں اسے دردناک طریقے سے قتل کیا گیا۔ ورجل کے مداح شہنشاہ آگسٹس نے اس بے انصافی کی تلافی کی جب اس نے ورجل کو درباری شعر کی جگہ کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ اینیڈ کو ایک عظیم قومی ورثے کی شکل میں دور دور تک شہرت بخشوانے کا بھی اعلان کیا گیا۔

سیزر یعنی قیصر روم کے دل دہلانے قتل کے بعد روم کی حالت بے حد دگر گوں ہوئی اور ملک زوال پذیر ہونے کی دہلیز تک جا پہنچا۔ عوام کے دل و دماغ میں فکری خلفشار، ذہنی ہیجان اور مایوسی نے گھر کر لیا تھا اور اس پریشان کن صورت حال نے آگسٹس کو بھی ملول کر دیا۔ اس کے مغموم دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی شاعر کے قلم سے ایک ایسا شاہکار تخلیق کروایا جائے جسے پڑھ کر ہزیمت زدہ رومیوں کے حوصلوں کے بجھتے ہوئے چراغ پھر سے روشن ہوں۔ یہ مقصد پورا کرنے کے لیے اس نے ورجل ہی کو منتخب کیا جو اُس کا منظور نظر تھا اور ورجل ہی کے قلم سے تخلیق شدہ یہ عظیم رزم نامہ اسے روم کی ذہنی نجات کا مظہر دکھائی دیا۔ اینیڈ کو مکمل کرنے میں ورجل کو سالہا سال لگے۔ کبھی کبھی وہ ایک دن میں صرف ایک شعر موزوں کر پاتا تھا۔

اینیڈ اصل میں وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں ہومر کی ایلیاڈ کا اختتام ہوتا ہے۔ ورجل کے رزمیہ میں تباہ شدہ ٹرائے کا ایک نڈر سپاہی اینیاس جان بچا کے روم سے اپنی جنگی مہمات پر نکلتا ہے۔ ورجل نے اینیاس کے انھی کارناموں کے تانے بانے سے روم کی عظمت رفتہ کو بحال کر کے اسے حیات جاودانی بخشنے کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اگر یہاں پر ہومر کی ایلیاڈ اور ورجل کی اینیڈ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ جہاں ہومر نے اپنے رزمیہ میں ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو پڑھنے سے زیادہ سننے سے تعلق رکھتا ہے، وہاں اس کے برعکس جب ورجل نے اپنا ادبی شاہکار تخلیق کرنے کا بیڑا اُٹھایا تو اس کی نظروں میں روم کے اعلیٰ درجے کے لوگ اور پڑھے لکھے قاری تھے۔ اس طرز تحریر نے اگرچہ اینیڈ کو ادبی معیار کے لحاظ سے مقابلتاً بہتر شکل دی ہے لیکن مقبولیت میں ایلیاڈ دوسری ہر تخلیق یا تصنیف پر سبقت لے جاتی ہے۔

اطالوی شاعر ڈانٹے (Dante) نے اپنے فکری رہنما ورجل کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

تم وہی ورجل ہو، گرجتا ہوا چشمہ شیریں
جہاں سے کلام کے دھارے اُبلتے ہیں
جو لہریں مارتے ہیں
تم تو وہی ورجل ہو
جو دوسرے شاعروں کے لیے روشنی کا مینار ہے
تم میرے استاد اور پیارے سخن گو ہو

فردوسی کا شاہنامہ

شاہنامہ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی (940-1020) پارس کی وہ قدیم داستان ہے جو فارسی زبان میں دنیا کا طویل ترین رزمیہ کہلاتا ہے۔ ''بادشاہوں کی کتاب'' نامی پچاس ہزار ابیات پر مبنی یہ شعری کارنامہ فردوسی نے اپنی عمر کے تیس سے زیادہ سال میں قلم بند کرلیا تھا۔ لیکن اُسے کیا ملا، وہ بجائے خود ایک دردناک واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہنامہ بادشاہِ وقت محمود غزنوی (971-1030) کے دور میں تخلیق ہوا جب غزنوی نے فردوسی کو دربار میں بلا کر پارس کی شان رفتہ کو نظم کرنے کی درخواست اس کے سامنے رکھی اور خود یہ پیش کش بھی کی کہ وہ شاعر کو ایک ایک شعر کے عوض ایک ایک اشرفی عطا کرے گا۔ تو فردوسی نے تیس سال تک خون پسینہ ایک کرکے اور آنکھوں کا خون جلا کر بالآخر شاہنامہ مکمل کر ہی لیا۔ یہ عظیم الشان شاہکار فردوسی نے 977ء اور 1010ء کے درمیان مکمل کرلیا اور اسے کئی ممالک یعنی پارس، افغانستان، تاجکستان اور ساری فارسی دان دنیا میں قومی رزمیہ قرار دیا گیا:

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

(میں نے ان تیس برسوں میں بہت تکلیف اُٹھائی، لیکن اسی فارسی (شاہنامہ) سے عجم کو دوبارہ زندہ کرلیا)

فردوسی خوشی خوشی اپنے عظیم کارنامے کا مسودہ لے کر دربارِ شاہی میں چلا گیا، جہاں یہ سن کر اُس کے دل کو زبردست ٹھیس لگی کہ بادشاہ اپنے وعدے سے مکر گیا تھا اور وہ ایک شعر کے لیے ایک اشرفی دینے سے منکر ہوا۔ فردوسی عالم مجبوری میں خاموشی سے دربار سے نکلا۔ بادشاہ اس کے بعد اُس اضطراب میں مبتلا ہوا کہ اُس نے فردوسی کے ساتھ سراسر بے انصافی کی ہے۔ اس نے ایک قاصد کے ہاتھوں ساری کی ساری رقم فردوسی کے ہاں روانہ کی۔ قاصد جب شاعر کے گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔

مشرق میں فارسی زبان نے ادبیات کو کئی عدیم المثال شہہ پاروں سے مالا مال کیا ہے جن میں مثنوی رومی، دیوان حافظ، گلستان اور بوستان، رباعیات عمر خیام وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان میں شاہنامہ اس وجہ سے ایک منفرد فن پارہ مانا جاتا ہے کہ اس میں فردوسی نے قدیم ایران کو ادبی، ثقافتی اور تاریخی لحاظ سے ساری دنیا کے کینواس پر نمایاں کیا ہے۔

شاہنامہ میں بہت حد تک ایران کے دیو مالائی اور کسی حد تک اس کے قدیم تاریخی ماضی کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں دنیا کے آغاز سے لے کر ہم عصر تاریخ کے کئی حکایاتی اور حقیقی واقعات کا بیان ہے جن سے وابستہ کردار رُستم، سہراب، شہزاد، پرویز، اردشیر، شہریار، سہبرام، نوشیرواں، سام، نریمان آج بھی ہمارے معاشرے میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

عام اتفاق ہے کہ ایران میں فردوسی کے درجے کا کوئی شاعر آج تک پیدا

نہیں ہوا۔ صرف انوریؔ اُن شعراء میں ہے جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

رزمیہ شاعری کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کی یہ رائے ہے:

''رزمیہ شاعری کے کمال کی چند شرائط ہیں۔ واقعہ ایسا مہتمم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو، لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور وشور اور پُر رعب طریقے سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں، معرکہ جنگ کے تمام ساز وسامان اور آلات واسلحۂ جنگ تفصیل سے بیان کیے جائیں، سالار فوج اور مشہور بہادر کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤ پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں۔ شاعری کے انواع میں رزمیہ شاعری بہترین انواع ہے۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اُس کا کارنامہ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے''۔

ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی

ڈانٹے (1265 تا 1321 ق م) عیسوی سنہ کے 1263 سال بیت چکے تھے اور چوسٹھواں سال اگست کے مہینے تک پہنچا تھا کہ اٹلی کے شہر فلورنس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ لوگ ششدر ہو کر رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے آسمان پر ایک ایسا دُم دار ستارہ دیکھا جس نے دم زدن میں آکاش سے لے کر زمین تک ایسی روشنی پھیلائی کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ تابناک ہوا۔ عوام نے قیاس آرائیاں کیں کہ کچھ بُرا پیش آنے والا ہے، مگر بزرگوں نے یہ بشارت دی کہ اس شہر میں ایک بہت بڑا شخص جنم لے گا۔ چند ماہ بعد یعنی

1265 میں مئی کے اخیر میں ڈانٹے پیدا ہوا۔ اس کا نام ڈانٹے الیگھیری رکھا گیا مگر بعد میں وہ ڈانٹے ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ ڈانٹے جب نو سال کی عمر کو پہنچا تو وہ ایک محفل میں سات سالہ بیٹرس پر عاشق ہوا جو بعد میں اس کے خوابوں کی ملکہ اور خیالوں کی تحریک بن گئی۔ نو سال بعد اس نے ملاقات کا بیان ایک تخلیق 'لاوتانووا' میں ان الفاظ میں قلم بند کیا، "اُس دن وہ بہترین رنگ کا پوشاک پہن کر آئی تھی، لاجوردی رنگ کا ہلکا اور بے حد دل نشین۔ سچ پوچھو تو کہوں کہ اُس لمحے میرے روم روم میں اس شدت سے تھرتھراہٹ پیدا ہوئی کہ میرے جسم کے ہلکی نبض بھی ہلنے لگی اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں میری زبان سے یہ الفاظ نکلے:

دیکھو! اُس آقا کو جو میری طرف آ رہا ہے
وہی میرا حاکم بن جائے گا۔

ڈانٹے اور بیٹرس کا یہ عشق چند سال تک قائم رہنے کے بعد اُس وقت منطقی نتیجے کو پہنچا جب بیٹرس کی شادی شہر کے ایک رئیس سے ہوئی۔

فلورنس میں جب اقتدار کے پجاریوں نے سفید اور کالے کے نام پر خانہ جنگی اور افراتفری کا بازار گرام کیا تو ڈانٹے شہر سے دور ایک پُرسکون جگہ پر رہائش پذیر ہوا، لیکن اس کی غیر حاضری میں کالے لوگوں نے اس پر مقدمہ چلایا اور یہ سزا تجویز ہوئی کہ اسے پھانسی دی جائے یا اگر وہ واپس آیا تو اسے زندہ جلایا جائے۔ یہ سزا بہرحال عمل میں نہیں لائی جاسکی، کیونکہ جب ڈانٹے کو اس کا پتہ چل گیا تو اس نے دوبارہ فلورنس کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔ جلاوطنی کے دوران ہی ڈانٹے کو ڈواین کامیڈی **Divine Comedy** لکھنے کا خیال آیا۔ جس نے بعد میں اُسے اٹلی کے ملک الشعراء کا درجہ بخشا۔

ڈواین کامیڈی تین حصوں یعنی جہنم، اعراف اور جنت پر مشتمل ہے۔ یہ

شاہکار ڈانٹے کے تصوراتی سفر پر مبنی ہے جس میں وہ ان تینوں مابعد حیات جگہوں کا سفر اختیار کرتا ہے اور اس سفر کے دوران ایسی بے شمار تاریخی ہستیوں کے ساتھ ملاقات کر کے یا ان پر اپنی تنقیدی یا توصیفی رائے ظاہر کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اس سارے سفر میں ڈانٹے کا رہبر ورجل ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کے نقاد ڈانٹے کی یادداشت پر حیران ہیں کہ اس کے ذہن میں اتنے نام موجود تھے۔ ڈواین کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد ٹی ایس ایلیٹ نے کہا کہ ''نئی دنیا کو صرف دو ہستیوں نے آپس میں بانٹا ہے اور وہ ہیں ڈانٹے اور شیکسپیئر، تیسرا کوئی ان کا شریک نہیں''۔

ڈانٹے اپنے ایک مراسلے میں ڈواین کامیڈی کے تعلق سے لکھتا ہے کہ ''اس کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں رہنے والوں کو دکھوں اور مصائب کی حالت سے نکال کر مسرت اور سرور کے عالم میں سرفراز کیا جائے'' حقیقت بھی یہی ہے کہ ڈانٹے کی وفات کے فوراً بعد یہ تخلیق سارے روم میں گھر گھر پڑھی جانے لگی اور اسے قومی وراثت کا درجہ نصیب ہوا۔ کٹر عیسائیوں نے تو اسے ایک مذہبی صحیفے کا درجہ دیا، کیونکہ اس میں عیسائیت کی زوردار تبلیغ کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے تیئں ہتک آمیز زبان سے کام لیا گیا تھا۔ کارلائل نے بھی ان مداحوں کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا کہ ''ڈواین کامیڈی جیسی مقدس کتاب لکھ کر ڈانٹے نے قوم میں روحانیت اور نیک اعمال کی بہترین صفات پیدا کیں''۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب ڈانٹے واپس وطن لوٹا تو وہاں کی خواتین نے سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہا ''دیکھو! یہ وہی ہے جو دوسری دنیا میں چلا گیا تھا اور وہاں سے مُردوں کی خبر لے کر آیا ہے''۔

اکیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد ڈانٹے نے اپنی جائے پیدائش سے دور راوینا کے شہر میں آخری سانس لی۔ ڈانٹے کی وفات کے

پانچ سو سال بعد لارڈ بائرن اُس کی قبر پر گیا اور وہی بائرن جو اپنی زندگی میں زندوں کے سامنے بھی نہیں کھلا تھا اُس کے مقبرے کے سامنے جھک کر ایک نومولود بچے کی طرح زار زار رونے لگا۔

شیکسپیئر کا ہیملٹ

ولیم شیکسپیئر (1464 تا 1616ء) دنیا کا عظیم ترین ڈراما نگار مانا جاتا ہے۔ اس کے سنتیس ڈراموں میں ہیملٹ کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی جسے اس برطانوی شاعر کے بے مثال المیہ شاہکار کا رُتبہ حاصل ہوا۔

شیکسپیئر کی شخصیت دنیا میں گونا گوں کمالات کے ساتھ متعارف ہوئی۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں تھا جس نے ڈراموں میں بھی بہترین سخن گوئی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے ڈرامے کئی قدیم مما لک کی تاریخی، ثقافتی اور حکایاتی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

کئی نقادوں کا خیال ہے کہ اسی خداداد صلاحیت کی بنا پر اس فنکار پر غالباً سب سے زیادہ تعداد میں کتابیں اور تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھے گئے۔ علامہ اقبال نے اس طرح اس رازدانِ اسرارِ فطرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

شیکسپیئر کی پیدائش اگرچہ انگلستان کے شہر سٹراٹ فورڈ میں ہوئی لیکن لندن منتقل ہونے کے بعد اس کی ادبی اور فنی صلاحیتیں نکھر آئیں جب اس کی ملاقات کئی ادیبوں اور ڈراما نویسوں کے ساتھ ہوئی، جن میں ایڈمنڈ سپنسر، ٹھامس گرین، جارج چیپمین، کرسٹوفر مارلو، بین جانسن اور فلیچر شامل تھے۔ یہاں ان

فنکاروں کی وساطت سے اوران کی صحبت میں وہ 1484 تک ایک اچھا ڈرامانگار بن چکا تھا۔ اپنی عمر کے تئیسویں سال یعنی 1487 میں ملکہ برطانیہ الزبیتھ نے اسے دربار میں اداکاری کرنے کی دعوت دی۔ ملکہ اس کے فن اوراس کی اُبھرتی ہوئی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئی اور شیکسپیئر کو مناسب انعام سے نوازا۔ ملکہ کا شکریہ شاعر نے اپنے ڈرامے ''وسط گرما کی شب کا خواب'' میں کیا ہے۔

لندن میں بیس سال گزارنے کے بعد شیکسپیئر 1607ء میں واپس سٹراٹ فورڈ آیا۔ اس دوران وہ دورونزدیک مشہور ہو چکا تھا اور مالی لحاظ سے بھی آسودہ حال ہو چکا تھا۔ لندن میں اس کی صحت بگڑ گئی تھی اور پھر دنیائے فن وادب کا یہ لافانی معما 23 اپریل 1616ء کو خالق حقیقی سے جاملا۔

شیکسپیئر نے کل سنتیس (37) ڈرامے لکھے، جنھیں المیہ، بزمیہ، رومانوی اور تاریخی اصنافِ ادب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ان سبھی میں اسے ہیملٹ کے لیے سب سے زیادہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ پانچ سو سال گزرنے کے باوجود یہ ڈرامہ آج بھی دنیا بھر کے سٹیج پر اور تھیٹروں میں کھیلا اور پسند کیا جاتا ہے۔

ہیملٹ مختصراً ایک بے رحم اور خودغرض بھائی کی کہانی ہے جس نے تخت وتاج کا مالک بننے کی خاطر اپنے فرشتہ صفت بھائی کو قتل کیا۔ اُس کی بیوی کو پھسلا کر اس کے ساتھ شادی کرلی اور پھر بادشاہت پر قبضہ جمالیا۔ مقتول بادشاہ کی مضطرب روح اپنے بیٹے ہیملٹ کو اس جرم کا بدلہ لینے کی تاکید کرتی ہے۔ ظالم بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو وہ ہیملٹ کی محبوبہ اوفیلیا کے بھائی لائرٹیز کو ہیملٹ کے خلاف ورغلاکر ان دونوں کے مابین لڑائی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لڑائی میں ہیملٹ زہر بھری تلوار کی ضرب سے مرجاتا ہے اور جان دیتے ہوئے اپنے بدبخت چچا کی بھی جان لیتا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کا خام مواد یونانی، لاطینی، برطانوی، دیومالا اور تاریخ اور بائبل سے ماخوذ ہے جسے شیکسپیئر نے اپنے فنکارانہ کمال سے نئے معنی اور نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

گوئٹے کا فاؤسٹ

عیسوی سن کے 1749 ویں سال میں 28 اگست کی دوپہر ڈھل رہی تھی کہ جرمنی کے شہر فرانکفورٹ میں اٹھارہ سالہ ایلزبیتھ کے یہاں ایک بے حس سا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مر چکا ہے۔ بقول ٹامس مان، ''یہ ایسی کیفیت تھی کہ جیسے یہ نومولود ماں کی گود سے نکل کر سیدھا زمین کی گود میں چلا جائے گا'' لیکن اس کے روئی کے گالے جیسے جسم میں رفتہ رفتہ حرکت ہونے لگی۔ بعد میں ٹامس مان نے اسی بچے کے بارے میں کہا ''کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ادبی شخصیت کی بلندی اور شان کن سرحدوں چھو کو لے گی''۔

یہ تھا یوہان وولف گانگ وان گوئٹے جو وقت گزرنے کے ساتھ نہ صرف سرزمین المانیہ کا بلکہ سارے یورپ کا ایک ممتاز اور عدیم المثال شاعر، ڈراما نگار، فلسفہ دان، انشا پرداز اور ناول نویس بن گیا اور ان فنون لطیفہ میں اس نے اپنے فنی کمال کے موتی بکھیرے۔ یہ ساری خصوصیات اس میں اس وجہ سے سمٹ کر آئی تھیں کہ اس کا تاریخ اور تہذیبوں کا مطالعہ وسیع تھا۔

گوئٹے کے سبھی ادبی کارناموں میں اُس کا لافانی شاہکار فاؤسٹ سرفہرست ہے۔ اس تخلیق میں شاعر نے فاؤسٹ کے کردار کو نیکی اور بدی کی دیرینہ لڑائی کے حوالے سے بے حد پُراسرار انداز میں پیش کیا ہے۔

فاؤسٹ اپنی ہوسناک زندگی کے لیے ہر طرح کی سرشاریاں اور

شادمانیاں حاصل کرنے کو دیوانگی کی حد تک بے قرار ہے اور اپنی ان دُنیوی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ شیطان کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے جس پر وہ اپنے خون سے دستخط کرتا ہے۔ لیکن آخر کار فتح الوہی صداقت اور ابدی انسانیت ہی کی ہوتی ہے۔ علامہ اقبال ان الفاظ میں اس ڈرامے کی تعریف وتحسین کرتے ہیں، ''اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہدوپیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونام کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آسکتا''۔

مولوی عبدالقیوم خان باقی بھی، جنھوں نے فاؤسٹ کا منظوم اُردو ترجمہ کیا ہے، کم وبیش اقبال ہی کی تائید کرتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ ''فاؤسٹ میں قدرت کی دو متضاد قوتوں کی کشمکش ہے جس کی ایک حد شیطان اور دوسری حد انسان ہے۔ اس کشمکش میں قدرت دنیا کی سب سے بڑی نیکی یعنی عشق کے ذریعے مداخلت کرتی ہے''۔

گوئٹے نے بیاسی سال کی لمبی عمر پائی۔ فاؤسٹ کا کردار اس دوران سالہا سال تک اس کے تحت الشعور میں کروٹیں لیتا رہا۔ جب وہ بیس سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے اس ڈرامے کے پہلے حصے کا آغاز کیا اور اسے اکیاون سال کے بعد مکمل کیا۔

فاؤسٹ کی کہانی دراصل جرمنی کا ایک تخیلاتی قصہ پارینہ ہے جو سینہ بہ سینہ نسل درنسل منتقل ہوتا رہا۔ اگرچہ سالہا سال تک لوگوں کے پاس گزرتی ہوئی یہ کہانی متن اور معنی کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً کئی تبدیلیوں سے گزرتی رہی لیکن اس کے مرکزی کردار فاؤسٹ کے ساتھ عوام کی دلچسپی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سولہویں صدی میں اسے کرسٹوفر مارلو نے انگریزی زبان میں

ڈھالا جو مقامی طور پر بہت مشہور ہوا۔

گوئٹے کے نہایت دلچسپ اور تذبذب سے بھرپور ڈرامے کی کہانی کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

گوئٹے ایک مضطرب اور ذہنی طور پر بے قابو افسانوی کردار کا نام ہے جس نے تمام رائج الوقت علوم اور فنون کی مکمل آگاہی حاصل کی ہے۔ اس کے باوجود وہ تشنہ کام اور نامکمل وجود ہی رہا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کی پیاسی روح پر جنسی وحشت کا غلبہ تھا اور وہ اس جسمانی خواہش کو ہر قیمت پر اور ہر طرح سے مسلسل پورا کرنے کے لیے ہمیشہ مضطرب رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی دُنیوی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اس نے اپنی روح شیطان کے ہاتھ میں گرو رکھ دی۔ کہانی یوں ہے:

گوئٹے اپنے کمرے میں بیٹھا ہے اور ہزار طرح کے افکار میں گھرا ہوا ہے۔ دریں اثنا ایک روح کمرے میں داخل ہوتی ہے جس کے ساتھ گوئٹے کی تلخ کلامی کے بعد روح وہاں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اگلے روز گوئٹے اُلجھنوں و پریشانیوں سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ابھی وہ زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگانا ہی چاہتا ہے کہ باہر سے ایسٹر کا گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ خودکشی کا ارادہ ترک کرتا ہے کہ اس کے بعد ایک کتا اُس کا پیچھا کرتا ہے جو اپنی شکل بدل کر شیطان کی صورت میں گوئٹے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس نے گوئٹے کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ وہ اس ہوس پرست شاعر کو ہر طرح کی لذتوں سے محفوظ کرنے کی یقین دہانی کر کے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ معاہدہ کی رو سے گوئٹے جو چاہے وہ اسے ملے گا۔ البتہ اگر وہ کسی بھی موقعے پر وقت کی طرف مخاطب ہو کر اس سے کہے، "اے وقت کے خوبصورت لمحے! ذرا ٹھہر!" تو شیطان اُسی وقت آکر اس کی روح قبض کرے گا اور اسے جہنم کی

گہرائیوں میں دھکیل دے گا۔ گوئٹے نے شیطان ہی کے بہکاوے سے آتش کدۂ عشق کے دہکتے انگاروں کو بجھانے کے لیے اپنی محبوبہ ماگریٹے کو ہوس کا شکار بنایا اور جب وہ حاملہ ہوئی تو سماج میں مطعون ہونے کے ڈر سے اس نے اپنے نوزائیدہ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس جرم کی پاداش میں اُسے جیل جانا پڑا جہاں وہ زندگی کی ویرانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر بیٹھی۔ دنیا کی تمام خوشیوں، لذتوں اور مرادوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد ایک دن گوئٹے ایک بے حد خوبصورت شام کا دلکش نظارہ دیکھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے:

''اے دور بھاگتے ہوئے لمحے، ذرا ٹھہر!''

شیطان فوراً اُس پر جھپٹ کر اس کی جان لینا چاہتا ہے مگر اُسی لمحے خدا شیطان سے یہ کہہ کر گوئٹے کو اپنے پاس بلاتا ہے کہ یہ حسین لمحہ تم نے نہیں بلکہ میں نے اسے دیا تھا اور اس طرح اس کی روح پر میرا ہی حق رہا۔ شیطان! تم ہار گئے!!

مجھے لگتا ہے کہ گوئٹے کے تذکرے کو ہائنے کے اس اقتباس پر ختم کیا جائے کہ ''گوئٹے ایک آتشیں روح ہے جو ایک عقاب کی طرح اپنے پروں کو پھیلاتی ہوئی نامعلوم بلندیوں کی طرف دور دور تک اُڑتی ہی چلی جا رہی ہے، اُڑتی ہی چلی جا رہی ہے''۔

دیوان غالب

دیوان مرزا اسد اللہ خان غالبؔ (1796ء تا 1869ء) کو اُردو شاعری کی آبرو مانا جاتا ہے۔ اس زبان کے اولین شاعر محمد قلی قطب شاہ سے لے کر عہد جدید تک اُردو کی دنیائے سخن کی شاندار عمارت اس کے چار ستونوں پر مستحکم ہے، جن میں میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اگرچہ کئی اور سینکڑوں شعراء نے سالہا سال تک اُردو شاعری کی آبیاری

کی مگر روشنی کے ان چار میناروں کے نور سے سبھی کی آنکھیں خیرہ ہوتی رہیں۔ شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ ادبِ اُردو'' کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے غالب کو آسمانِ شاعری کا سب سے درخشندہ تارا، اُستاد کامل اور فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔

غالب نے اُس وقت آنکھ کھولی جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی۔ اُن ہی دنوں انگریزوں نے مغلوں کو شکست دے کر 1857ء کی بغاوت کے ساتھ ہی ملک پر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو بزورِ بازو اپنی نوآبادی بنانے کے لیے ہزاروں فرزندانِ وطن کا خون بہایا اور بڑی بے رحمی سے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔ غالب بھی اس شہر آشوب سے غافل نہ رہا اور اُس نے اس بیرونی جارحیت کے خلاف اپنے محسوسات کو زبان دی۔

غالب کو ایک بداعمال کہلائے جانے پر فخر تھا۔ اسے ایک بار جوا کھیلنے کی پاداش میں جیل جانا پڑا۔ مغلوں کے دربار میں اسے مردِ خواتین کہا جاتا ہے۔ ایک بار جب اس کے سامنے کسی نے خدا دوست شاعر شیخ صہبائی کے کلام کی تعریف کی تو غالب بولا، ''صہبائی کیسے شاعر ہوسکتا ہے؟ اس نے کبھی شراب کا حظ نہیں اُٹھایا۔ نہ ہی اُس نے جوا کھیلا، نہ ہی اُسے عاشقوں نے چپلوں سے پیٹا اور نہ ہی اُسے کبھی جیل جانا پڑا''

غالب کی وفات 15 فروری 1869ء کو دہلی میں ہوئی۔

1850ء میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے غالب کو دبیر الملک اور نجم الدولہ کے اعزازات سے نوازا۔ مغل دربار میں غالب کو شاہی مورخ کی جگہ بھی دی گئی۔

غالب نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اسے اگرچہ اپنی فارسی سخن گوئی پر ناز تھا مگر دنیائے ادب نے اُسے فقط ایک عظیم اُردو شاعر ہی کی حیثیت میں جانا اور پہچانا۔ وہ خود کہتا ہے۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہٴ اردو کہ بے رنگِ من است

غالب نے جس منفرد انداز میں اپنے گھر کی، دنیا بھر کی اور قلب ونظر کی باتوں کو خاص طور پر اپنی غزلیات کا موضوع بنایا ہے وہ اسی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔ وہ ماحول میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اس کے ردعمل میں روانی، تغزل، ترنم اور معنی آفرینی سے بھر پور اشعار تخلیق کرتا ہے جو دم زدن میں ہر ایک کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ اچھی شاعری کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ سننے والے قارئین اسے یاد رکھ سکیں۔ غالب کی شاعری کو یہ وصف بھر پور طریقے سے نصیب ہوا ہے کہ اس کے جتنے اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہیں اُتنی خوش بختی کسی اور اُردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔

غالب پر قلم اُٹھایا جائے تو لاتعداد کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور اس کے اشعار کا انتخاب بھی مشکل ہے۔ میں یہاں اپنی پسند کے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں جو اس تحریر کا اختتام بھی ہوگا۔ ان اشعار کو منتخب کرتے وقت یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ان میں غالب کی خیال آرائیوں کی کسی حد تک عکاسی کی جائے:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

تھا خواب میں خیال کو دل سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کرگئی
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سب کہاں کچھ لالۂ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
دگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس

''جنگ اور امن'' روس کے سب سے بڑے ادیب لیو ٹالسٹائی (1828 تا 1910ء) کے اُس افسانوی شاہکار کا نام ہے جسے دنیا کا طویل ترین ناول کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ٹالسٹائی نے خود اسے نہ تو ناول کہا ہے، نہ ہی نظم اور نہ اسے تاریخ کی صنف بتایا ہے بلکہ وہ اپنے دوسرے ناول ''اینا کرینینا'' کو اپنا صحیح ناول قرار دیتا ہے۔ اس دعویٰ کے حق میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ ''روس کا بہترین ادب بھی معیار کے مطلوبہ تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے''

''جنگ اور امن'' کی کہانی کا تانا بانا ٹالسٹائی نے روس پر فرانس کے حملے اور زار کی حکومت پر نپولین کے قبضے کے مابعد اثرات سے بُنا ہے۔ اس کی پوری کہانی اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ اسے ایک مضمون میں سمیٹنا مشکل ہے۔ ''جنگ اور امن'' ناول پہلے مکمل متن کے ساتھ 1869ء میں منظر عام پر آیا۔ امریکی جریدے نیوز ویک نے 2009ء میں اسے سو بہترین کتابوں کی فہرست میں اوّلین مقام پر رکھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹالسٹائی کی بیوی صوفیہ ٹالسٹائی نے اس کے سات مسودوں کو نقل کرنے کا صبر آزما کام کیا اور اس کے بعد ہی اسے قابلِ اشاعت قرار دیا گیا۔

ناول کا محل وقوع ٹالسٹائی سے کوئی ساٹھ سال قبل کا ہے جسے مصنف نے ''ہمارے آباؤ اجداد کا زمانہ'' کہا ہے۔ ٹالسٹائی نے اس تخلیق کے لیے دستاویزی مواد جمع کرنے کی غرض سے اُن لوگوں سے بات کی جو 1812ء میں روس پر فرانس کے حملے کے دوران بقید حیات تھے۔ ناول میں اگرچہ کئی فرضی اداکاروں کا ذکر ہے البتہ ان میں سے کم از کم ایک سو ساٹھ ایسے ہیں جو در حقیقت موجود تھے۔

''جنگ اور امن'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی غیر معمولی طوالت کے باوجود قارئین نے اسے ذوق و شوق سے پڑھا اور روس کے علاوہ جرمنی اور فرانس میں بھی اس کی مانگ روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ جنگ اور امن کے کشمیری ترجمہ کار مظفر عازم کے بقول: ''ٹالسٹائی کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخیل کی پرواز سے زیادہ زندگی کی حقیقت کے مشاہدے کو اپنے مواد کی شکل میں استعمال کرتا ہے، وہ زندگی کے نقوش کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اس کی اندرونی کیفیت کے خدوخال کو پرکھنے کا کام بھی بیک وقت کرتا ہے۔ اس سے اسے اپنی تخلیقات کے کرداروں کی نفسیاتی اور فکری سوچ کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی آگاہی کا

مظاہرہ ٹالسٹائی ''جنگ اور امن'' میں اس طرح کرتا ہے کہ جنگ کی تباہیوں کے باوجود ایک عام گھرانہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کسی قسم کا خلل داخل ہونے نہیں دیتا اور جہاں باہر سے آتش و آہن کا خونین بازار گرم تھا یہ گھرانہ اپنی مصروفیات میں مگن تھا اور اس طرح سے فلسفیانہ نظریے سے امن ہی بالآخر جنگ پر فتح حاصل کرتا ہے۔ جان گالزوردی کا کہنا بجا ہے کہ ''کسی بھی زمانے میں لکھے گئے ناولوں میں جنگ اور امن سب سے اوپر براجمان ہے''۔

اقبال کا پیام مشرق

''پیام مشرق'' اُردو کے سب سے متنوع اور ہمہ جہت شاعر علامہ اقبال (1877ء تا 1938ء) کی ساری تصانیف میں اہم ترین اور عظیم ترین مجموعہ کلام ہے۔

جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے جب عمر کے آخری ایام میں مغرب کی مادہ پرستی اور انسانی اقدار کے تنزل سے بیزار ہو چکا تھا اور وہ اپنے درماندہ وجود کو کسی مختلف ماحول میں منتقل کر کے سکون، اطمینان اور آسودگی قلب کے دن گزارنے کا خواہاں تھا، اسی ذہنی اضطراراور جذباتی ہیجان کے عالم میں اس نے یہ قطعہ لکھا:

North and West and South are breaking,

Thrones are bursting, kingdoms shaking;

Flee then, to the essential East,

Where on Patriarch's air you'll feast.

اُن ہی دنوں یعنی 1812ء میں جوزف وان ہیمر پرگسٹال نے حافظ شیرازی کے فارسی دیوان کا جرمن زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کے

مطالعے نے گوئٹے کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اسے اس مشرقی دیوان میں خیال اور فلسفے کی نئی دنیا جلوہ گر دکھائی دی۔ حافظ کا گہرا اثر قبول کرنے کے بعد اس نے کئی ایسی منظوم تخلیقات کو جنم دیا جن کے خالق کے بارے میں گمان ہوتا تھا کہ وہ مشرق ہی میں پیدا ہوا ہے۔ گوئٹے نے اسی اثر کے تحت ''دیوان مغربی'' لکھا جس میں کئی اسماء اور نظموں کے عنوانات بھی عربی یا فارسی زبانوں میں ہی درج ہیں۔ مثال کے طور پر ساقی، زلیخا، ہجرہ، پارسی نامہ، مغنی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ اور خلد نامہ اس میں شامل ہیں۔

موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے کہا جائے گا کہ یورپی ریاست جرمنی سے گوئٹے کے اس مختلف رنگ اور آہنگ کے دیوان کا مشرقی ادبیات کو ایک بیش بہا تحفہ اقبال کے سب سے اہم اور معتبر فارسی مجموعہ کلام پیامِ مشرق کی صورت میں حاصل ہوا، جس کی تصنیف کے محرکات کو اقبال نے خود بیان کرتے ہوئے گوئٹے کی مشرق نوازی کے پس منظر کو اس طرح واضح کیا ہے، ''پیام مشرق کا مدعا جو مغربی دیوان کے سو سال بعد لکھا گیا، زیادہ تر اُن اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جس کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال بیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں جو ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قوم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے جسے قرآن نے انّ

اللہَ یغیر مابقوم حتیٰ یغیر وامابانفسھمخ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش ہے''

اقبال ''پیام مشرق'' کے سرورق پر خود اسے ''درجوابِ شاعر المانوی گوئٹے'' کہتا ہے۔ جہاں اسرائیل کا مشہور شاعر ہائنے کہتا ہے کہ ''یہ مجموعہ عقیدت کا ایک گلدستہ ہے جسے مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے'' وہاں گوئٹے کے ایک سوانح نگار بیل سوشکی حافظ اور گوئٹے کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''بلبل شیراز کے نغموں میں گوئٹے کو اپنی تصویر نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کی روح نے حافظ کے پیکر میں رہتے ہوئے مشرقی سرزمین میں زندگی گزاردی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی اور بردباری، وہی جوش اور حرارت، وہی مشرب کی عظمت اور شان، وہی کشادہ دلی اور وہی پابندیوں اور رسوم ورواج سے آزادی۔ مختصری کہ اسے کئی لحاظ سے حافظ کا ہم رنگ پایا جاتا ہے۔ حافظ کی طرح گوئٹے بھی لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے۔ دونوں نے اپنے دور کے امیر وغریب کو متاثر کیا۔ دونوں نے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو بھی متاثر کیا اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں اپنی پرانی ترنم ریزی کو جاری رکھتے ہوئے طبیعت کے اطمینان اور سکون پر غالب رہے''

ایک جگہ اقبال گوئٹے کو اپنے محبوب شاعر غالب کا ہم پلہ دیکھ کر اس سے کہتا ہے:

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

گوئٹے کی تعریف و تحسین میں اقبال کا ایک اور شعر:

صبا بہ گلشن ویمر سلامِ ما برسان
کہ چشم نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

اسی طرح اقبال نے گوئٹے کی عظمت کو مولانا رومی کی زبان سے بھی تسلیم کیا ہے، جب گوئٹے جنت میں مولانا رومی کو حکیم فاؤسٹ کا قصہ سناتا ہے تو رومی اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدہ ئی
در صدف تعمیر گوہر دیدہ ئی



تین اہم کشمیری شاعر

ایک ناقدانہ نظر، مختصر مختصر

اس مختصر مضمون کا مدعا عہد حاضر کے تین معتبر شاعروں، دینا ناتھ نادم، رحمان راہی اور امین کامل کے کلام میں پائی گئی اُن چند خامیوں کی نشان دہی کرنا ہے جن کی طرف آج تک کسی بھی نقاد نے توجہ نہیں دی یا مصلحتاً ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اسے عام اصطلاح میں ادبی بے ایمانی ہی کہا جاسکتا ہے۔

ہماری نظروں میں نادم، راہی اور کامل آج کی جدید کشمیری ادبی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہمارا ادب گذشتہ نصف صدی میں کوئی دوسرا نادم، راہی یا کامل پیدا نہیں کرسکا ہے۔ میں نے ان پر ایک مختلف انداز سے گفتگو کی ہے۔

دینا ناتھ نادم

دینا ناتھ نادم کشمیری شاعری کا انقلابی شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں کڑکتی بجلیوں کی گھن گرج اور سیلابوں کی پُرشور روانی ہے۔ انیسوی صدی کے وسط میں جب مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں سے کوریا میں ایک اور جنگ کے بادل منڈلانے لگے تو نادم نے ایک معرکتہ الآرا نظم لکھی جس کا عنوان تھا "مجھے آشا ہے کل کی"۔ ایک ابدی تاثر کی حامل یہ نظم آج بھی سنی اور سنائی جاتی ہے۔

جسے اپنے شوہر سے دور ایک عورت کی زبانی بیان کیا گیا ہے:

مجھے کل کی آشا ہے
کل دُنیا جھوم اٹھے گی
کہتے ہیں کہ جنگ چھڑ جائے گی
کاش کل ایسا نہ ہو

میرے بچوں کا باپ آنے والا ہے
میں رات گئے تک اُس کا انتظار کروں گی
وہ آئے گا تو میری آنکھیں
کاجل کے بغیر ہی سرمئی ہو جائیں گی
میری چھاتیوں سے دودھ ابل پڑے گا
اور ہم ایک دہائی کے بعد دسہرہ منائیں گے
اُس کی گھٹڑی میں گل اور گلزار ہوں گے
میرے لیے چھینٹ کے کپڑے
بیٹی جانکی کے لیے کانوں کی بالیاں
اور حبیب کے ختنے کے لیے ڈھیر سارے پیسے!

مجھے کل کی آشا ہے
کل جنگ چھڑ نہ جائے
کل میرے بچوں کا باپ آنے والا ہے

اس نظم میں ایک بہت بڑی واقعاتی غلطی شاعر سے سرزد ہوئی ہے۔ ایک طرف ہجر کی ماری بیوی شوہر کے گھر لوٹنے پر دسہرہ منانے کی بات کرتی ہے تو

ساتھ ہی حبیب کے ختنے کے لیے ڈھیر سارے پیسے بھی اس کی تمنا میں شامل ہیں۔ دسہرہ تو ہندو لوگ مناتے ہیں اور ختنہ ایک مسلم خاندان میں ہی ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے حیران کن بھول چوک ہوئی ہے۔ اگر شاعر دسہرہ والے بند کو ہندو گھرانے سے وابستہ کرتا اور ختنے سے متعلق مصرعے مسلمان عورت کی زبانی ادا ہوتے تو اس واقعاتی تفاوت کو جواز حاصل ہوتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے دوش بہ دوش دینا ناتھ نادم کی آواز اس قدر زور وشور سے ابھری کہ اس کی گھن گرج میں ان کے ہم عصروں کی آوازیں گویا دب کر رہ گیئں۔ نادم نے اپنی شاعری کو ایک منفرد آہنگ اور اسلوب سے آراستہ کیا جس میں اکثر و بیشتر سخن گوئی کی نرم و نازک نغمہ سرائی سے زیادہ نعرہ بازی کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ اس قبیل کی نادم کی منظومات میں معنی آفرینی اور شعری نفاستِ بیان سے زیادہ شاعر کے وقتی جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کا رنگ غالب رہا۔ اسی طرح نادم نے اپنی نغمگی کو صوتیت کی خصائص سے آراستہ کرنے کی غرض سے فنی بے راہ روی کا بھی مظاہرہ کیا ہے کیونکہ وہ شاعری کی مطلوبہ لسانی اور فنی نزاکتوں میں اپنے آپ کو پابند نہیں کرتا تھا۔ ایک نظم میں شاعر نے چاند کو اس خیال کے مدنظر روٹی سے تشبیہہ دی ہے کہ مزدوروں اور ناداروں کا یہ شاعر چاند کی شکل میں ایک بھوکے شخص کو وہ روٹی دکھاتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اسے جی توڑ محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہاں تک تو یہ تمثیلی مطالعہ برمحل ہے لیکن اسی نظم کے دوسرے ہی مصرعے میں چاند کو پامپور کا کھردرا اور میلا کچیلا پٹو کہا گیا ہے جو محض ایک مصنوعی عمل ہے۔ شاعر نے یہاں صرف ''ژوٹ'' اور ''پوٹ'' کا قافیہ ملانے کی ایک بے ربط سعی کی ہے جسے فن سخن گوئی میں ایک قبح ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود دینا ناتھ نادم کو کشمیری کی جدید شاعری کی شان سخن کہا جا سکتا

ہے جس کا بدل اور کوئی نہیں کیونکہ وہ واقعی ہماری ہم عصر شعری دنیا کا ایک Trend Setter ہے۔

رحمان راہی

رحمان راہی کے بارے میں یہ حق بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نے کشمیری شاعری کی نغمگی خاص طور پر غزل کو ایک نئے آہنگ، تغزل، فن کارانہ مہارت اور دریاؤں کی روانی سے آگاہ کیا اور یہ خصوصیات راہی کی شاعری کو بہار کے تبسم ریز پھولوں کی رنگت اور مہک سے سرشار کرتی رہیں۔

میری رائے میں راہی نے گذشتہ تیس چالیس سال میں جو شاعری کی ہے اس کے مقابلے میں ان کی وہ نغمہ سنجی زیادہ پراثر اور شیرین ہے جو وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے اُس تلاطم خیز دور میں تخلیق کرتا رہا جو ہم عصر کشمیری شاعری کے لیے نشاۃ الثانیہ کا عہد ثابت ہوا۔ میں نے آج تک راہی کی اس غزل کی ہم پلہ اس کی اور کوئی شعری تخلیق نہیں سنی ہے کہ:

سہٕ گلاب روے ڈیوٹھم بیہ از گلاب چھاوان
میہ چھ وونی مثالنی منز رمبہ ونی خیال راوان
لوہ چھا پیوان گلاس کنہ لہر وژھ ہواوس
نتہ ژاو باغ کس تام مدہ ماتی پوری تراوان
متہ ونتہ راہیس کینہ سہٕ چھہ از تہ پرانی پاٹھین
گٹہ منز پرگاش ژھاران ژھٹہ منز شکاری تراوان

گذشتہ بیس یا تیس سال کے دوران راہی نے کشمیر کے حالات و واقعات پر بھی وقتاً فوقتاً اظہار خیال کیا ہے لیکن کئی موقعوں پر اس نوع کے کلام پر ایسے ابہام کا گمان ہوتا ہے جو شعر کی معنوی افادیت کو زک پہنچاتا ہے۔ مثال کے

ساتھ ہی حبیب کے ختنے کے لیے ڈھیر سارے پیسے بھی اس کی تمنا میں شامل ہیں۔ دسہرہ تو ہندو لوگ مناتے ہیں اور ختنہ ایک مسلم خاندان میں ہی ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے حیران کن بھول چوک ہوئی ہے۔ اگر شاعر دسہرہ والے بند کو ہندو گھرانے سے وابستہ کرتا اور ختنے سے متعلق مصرعے مسلمان عورت کی زبانی ادا ہوتے تو اس واقعاتی تفاوت کو جواز حاصل ہوتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے دوش بہ دوش دینا ناتھ نادم کی آواز اس قدر زور وشور سے ابھری کہ اس کی گھن گرج میں ان کے ہم عصروں کی آوازیں گویا دب کر رہ گیئں۔ نادم نے اپنی شاعری کو ایک منفرد آہنگ اور اسلوب سے آراستہ کیا جس میں اکثر و بیشتر سخن گوئی کی نرم و نازک نغمہ سرائی سے زیادہ نعرہ بازی کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ اس قبیل کی نادم کی منظومات میں معنی آفرینی اور شعری نفاستِ بیان سے زیادہ شاعر کے وقتی جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کا رنگ غالب رہا۔ اسی طرح نادم نے اپنی نغمگی کو صوتیت کی خصائص سے آراستہ کرنے کی غرض سے فنی بے راہ روی کا بھی مظاہرہ کیا ہے کیونکہ وہ شاعری کی مطلوبہ لسانی اور فنی نزاکتوں میں اپنے آپ کو پابند نہیں کرتا تھا۔ ایک نظم میں شاعر نے چاند کو اس خیال کے مدنظر روٹی سے تشبیہہ دی ہے کہ مزدوروں اور ناداروں کا یہ شاعر چاند کی شکل میں ایک بھوکے شخص کو وہ روٹی دکھاتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اسے جی توڑ محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہاں تک تو یہ تمثیلی مطالعہ برمحل ہے لیکن اسی نظم کے دوسرے ہی مصرعے میں چاند کو پامپور کا کھردرا اور میلا کچیلا پٹو کہا گیا ہے جو محض ایک مصنوعی عمل ہے۔ شاعر نے یہاں صرف ''ژوٹ'' اور ''پوٹ'' کا قافیہ ملانے کی ایک بے ربط سعی کی ہے جسے فن سخن گوئی میں ایک قبح ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود دینا ناتھ نادم کو کشمیر کی جدید شاعری کی شان سخن کہا جا سکتا

ہے جس کا بدل اور کوئی نہیں کیونکہ وہ واقعی ہماری ہم عصر شعری دنیا کا ایک Trend Setter ہے۔

رحمان راہی

رحمان راہی کے بارے میں یہ حق بات کہی جاسکتی ہے کہ اس نے کشمیری شاعری کی نغمگی خاص طور پر غزل کو ایک نئے آہنگ، تغزل، فن کارانہ مہارت اور دریاؤں کی روانی سے آگاہ کیا اور یہ خصوصیات راہی کی شاعری کو بہار کے تبسم ریز پھولوں کی رنگت اور مہک سے سرشار کرتی رہیں۔

میری رائے میں راہی نے گذشتہ تیس چالیس سال میں جو شاعری کی ہے اس کے مقابلے میں ان کی وہ نغمہ سنجی زیادہ پر اثر اور شیرین ہے جو وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے اُس تلاطم خیز دور میں تخلیق کرتا رہا جو ہم عصر کشمیری شاعری کے لیے نشاۃ الثانیہ کا عہد ثابت ہوا۔ میں نے آج تک راہی کی اس غزل کی ہم پلہ اس کی اور کوئی شعری تخلیق نہیں سنی ہے کہ:

سہٕ گلاب روے ڈیوٗٹھم بیہ از گلاب چھاوان
میہ چھ وونی مثالنی منز رمبہ ونی خیال راوان
لوہ چھا پیوان گلاس کنہ لہر وژھ ہواوس
نتہ ژاو باغ کس تام مدہ ماتی پوری تراوان
متہ ونتہ راہیس کینہ سہٕ چھہ از تہ پرانی پاٹھین
گٹہ منز پرگاش ژھاران ژھٹہ منز شکاری تراوان

گذشتہ بیس یا تیس سال کے دوران راہی نے کشمیر کے حالات وواقعات پر بھی وقتاً فوقتاً اظہار خیال کیا ہے لیکن کئی موقعوں پر اس نوع کے کلام پر ایسے ابہام کا گمان ہوتا ہے جو شعر کی معنوی افادیت کو زک پہنچاتا ہے۔ مثال کے

طور پر جب شاعر سرِ راہ ایک لاش دیکھتا ہے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا ایک اخلاقی فرض بن جاتا ہے کہ اس انسان کو کس نے قتل کیا۔ اگر ہم اس کی طرف نشان دہی نہیں کر سکتے تو اس المیے پر خامہ فرسائی کرنے سے قلم کو جیب میں رکھنا ہی ایمان داری کا مظاہرہ ہوگا۔ کیونکہ اس طرح یہ شعر پڑھنے والا کسی بھی بے گناہ کو ہدفِ ملامت بنانے کی فاش غلطی کر سکتا ہے۔

راہی صاحب ابتدا میں میرے استاد رہے ہیں اور یہ حق آسانی سے ادا نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ہرگز یہ معنی بھی نہیں کہ استاد کی تخلیقات میں خامیاں ہوں اور ان فن کارانہ خامیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راہی کے پاس کشمیری الفاظ، محاورات، تراکیب اور تلامیح کا خزانہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اب ان کی شاعری میں غیر مقبول اور غیر مانوس الفاظ بار بار نظر آتے ہیں جن میں شتاب، ارتکاب، ، قدغن، شہریار، صریر، قلب، سرگرفتہ، عقاب، بار الم، بوستان، بیابان، ساحل، افلاک، العطش وغیرہ شامل ہیں اگرچہ کشمیری میں ان سبھی لفظوں کے مناسب متبادل موجود ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ شعر ہے:

یمی ژُون تہ اکھتابہ تہ کوژھ روٹنہ سہ مسکین
لیس فاقہ پھری شونگ سہ شہر یار محمد

اس شعر کا مصرعہ اول ایک تاریخی واقعے پر مبنی ہے جسے شاعر نے کمال فن سے انگوٹھی میں نگینے کی طرح سجایا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں لفظ "شہریار" کشمیری مزاج سے کوئی میل نہیں کھاتا۔ راہی کی شاعری میں بحور و اوزان کی کسی خامی کا امکان نہیں لیکن اس شعر کو بے حد معنی آفرین بنانے کی خاطر اگر شہریار کی بجائے بختاوار کا استعمال ہو تو شعر کی معنوی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ شہریار کا تصور مقامی طور پر الف لیلی کے مرکزی کردار کی صورت میں اور وہ بھی اس شخص کے سامنے آتا ہے جس نے الف لیلی پڑھی ہو۔ بختاوار کے استعمال سے وزن

میں ایک معمولی سی خامی پیدا ہو جاتی ہے یعنی اس کا ''الف'' گر جاتا ہے لیکن یہ معمولی نقص اگر ایک طرف قابل گردن زدنی نہیں ہے وہاں دوسری جانب اس متبادل لفظ سے یہ شعر معنوی لحاظ سے آسمان کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

ہمارے یہاں لل دید سے شیخ العالم اور پھر حبہ خاتون سے لے کر صمد میر تک جتنے بھی سینکڑوں شاعر گذرے ہیں ان سبھی نے ایک مقامی بحر کا استعمال کیا جس میں لاتعداد مقامات پر ایک مصرعے کی بحر دوسرے سے قطعاً میل نہیں کھاتی ہے لیکن آج تک ان کی اس فنی کوتاہی کا کسی نے ذکر تک نہیں کیا ہے کیونکہ ان کی ان معمولی خامیوں کو ان کی شاعری کے بھرپور تاثر اور معنی آفرینی نے مکمل طور پر پسِ پردہ ڈال دیا ہے۔

امین کامل

امین کامل کو کشمیری ادب کا ہمہ جہت اور ہمہ صفت قلم کار کہا جاسکتا ہے۔ وہ اس زبان کا واحد تخلیق کار ہے جس نے اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں کئی اصنافِ فن پر قلم اٹھاتے وقت اپنی انفرادی حیثیت کا لوہا منوایا، کامل نے غزل، نظم، مثنوی، نعت، منقبت، مرثی، رباعی، افسانہ، ناول، ڈراما، تحقیق، تنقید اور کئی اور فنی اصناف کو اپنے ورطہ تحریر میں لاکر مقامی ادبی دنیا میں ایک خاص مقام پالیا۔

کامل نے ترقی پسند ادبی تحریک کے ایک روح رواں کی حیثیت میں پہلے پہلے اردو میں تک بندی کے معیار کی شاعری کی اور بعد میں وہ اپنی مادری زبان کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد بھی اس کی یہ کمزوری رہی کہ وہ اکثر و بیشتر موضوعات اور اسلوب حتی کہ بحور و اوزان اور ردیف و قوافی میں بھی راہی کی تقلید کرتا رہا جس کی وجہ سے اس کی اپنی شناخت کو کچھ عرصے تک ایک گرہن سا لگ گیا۔ کامل کے بہی خواہوں نے جب اسے یہ تقلید بے جا ترک کرنے کا احساس

دلایا تو اس نے ایک ترنگ میں آکر قلم کا رخ بدلا اور دیکھتے دیکھتے کامل ایک الگ رنگ وروپ کی بامعنی اوراثر دارشاعری کا سخن وربن کے ابھرا۔راہی کے انداز کلام کی صدائے بازگشت کامل کے یہاں پھر بھی کچھ عرصے تک کبھی کبھی سنائی دی۔راہی کہتا ہے:

نہ دراو نژنہ ہوس کانہہ نہ ژول غبار وولو
ژیہ روس یہُس تہ ووں نیریا تیتھے بہار وولو

اور کامل بھی کہتا ہے:

حسن نواز یہ موسم تہ گوو بیکار ہیو ہو
یہُس تہ دراو دیانی ژیہ روس بہار ہیو ہو

لیکن اسے نقل کا نام دینے کے بدلے محض ایک اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔ راہی کے مقابلے میں کامل کے اسلوب میں کسی حد تک کھردراپن پایا جاتا ہے مگر معنوی لحاظ سے وہ برتر ہے۔نادم اورراہی کے برعکس کامل کوتاریخ پرگہری نظر تھی جس کا ثبوت اس کے کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس سے کامل کی شاعری متنوع بنتی ہے اوراس کے ذریعے معنی کے نئے نئے دریچے وا ہوتے ہیں۔کامل ایک لاابال سخن گوتھا جس نے اپنے بارے میں خود ہی کہا ہے کہ:

کامل چھ تیتھُ مست قلندر زہ ونے کیاہ
سودرس اندر ادر یوس نہ دامانہ نگارو

راہی کی شاعری میں اگرایک طرف شبنمی حلاوت اورریشمی سرسراہٹ کی تازگی محسوس ہوتی ہے وہاں کامل کے کلام میں معنوی کاری گری کا ایک ایسا معجزہ کارفرما ہے جو اپنے جادوئی اثر سے پڑھنے یا سننے والے کے قلب وذہن کو جھنجھوڑ کے چھوڑتا ہے۔

اسی طرح نادم اور راہی کے مقابلے میں کامل کے لیے تحقیق ایک

جنوں تھا۔ اس سلسلے میں جب اُس نے ارنہ مال کے بارے میں یہ کہا کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک ذہنی اختراع کا نام ہے تو اس انکشاف نے مقامی پنڈت فرقے میں ہل چل سی پیدا کی ۔ حالانکہ بقول کامل اس سے کسی کی دل آزاری اس کا ہرگز مقصد نہیں تھا بلکہ وہ ایک تاریخی حقیقت کو بیان کر کے کشمیر کی ادبی تاریخ کے اوراق کی درستی چاہتا تھا۔ حق بات یہ ہے کہ ارنہ مال کے وجود کو ماننے والے بھی کوئی دستاویزی ثبوت پیش کر کے کامل کے انکشاف کو رد نہیں کر سکے۔

اس صحبت میں ان تینوں کشمیری شاعروں کی مختصر ترین بات کرنے کا یہ بھی مدعا تھا کہ ہمارے آج کے مقامی شاعران کی شاعری کے محاسن اور قبوح ذہن نشین کر کے اپنے فن کو صحیح تنقید کے تناظر میں نکھاریں اور اس طرح وہ بھی دعوی کر سکیں کہ انھوں نے واقعی کشمیری شاعری کے سات سو سالہ سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

میرے خیال میں ان تینوں معتبر کشمیری شاعروں کے کلام کو نہایت گیرائی اور گیرائی سے ناقدانہ کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا ہے لیکن اب ہونا چاہئے۔



کشمیری زبان کی بائبل

133 سال پرانا نسخہ نایاب

یہ 1959ء کی بات ہے جب میں نے کسی دوست سے سنا کہ کشمیری زبان میں ترجمہ شدہ بائبل ایک ضخیم کتاب کی شکل میں سری نگر کے آل سینٹس چرچ کے ایک پادری کے پاس محفوظ ہے۔ مجھے مختلف موضوعات پر کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک چرایا تھا۔ میرے کان میں جونہی کشمیری بائبل کی بھنک پڑھ گئی میں اس نایاب تخلیق کے حصول کی جدو جہد میں مصروف ہوگیا۔ یہ پادری شہر کے آبی گذر علاقے میں کرایے کے مکان میں رہائش پذیر تھا۔

جب میں اُس سے اس مکان کے برآمدے میں ملا اور بائبل کا نسخہ دکھانے اور وہ مجھے عنائت کرنے کی بات کی تو اس نے کسی حد تک غصے کی حالت میں کہا کہ میرا بائبل سے کیا لینا دینا جبکہ میں ایک مسلم ہوں اور صرف قران کو ہی مانتا ہوں۔

''میں خاص کر نایاب کتب جمع کرنے کا شوقین ہوں اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ کشمیری زبان میں بائبل کا واحد نسخہ ہے جو آپ کے پاس موجود ہے۔''

''آپ نے صحیح سنا ہے کہ میں نے بھی ایسے کسی اور نسخے کے بارے میں نہیں سنا ہے لیکن میں یہ آپ کو نہیں دوں گا کیونکہ یہ ہمارا آسمانی صحیفہ ہے اور رہنمائے زندگی بھی''۔

اس نے ناک بھوں چڑھائی، دروازہ زور سے بند کیا اور کرائے کے اس مکان کے کسی کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔

اب کی بار میں نے ایک نیا شوشہ چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ میں پادری صاحب سے دوبارہ ملا تو میں نے اس کے سامنے ایک نئی چال چلنے کی ناکام کوشش کی، وہ یہ کہ میں نے اس سے کہا کہ میں دراصل عیسائی بننا چاہتا ہوں اور یہ مقدس صحیفہ اپنی مادری زبان میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ پادری نے ایک تیکھی نظر مجھ پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''برخوردار! تمہارا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا کیونکہ تم عیسائی نہ بننا چاہتے ہو اور نہ بنو گے''۔ میں پانی پانی ہو کر رہ گیا۔

بالآخر تقریباً چھ مہینوں کی دشت نوردی کے بعد میری محنت رنگ لائی اور سخت جان پادری یہ نادر تحفہ بادل ناخواستہ مجھے دینے پر آمادہ ہوا۔ ساتھ ہی اس نے کہا: ''تم مجھے ایک روپیہ دو اور بائبل لیجاؤ''۔ میں نے ایک روپیہ تو ادا کیا لیکن میں سوچتا رہا کہ اس صحیفے کی قیمت لاکھوں کروڑوں میں لگائی جائے پھر بھی وہ کم ہے اور یہ مخبوط الحواس پادری مجھ سے صرف ایک روپیہ کا طلب گار رہا؟ وہ اس تذبذب کو میری بچگانہ حرکتوں سے پہچان گیا۔ ''دیکھو برخوردار! مجھے ایک روپیہ کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہم اپنی آسمانی وحی کی قیمت لگا سکتے ہیں۔ لیکن یہ تمہارے لیے یہ ایک سبق ہے کہ جب بھی تم کسی سے کوئی چیز لو تو اسے مفت میں ہرگز قبول نہ کرو!''۔ یہ سبق مجھے آج تک یاد ہے۔

ایک روپیہ پادری صاحب (اب وہ میرے لیے صاحب بن چکے تھے) کو دے کر اور پے در پے شکریہ ادا کرتے ہوئے میں ان سے خوشی خوشی رخصت ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا قارون کا خزانہ میرے ہاتھ لگا ہو۔ میں سیدھے مہاراج گنج میں واقع مرحوم نور محمد تاجر کتب کی دکان پر پہنچا اور نور صاحب کو یہ خوشخبری سنائی۔ وہ خود شاداں ہوئے اور کہنے لگے: ''خیال

صاحب! یہ ایک نعمت متبرکہ ہے جو آپ کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ایک مقدس صحیفے اور ایک بیش بہا مسودے کی حیثیت میں اس کی قدر کریں۔نور محمد صاحب نے کتاب کو دیکھ کر پھر ایک بار خوشی کا ظہار کیا اور مشورہ دیا کہ اس کی فوری طور پر چرمی جلد بندی ہونی چاہئے تا کہ یہ سالہا سال تک محفوظ رہ سکے۔وہ اپنا کام کاج چھوڑ کر مجھے نزدیکی ضراب خانہ محلّہ میں لے گئے جہاں ایک بزرگ جلد ساز کا کارخانہ تھا۔اس نے کتاب کی چرمی جلد بندی کے لیے پانچ روپے طلب کیے۔ اس طرح سے یہ نادر نسخہ محفوظ ہو گیا۔

''ماڈرن انڈین لینگویجز'' نام کی تصنیف میں پروفیسر جیالال کول کا کہنا ہے کہ بائبل کا یہ کشمیری ترجمہ پادری ٹی،آر،واڈے نے کیا ہے۔

1884ء میں یعنی آج سے 133 سال قبل چھپنے والی یہ دستاویزی کتاب بڑے سائز کے 874 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی طباعت آج کی کمپوٹر چھپائی سے بہتر دکھائی دیتی ہے۔کتاب کو انتہائی حسنِ اہتمام کے ساتھ پنجاب بائبل سوسائٹی کے زیر اہتمام لدھیانہ کے مشنری چھاپ خانے میں طبع کیا گیا ہے۔

یہ بائبل اگر چہ کشمیری زبان کے مروجہ نستعلیق رسم الخط ہی میں طبع ہوئی ہے لیکن اس میں آج کے مقابلے میں کئی تبدیلیاں نظر آتی ہی اور جس طرح متعدد حروف لکھے گئے ہیں آج ان کی تحریری شکل کچھ اور ہے۔ مثلاً حرف ''ژ'' کو موجودہ شکل میں نہیں بلکہ حرف ''ح'' کے بیچ میں چار نقطے ڈال کر تحریر کیا گیا ہے۔اسی طرح املا کی شکل وصورت موجودہ صورت سے بھی بہت حد تک مختلف ہے۔

آج سے سوڈیڑھ سو سال قبل جو عیسائی مشنری کشمیر آئے ان کے مقاصد میں کشمیر میں انسانی صحت کی بہتری اور تعلیم کی تشہیر کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام بھی اولین حیثیت کے حامل تھے۔چنانچہ عیسائیت کو دور دور تک پھیلانے

کی خاطر پہلے پہل ''مرقسہ سنز انجیل'' جیسے کتابچوں کو شائع کر کے عام کیا اور بعد میں بائبل جیسے مربوط ومبسوط صحیفے کی اشاعت کا منصوبہ انجام دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان سبھی نے خود پہلے کشمیری زبان سیکھ کر اس پر مکمل عبور حاصل کیا اور بعد میں عبرانی میں تحریر شدہ بائبل کو کشمیری میں منتقل کیا۔ بائبل سوسایٹی کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ عہد نامۂ قدیم یا عہد نامۂ جدید کا کسی زبان میں ترجمہ وہی کرسکتا ہے جو عبرانی ز بان سے پوری طرح واقف ہو۔ اگرچہ کشمیر میں اس وضع کردہ اصول سے روگردانی بھی کی گئی اور چند ایسے لوگوں نے اسی صحیفے کا بعد میں ایک غلط سلط ترجمہ بھی کیا جو پیسوں کے لالچ میں یہ گناہ کر بیٹھے۔

میری تحویل میں بائبل کا یہ نسخہ 27 ابواب پر مشتمل ہے جن میں عام طور پر وہی اخلاقی تعلیمات درج ہیں جو ہمیں قران پاک میں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر پند ونصائح کے یہ کلمات تقریبا ہر الہامی کتاب میں موجود ہیں: ''اے مالکو! نوکروں کے ساتھ یہ جان کر عدل اور انصاف کرو کہ اُن کا بھی ایک مالک ہے۔ وقت کو غنیمت جان کر دوسروں سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔ مناسب یہی ہے کہ تمہارا کلام فضیلت سے بھرا ہو اور یہ ضروری نہیں کہ تم ہر بات کا جواب دو۔ اپنے ہمسائے کے خلاف گواہی مت دو''۔

میں نے اس مقدس صحیفے کو عقیدت اور نہایت تعظیم وتکریم کے ساتھ اپنے پاس محفوظ کر کے رکھا ہے۔



برزہ ہامہ

کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا نشان دہ

تاریخ کے دستاویزی شواہد اور آثار قدیمہ کے باقیات سے یہ بات مسلمہ طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ سرزمین کشمیر کی تاریخ کم از کم پانچ ہزار سال پرانی ہے۔اس کے واضح ثبوت راجدھانی سری نگر میں جھیل ڈل کے مغربی کنارے پر کشمیر کی تاریخ کے کھنڈرات سے ملے ہیں۔اس جگہ کو برزہ ہامہ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں بھوج پتر کے زمانے کی جگہ۔ برزہ کشمیری میں بھوج پتر کو اور ہامہ یا ہوم رہنے کی جگہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کشمیر کے مضافات میں کئی دیہات مثلاً دودر ہامہ، بیہامہ، ہمہ ہامہ اور بالہ ہامہ ایسے ہی ناموں سے جانے جاتے ہیں۔

برزہ ہامہ کی قدامت کے پیش نظر کشمیری زبان کو بھی ہمالیائی خطے کی سب سے پرانی یعنی پانچ ہزار سال کی عمر کی زبان کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ کشمیر کے قدیم ترین رہائش کنندگان کی زبان بھی ایک مقامی بولی ہی ہوگی جسے بہرصورت کشمیری ہی کا نام دیا جاسکتا ہے خواہ انھوں نے اسے کسی بھی لب ولہجے رسم الخط، املا یا تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہو۔

برزہ ہامہ سری نگر شہر کے شمال مغرب میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر مشہور عالم ڈل جھیل کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

یہ 1936ء کی بات ہے کہ ڈی ٹیرانا می ایک مہم جو نے ییل کیمبرج مہم کی رہنمائی کرتے ہوئے تجربے کے طور پر برزہامہ کے مقام پر کھدائی کا آغاز کیا۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر تھامس تھامسن بھی تھا۔ انھیں بے حد حیرت ہوئی جب وہاں انھیں کئی نایاب آثار ملے جن سے یہ امر خود بخود پایۂ ثبوت کو پہنچا کہ یہ باقیات جدید عہدِ سنگ یعنی new stone age سے تعلق رکھتے تھے جس کا عرصہ تاریخی اعتبار سے 3000 قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔

ان آثار سے پتہ چلا کہ برزہامہ کے باشندے زمین میں کھودے گئے گڑھوں میں رہتے تھے۔ ان گڑھوں میں پتھر کے اوزار پائے جانے کے علاوہ دیکھا گیا کہ انھوں نے گڑھوں کی دیواروں کی کیچڑ سے لپائی کی تھی تاکہ وہ مضبوط ہوں اور ان میں پائیداری بھی آسکے۔ ان زمین دوز گڑھوں میں انھوں نے اس لیے رہائش اختیار کی تھی تاکہ وہ موسموں کے غیر موافق عمل سے محفوظ رہ سکیں جن میں خاص کر کشمیر کا کڑاکے کا جاڑا قابل ذکر ہے۔ برزہامہ ہی کو اپنا مسکن بنانے کے پس پردہ برزہامیوں کا یہ بھی مقصد تھا کہ نزدیکی جھیل میں مچھلیاں بکثرت دستیاب تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں جھیل کا صاف و شفاف پانی اور عقب میں مہادیوکوہ کے جنگلات میں شکار کے لیے جانور بھی مہیا ہوتے تھے۔ اس جگہ پہلے پہل 2357 قبل مسیح کے آس پاس لوگ آباد ہوئے۔

مورخ ایس۔ ایل۔ شالی کے بقول: ”قدیم کشمیریوں کے رہن سہن، ثقافتی معمولات اور دیگر سرگرمیوں کے ماسوا یہ آثار ان کی اُن صلاحیتوں اور فن کاری کا مظہر ہیں جن سے کام لے کر وہ ہڈیوں سے اوزار بناتے اور ان سے قدرت کی طاقتوں کو زیر کرتے تھے۔ اسی طرح وہ کھانے اور چربی کے حصول کی خاطر جنگلی حیوانوں کا شکار کرتے جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو زمہریر سے بچاتے تھے، حیوانی چربی سے اندھیرے میں روشنی کرتے تھے اور اسی سے گرمی کا

سامان بھی بہم پہنچاتے تھے"۔(1)

یہ گول گڑھے، جو زمین کی سطح پر تنگ اور نیچے کشادہ تھے، آخر کار برزہامہ کے لوگوں کی قبریں بھی بن گئے۔ ان گڑھوں میں وہاں کے باشندوں کی میتوں کے پنجر پائے گئے جن کے ساتھ حیران کن طور پر حیوانوں کے پنجر بھی ملے جن میں بھیڑیے، سینگوں والے ہرن، سراگائے اور کتے شامل تھے۔ مرے ہوئے انسانوں کے ساتھ بھیڑ اور بکریاں بھی دیکھی گئیں جنھیں غالباً کوئی مذہبی رسم ادا کرنے کی خاطر قربانی کے طور پر ذبح کیا گیا تھا۔ کھدائی کے دوران برزہامیوں کے جو سات پنجر برآمد ہوئے ان کا قد ناپنے پر تین فٹ نو انچ سے لے کر دس فٹ سات انچ تک کا نکلا گویا وہ قوی الجبثہ انسان تھے۔ ایک انسانی کھوپڑی میں کم از کم چھ سوراخ کیے گئے تھے۔ ایک اور مہم جو، بیا لچن کا کہنا ہے: "ایسا کسی جراحی کے مقصد سے کیا ہوگا اور یہ عمل اس شخص کی موت سے پہلے کا لگتا ہے"۔(2)

دیگر کئی ماہرین کا خیال ہے کہ متوفی شخص کی کھوپڑی میں یہ سوراخ اُس کی موت کے فوراً بعد کیے جاتے تھے۔ مرے ہوئے شخص کا بھیجا اس کی کھوپڑی سے باہر نکال کر اسے جادوئی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر انیک آر۔ سنکھاین اور جارج ویبر نے برمے سے سوراخ کرنے کے اس عمل کی مزید تفصیلات بہم کرتے ہوئے کہا ہے: ایسا کوئی اوزار جس سے یہ کام کیا گیا ہو، برزہامہ کی جگہ پر نہیں ملا البتہ ہڈیوں اور چقماق کے ٹکڑے دیکھے گئے بگر جنوب میں سندھ تہذیب سے متعلق پیتل کے اوزار اس جگہ نہیں پائے گئے۔ کھوپڑیوں میں چھید کرنے والے مختلف اقسام کے اوزار موجود تھے۔ یہ ایک دلچسپ مگر شک آور بات ہے کہ سندھ تہذیب کے ایک جراح نے اپنے

پیتل کے اوزاروں سے یہ کام انجام دیا ہوگا۔ (3)

ڈی ٹیرا اور اس کے ساتھیوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ کھدائی کے دوران مٹی کے برتنوں کی خاصی تعداد اور چمکائے گئے کالے برتن اور سفال کے ٹکڑے بھی برآمد ہوئے جن پر ایسے ڈیزائن بنائے گئے تھے جن کا دور 3000 سے 1800 قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔

ان اشیاء میں پتھر کی ایک دیدہ زیب سل بھی برآمد ہوئی جس نے ہر ایک کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ اس سل پر شکار کا منظر پیش کیا گیا ہے جس میں شکاری دائیں ہاتھ میں نیزہ لے کر ہرن کا شکار کر رہا ہے اور دوسرا شکاری اسے ایک برچھی سے مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سل پر ایک کتے اور سورج کی تصویریں بھی کندہ ہیں۔ کئی اور برآمدات پر بھی سورج کی شبیہہ کندہ ہونے سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ قدیم برزہامی لوگ سورج کی پرستش کرتے ہوں گے۔

کھدائی کے نتیجے میں 1961 اور 1968 کے دوران جو انسانی ڈھانچے ملے ان کا رشتہ مختلف ثقافتی مرحلوں سے تھا جن میں وہ زمانے بھی شامل ہیں جب انسان نے پتھر سے حسب ضرورت آلات اور ہتھیار بنانے کا ہنر سیکھ لیا تھا اور پھر وہ بھاری بھرکم پتھر بھی اسی استعمال میں لانے کا فن سیکھ چکا تھا۔ ان ادوار کو انگریزی میں Neolithic اور Neolithic-Megalithic کہا جاتا ہے۔

1964ء میں یہاں پر ایک بہت بڑا پتھر دریافت ہوا جسے باریک بینی سے پرکھنے کے بعد دیکھا گیا کہ اس سے قدیم ترین تارے سپرنووا کی روشنی اور اس کے بکھر جانے کی وضاحت ہوتی تھی۔ یہ انکشاف ڈاکٹر واہیا نے کیا جو ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈمینٹل ریسرچ، بمبئی میں بحیثیت ستارہ

شناس کا م کرتا تھا۔ اس دریافت سے اس بات کا پختہ ثبوت ملتا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل برزہ ہامہ کے مکین اختر شناسی کے علم میں کما حقہ مہارت رکھتے تھے۔

ڈی ٹیرا نے جس کھدائی کا کام ہاتھ میں لیا تھا وہ اسے اس لیے ترک کرنا پڑا کہ نزدیکی کریوہ سے تہہِ زمین مٹی اور ریت خاموشی سے پر اسرار طریقے پر جائے وقوعہ کی طرف کھسک رہی تھی جس سے سارے علاقے میں تباہی کا عالم برپا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کے بعد سالہا سال تک برزہ ہامہ نے ایک پہیلی اختیار کی کیونکہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوسکا اور نہ ہی دیر تک حقیقت جاننے کی کوشش کی گئی۔

پھر ریاست کے محکمہ آثار قدیمہ نے یہ کام جاری رکھنے کی خاطر ٹی، این، خزانچی کو سونپا۔ یہ ماہر اس محکمے میں سپرانٹنڈینٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ ذاتی اور ان تھک مساعی سے 1960 سے 1971 تک کام کی بہ نفس نفیس نگرانی کرتا رہا اور اس کی کارکردگی اُس وقت بار آور ثابت ہوئی جب برزہ ہامہ سے حیران کن آثار برآمد ہونے کے ساتھ یہ بات عیاں ہوگئی کہ تاریخ کشمیر کم از کم 3000 سال قبل مسیح پرانی ہے۔ خزاچی نے اس موقعے پر فخریہ لہجے میں کہا: ”کشمیر کی سرزمین کا بیٹا ہونے کے ناطے مجھے یہ افتخار حاصل ہوا کہ میں نے اپنے ان قدیم اجداد کے نقوش قدم پر اپنے پاؤں رکھے جو یہاں پر یہ علاقہ قابل رہائش بن جانے کے بعد آباد ہوئے تھے“۔ (4)

خزانچی مزید کہتا ہے: ”ان آبادیوں کا ٹھوس ثبوت ان کے رہائشی گڑھوں سے ملتا ہے۔ یہ برزہ ہامہ کا دور اولین ہے۔ ہماری خوشیوں کا اس وقت کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب ہماری کدال نے اپنے جدامجد کے گھر کے نشانے پر ضرب لگائی۔ ہم نے اس طرح اسے دیکھا اور پانچ ہزار سال کے وقفے کے بعد اسے

پایا۔ یہ گڑھے کشمیری باشندے نے اس طرح بنائے تھے گویا وہ رہنے کے لیے تعمیر کے فن سے آگاہ ہو چکا تھا۔ تب تک وہ ایک حیوان کی طرح شکار کے لیے محض آوارہ گردی کرتا تھا۔ زندہ رہنے کی خاطر اس کی جدوجہد رنگ لائی تھی۔ یہ گڑھے عمارتوں کی ساخت رکھتے تھے جو اوپر سے تنگ اور زیر زمین کشادہ تھے۔ ان میں سب سے بڑے گڑھے کی لمبائی اوپر کی سطح پر دو اعشاریہ چوہتر میٹر اور نچلی تہہ پر چار اعشاریہ چھتر میٹر تھی جب کہ وہ چار اعشاریہ پچانوے میٹر گہرا تھا۔ اس جگہ کا تعلق پتھر کے مابعد زمانے کے ساتھ وہاں پائے گئے آثار سے ثابت ہوا''۔(5)

بھاری بھر کم سنگی سلوں کے علاوہ دریافت شدہ آثار میں روزمرہ کے لیے کام آنے والا گھریلو سامان، پتھر کے نوکیلے نیزے، کلہاڑیاں، گول گیند، ہڈیوں کے اوزار، چھوٹی اور لمبی سوئیاں، برچھے کی شکل کے کانٹے، چھید کرنے والے ہتھیار، ہتھوڑے، دانت صاف کرنے کے ہڈیوں کے اوزار اور ذاتی زیورات یعنی گلے کے آویزے، مالائیں اور کنگھے شامل تھے۔ یہ تمام اشیاء نہایت فن کاری سے بنائے گئے تھے۔ یہ ہنرمندی برزہامی لوگوں کو قدرت نے ہی سکھائی تھی۔

خزانچی کا کام جب مکمل ہوا تو برزہامہ کی قبل از تاریخ کے نادر اور بیش بہا آثار اس لیے کلکتہ بھیجے گئے تاکہ وہاں پر ان کی سائنسی طرز پر جانچ کر کے ان کے حتمی عہد کا تعین کیا جا سکے۔ بدقسمتی سے یہ خزانہ آج تک واپس کشمیر نہیں بھیجا گیا ہے۔ اُس وقت ریاست کے وزیراعلیٰ غلام محمد صادق نے سرکاری طور پر اعلان کیا تھا کہ ان اشیاء کی واپسی پر اسی جگہ ایک شاندار عجائب گھر تعمیر کیا جائے گا جہاں دنیا بھر کے سیلانی کھنچ کے چلے آئیں گے۔ یہ سرکاری حکم نامہ بھی کبھی رو بہ عمل نہیں لایا گیا۔

اس کے علاوہ ہارون ہی میں دریافت شدہ Terra Cotta یعنی روغنی مٹی کے لاتعداد برتن اور دوسرا ساماں جموں کے امرگڈھ نامی علاقے میں رکھا گیا تھا۔

زعفران کے قصبے پامپور میں گلندر کے مقام پر کچھ عرصہ پہلے ہاتھی کا ایک قدیم ترین ڈھانچہ پایا گیا۔ اسے بھی جانچ کے بہانے پُر اسرار طور پر باہر لے جایا گیا اور غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق اب یہ حیدرآباد دکن میں کہیں پڑا ہوا ہے۔

برزہامہ کے بارے میں مقامی ارباب اقتدار نے سفارش کی تھی کہ اسے یونیسکو ورلڈ ہیریٹیج میں شامل کیا جائے۔ یہ تجویز 15 اپریل 2014 کو سامنے آئی لیکن اسے آج تک منظوری حاصل نہیں ہوسکی ہے۔

ریاست کے محکمہ سیاحت نے اگست 2012 میں مرکزی وزارت ثقافت سے کہا کہ ان سبھی قیمتی آثار کو واپس بھیجے جانے کے انتظامات کیے جائیں جن میں برزہامہ کے علاوہ ہاروَن کے مقام پر پائے جانے والے بودھوں کے مقدس آثار اور ویدوں کے بے حد قدیم مسودات بھی شامل ہیں مگر مرکزی سرکار کا کہنا ہے کہ یہ تمام نوادرات کشمیر کے دگرگوں سیاسی حالات کی بنا پر وہاں محفوظ نہیں ہیں لہازا ان کا فی الحال دیگر جگہوں پر رکھا جانا ہی مناسب ہوگا۔ اس وقت برزہامہ کے نوادرات کو نیشنل میوزیم کلکتہ میں رکھا گیا ہے۔



حوالہ جات:

(1) کشمیر، ہسٹری انڈ آرکیولاجی، ص

(2) دی برتھ آف انڈین سویلزیشن، پنگیون بکس

(3) نیٹ، ان پٹ

(4) کشمیر انڈ اٹز پیوپل، ترتیب ایم، کے، کاؤ، اے پی ایچ پبلشنگ کارپوریشن، نئی دہلی، 2004، ص11

(5) ایضاً، ص14



یوری پیڈیز

قدیم یونان کا ممتاز المیہ نگار

ابتدائیہ

پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ اور اس سے پہلے اور بعد کا ایک مخصوص دور یونانِ قدیم میں فن، ادب، فلسفہ اور دیگر فنون لطیفہ کی نشاۃ الثانیہ کا عہد زریں تھا۔ یہی وہ دور تھا جب سقراط، افلاطون اور ارسطو نے فلسفۂ حیاتِ و ممات اور زندگی کے اخلاق و آداب کے لیے اچھوتے معیار واضح کیے۔ ہومر یونانی رزمیہ کا بابائے آدم بن کر سامنے آ گیا۔ سیفو نے جنس کی جبلت کو اپنی رومانی شاعری کا بنیادی جزو بنایا اور دنیا میں پہلی بار شدت جذبات اور لذتِ ہوس سے بھرپور عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شاعری تخلیق کی۔ اُس زمانے میں قلم بند کی گئی ہیروڈوٹس کی تاریخ کو دنیا میں تاریخ کی اولین شیرازہ بندی کا شرف حاصل ہوا اور اسی قدیم یونان میں جالینوس نے حکمت کے نئے چراغوں سے عوام کے لیے صحت یابی کی روشنی کو جلا بخشی۔

ثقافتی لحاظ سے مالا مال اس یونان میں ایسکائی لس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کے المیہ ڈرامے اور ارسٹوفینیز کے تخلیق کردہ طربیے مکمل ڈرامے کی صنف میں فنی طور پر متعارف ہوئے۔

ڈراما یونانی زبان میں حرکت کو کہتے ہیں۔ اس کے پیش نظر اُس وقت یونان میں یہ دستور تھا کہ ڈراما نویس اپنی تخلیق کو سٹیج پر پیش کرنے کے عمل میں خود بھی شامل ہوتا تھا۔ اُسے حکام کی طرف سے اداکار اور دیگر سامان فراہم کیا جاتا تھا جس کے لیے سرکار رقومات بھی بہم کرتی تھی۔ مگر ڈرامائی پیشکش کی کامیابی یا ناکامی صرف مصنف کی کارکردگی کا ماحصل تصور کی جاتی تھی۔ ان ڈراموں میں کسی عورت کو اداکاری کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ ملک کے زعماء اور امراء اس خدشے میں مبتلا تھے کہ کہیں ان کی خواتینِ خانہ بھی اس لہو ولعب میں شریک ہو کر ان کی بدنامی کا باعث نہ بن جائیں۔ بعد میں خواتین اداکاراؤں نے ان ڈراموں میں نقاب پہن کر حصہ لینا شروع کیا تاکہ ناظرین انھیں پہچان نہ پائیں بصورت دیگر نوجوان اور خوبصورت لڑکے ہی نسوانی کرداروں کی اداکاری کرتے تھے۔

یوری پیڈیز کے سوانح

قدیم یونان کے کلاسیکی ادبی دورِ زرّیں میں یوری پیڈیز کی پیدائش لگ بھگ پانچ سو سال قبل مسیح بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا سال ولادت مستند طور پر معلوم نہیں البتہ عام خیال کے مطابق وہ 480 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ وہ ایک باوقار خاندان کا فرد تھا۔ مگر اس کا حریف طربیہ نگار ارسٹوفینیز اپنے مزاحیہ ڈرامے ''مینڈک'' میں کہتا ہے کہ: ''یوری پیڈیز نچلی ذات کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا اور ایسکائی لس کی زبانی اسے 'سبزے کی دیوی کی اولاد' کہلواتا ہے جو اندھا، بھکاری بھانڈ اور چوری کے چھیتڑوں کی گرد تھا۔ ارسٹوفینیز کے مطابق یوری پیڈیز کی ماں سیٹوں کی سڑکوں پر میوے، پھول اور جڑی بوٹیاں بیچا کرتی تھی۔ لیکن جدید تحقیق کی رو سے یوری پیڈیز اس درجے کے قبیلے کا فرد ہرگز نہیں تھا۔ جے پی محافی اپنی یونانی ادب کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ یوری پیڈیز غالباً سالامس

جزیرے میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ منی سار دلیس حملہ آور میڈیز سے چھپنے کی خاطر پناہ گزین بن کے بھاگ گیا تھا۔

یوری پیڈیز کا باپ ایک دولت مند شہری تھا اور اس کی ماں کا تعلق بھی ایک شریف خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ یہ بات اس حقیقت سے بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ یوری پیڈیز نے فن خطابت کا علم پراڈکس سے سیکھا تھا جو ان دنوں دیگر مدرسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ فیس طلب کرتا تھا۔ اس کے علاوہ یوری پیڈیز نے پروٹا گورس اور انکسا گورس جیسے عظیم فلسفہ دانوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔

یوری پیڈیز زندگی بھر شادمانی کو ترستا ہی رہا۔ اس نے دو شادیاں کیں مگر دونوں بیویاں بے وفا ثابت ہوئیں۔ ان سے اسے تین بچے ہوئے جن کی صحبت میں وہ اپنی تنہائی کے دن گذارتا یا سمندر کے کنارے دیر تک بیٹھتا یا اپنے کتب خانے میں ہی فرصت کا وقت گذارتا۔

اس کے بعد یوری پیڈیز ایتھنز میں قیام پذیر ہوا جہاں سقراط، پروتا گورس اور انکسا گورس کی مجلسوں میں اس کے فلسفیانہ تبحر میں نکھار آ گیا۔ سقراط کی وہ بے حد عزت کرتا تھا اور سقراط بھی یوری پیڈیز کو چاہتا تھا۔ اسی لیے سقراط یوری پیڈیز کا ہر ایک ڈراما دیکھتا اور اگر اسے کسی جگہ اختلاف نظر آتا تو وہ تھیٹر چھوڑ کر چلا جاتا۔ سقراط کہتا تھا کہ: "اگر مجھے یوری پیڈیز کا ڈراما دیکھنے کی غرض سے پایرائے کی دور کی جگہ تک بھی جانا پڑے تو میں ضرور جاؤں گا"۔

جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہوئے یوری پیڈیز کھیلوں اور مصوری کا شوقین بن گیا تھا مگر ایتھنیز میں اس کی ڈرامائی حس جاگ اٹھی اور اس نے المیہ ڈرامے لکھنا شروع کیا۔ اس طرح سے اس کا تحریر کردہ پہلا ڈراما اٹھارہ سال کی عمر میں 498 قبل مسیح میں سٹیج پر پیش کیا گیا۔ یوری پیڈیز کے فلسفیانہ احساس کو جب سقراط نے جلا بخشی تو وہ استدلال پسند اور عقلیت پسند بن گیا۔ پھر اس نے

یونانی روایات کے برعکس اپنے المیوں میں دیوتاؤں کو بھی انسانی مصائب اور تکالیف کا ذمہ وار گردانا۔ یہ ایک نئی آواز تھی کیونکہ یوری پیڈیز سے پہلے کسی نے دیوتاؤں کی طاقت کلی کو للکارا نہیں تھا۔ یوری پیڈیز نے ان کے محاسن اور قبوح نمایاں کیے اور بنی آدم کے دکھ سکھ میں عملی طور ان کی شمولیت کو آشکارا کیا۔ یوری پیڈیز کی اس روایت شکنی کو لوگوں نے قبول نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس نے ایتھنیز کے ڈرامائی مقابلوں میں بائیس بار حصہ لیا لیکن انعام اسے صرف ایک بار دیا گیا۔ یور پیڈیز کو زبردست مذہبی شعور حاصل تھا مگر یہ مذہبی صداقت اور علم اس کے بقول: ''بادلوں اور اندھیرے میں انسانی آنکھ سے پوشیدہ تھا''۔

انسان کا بہر صورت فانی ہونا اور دیوتاؤں کے ہاتھوں مجبور ہونا اسے بار بار ستاتا تھا اور وہ اپنے ڈرامے السسٹس کے اختتام پر کہتا ہے:

دیوتا کئی ہیتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں
کئی باتیں عجیب انداز سے اختتام کو پہنچتی ہیں
ہم جو ہونا چاہتے ہیں، وہ نہیں ہوتا
اور جن باتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا
انھیں دیوتا ممکن بناتے ہیں۔

یوری پیڈیز کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی کہ ایتھنیز اور سپارٹا میں جنگ چھڑ گئی۔ اس کے بعد ایتھنز کو امن اور چین دوبارہ نصیب نہیں ہوسکا۔ اس افراتفری اور خون ریزی نے یوری پیڈیز کو اور بھی انسان نواز بنا دیا کیونکہ اس نے خود تباہی، قتل و غارت، لوٹ مار اور ظلم اور جبر بول بالا دیکھا تھا۔ اس نے اپنا قلم جنگ کے خلاف اور امن کی خاطر وقف کیا جس کی مثالیں اس کے ڈراموں ٹرائے کی خواتین، انڈروماکی، ہیکیوبا اور افی جینیا یولسس میں اس کے شدید ردعمل سے ملتی ہیں۔

نادیدہ دیوتاؤں اور فرسودہ روایات کے خلاف یوری پیڈیز کی حق گوئی اسے مہنگی پڑی۔ وہ اپنے ہم عصروں ایسکائی لس اور سوفو کلیز کے برعکس پہلا ڈرامہ نگار تھا جس نے یونان کی صدیوں پر پھیلے ہوئے مذہبی عقائد اور رسوم کی نفی کی تھی۔ جس سے اس محکم عمارت کی بنیاد میں ایک ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ اسے دہری اور ملحد قرار دے کر جلائے وطن کی گیا۔ تاریخ کے اوراق پر یہ واقعہ بھی درج ہے کہ پھر مقدونیہ کے بادشاہ آرکیلاس نے اسے کئی بار مقدونیہ آنے کی دعوت دی۔ بہر حال وہ 408 قبل مسیح میں مقدونیہ چلا گیا جہاں اس کا شایان شان استقبال گیا۔ مگر یہاں اسے خطرناک موت کی شکل میں زندگی کا آخری سانحہ دیکھنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن نہ جانے کیسے اس پر بادشاہ کے شکاری کتے چھوڑے گئے۔ وہ شدید زخمی ہوا اور مقدونیہ ہی میں 406 قبل مسیح میں فوت ہوا۔ روایت ہے کہ جب ایتھنز اس کے انتقال کی خبر پہنچی تو عوام نے اس کا ماتم کیا اور نوے سالہ سوفوکلیز ماتم کرنے میں شامل ہوکر زار زار روتا رہا۔

یوری پیڈیز کو اگرچہ زندگی میں عوامی شہرت نصیب نہیں ہوئی مگر اس کی وفات کے بعد اسے سٹیج کا فلسفی کہا گیا اور اس کے ڈرامے درس گاہوں کے نصاب میں شامل کیے گئے۔

یوری پیڈیز کے ڈرامے

یوری پیڈیز نے اپنی 78 سالہ زندگی میں 92 ڈرامے لکھے جن میں سے فقط انیس باقی رہ سکے۔ اس کے علاوہ اس کے گم نام ڈراموں کو اقتباسات محفوظ ہیں۔

اُن دنوں یونان میں المیہ ڈراموں کے مقابلے ڈیونی سس دیوتا کے میلے پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان میں شامل ہر ڈراما نویس کو چار چار ڈرامے سٹیج پر پیش کرنے کی شرط تھی۔ پہلے تین المیہ ڈراموں کو Triology کہتے تھے اور چوتھا

طربیہ اسی دیوتا کو نذرانے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا جسے ساطیری ڈراما کا نام دیا جاتا تھا تاکہ ناظرین تین المیہ ڈراموں کی عائد کردہ مایوسی اور بے چینی کو کم کرسکیں۔ یوری پیڈیز نے بائیس مرتبہ ان مقابلوں میں شرکت کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کم از کم اٹھاسی ڈرامے تحریر کیے ہونگے۔ مگر انقلاب زمانہ نے اس کے اس بیش بہا سرمائے کو ہم تک پہنچنے نہیں دیا۔

یوری پیڈیز کے جو اُنیس ڈرامے حالات کی دست برد سے محفوظ رہ سکے ہیں ان میں سائی کلوپس (Cyclops) السسٹس (Alcestis) میڈیا (Medea) ہیراکلیز نی شری (Children of Heracles) ہپولیٹس (Hippolytus) انڈروماکی (Andromache) ہیکیوبا (Hecuba) فریادی (Suppliants) الیکٹرا (Electra) ٹرایچہ زنانہ (Trojan Women) افی جینیا ٹارسس منز (Iphigenia in Tauris) ہیلن (Helen) ایون (Ion) فانیکیاچہ زنانہ (Phaenician Women) ہیراکلیز (Heracles) اوریسٹیز (Orestes) افی جینیا یولسہ (Iphigenia in aulis) باکائی (Bacahae) اور ریسس (Rhesus) موجود ہیں۔

ان سبھی تخلیقات کا خام مواد یونان کی مالا مال دیو مالا سے لیا گیا ہے جس میں دیوتاؤں کی جنسی ہوسناکی کی بدکاریاں، جنگ وجدل میں بچوں اور عورتوں کی بے حرمتی اور ان کا جنسی استیصال، مضبوس دیوتاؤں کے ہاتھوں خوبصورت لڑکیوں کی عصمت ریزی اور مبازرت کے خطرناک نتائج کی کہانیاں اس پرزور اور موثر انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ پڑھنے والا گم گشتہ ہو کے رہ جاتا ہے۔

ان سبھی ڈراموں کی کہانیاں تفصیلاً بیان کرنا مشکل ہے البتہ یوری پیڈیز کے واحد انعام یافتہ ڈرامے ہپولی ٹس کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔ اسی ایک ڈرامے کو مقابلے میں پہلے انعام سے نوازا گیا۔ یہ ڈراما یوری پیڈیز نے ایتھنز میں

زبردست طاعون پھوٹ پڑنے کے بعد پیش کیا جس نے 429 میں پیراکلیز کی جان لی۔ ڈراما نگار نے اس عظیم سیاست دان اور حاکم کو ان الفاظ میں اس ڈرامے میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

یہ وہ غم ہے جس نے ہر دل میں جگہ پائی
اور ساری آنکھوں سے بہتے آنسو
آوازوں کو ماتمی رنگ دیں گے
وہ ایک نیک انسان تھا
اور ہر ایک زبان اونچی آواز میں
اس کا ماتم اور تعریف کرتی رہے گی
اور اس کی گونج دنیا بھر میں گونجتی رہے گی۔

یوری پیڈیز کے گم شدہ ڈراموں میں تقریباً دو درجن تخلیقات کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں جنھیں یہاں دوہرانا بے معنی ہی ہوگا۔

میڈیا

یوری پیڈیز کے سبھی ڈراموں میں میڈیا سب سے اہم، زوردار، مسحور کن اور جذبات خیز تخلیق ہے۔ اس میں ایک ایسی عورت، میڈیا، کی دردناک کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے خاوند کی بے وفائی کا شکار ہوتی ہے جو اس خوبصورت اور جادوئی طاقت رکھنے والی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی ایک شہزادی سے نیا بیاہ رچاتا ہے۔ میڈیا خاموش رہنے والی نہیں۔ وہ اپنے بے وفا شوہر سے رونگٹے کھڑا کرنے والے انتقام کے لیے اپنے دو چھوٹے بچوں کے ہاتھوں زہر ملا ہوا نیا پوشاک اپنی سوتن کو تحفے میں بھیجتی ہے جسے پہنتے ہی اس کے جسم کا سارا گوشت گھل گھل کر سڑے ہوئے ٹکڑوں کی شکل میں اس کی تن سے جھڑنے لگتا ہے۔

میڈیا اس خوف سے کہ اس کا شوہر، جیسن، اب اس کے بچوں کو سزائے موت دے گا، وہ خود ہی ان دونوں کو ایک بند کمرے میں لے جا کر قتل کر دیتی ہے اور جادوئی پر لگا کر اپنے اسی دور دراز ملک کی جانب پرواز کرتی ہے جہاں سے جیسن نے اسے ورغلا کر لایا تھا۔

ماں کے ہاتھوں دو معصوم جانوں کی ہلاکت کے بعد جو مکالمہ میڈیا اور اس کے شوہر جیسن کے درمیان ہوتا ہے اسے یہاں دوہرانا چاہتا ہوں:

جیسن: جا! ان دو بچوں کے عوض قہر کا دیوتا تجھے در بدر کرے
اور انصاف کا دیوتا، جو خون کا بدلہ لینے والا ہے، تیری بربادی لائے

میڈیا: وہ کون سی آسمانی طاقت ہے
جو ایک ایسے شخص پر کان دھرے
جس نے قسم توڑی ہو
جو دروغ گو اور دھوکے باز ہو

جیسن: اف! میں تم سے نفرت کرتا ہوں
بچوں کی قاتلہ

میڈیا: جا! اپنے محل میں جا
اور اپنی دلہن کو دفن کرو!

جیسن: ہاں! میں جاؤں گا
اپنی اولاد کا ماتم کرتے ہوئے

میڈیا: تمہیں اب بھی کوئی احساس نہیں
خیر! آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا
جب بوڑھے ہو جاؤ گے
یہ درد تمہیں چرکے لگائے گا

جیسن: میرے پیارے بچو!
کتنا پیار تھا مجھے تم سے
میڈیا: ان سے پیار مجھے تھا، تمھیں نہیں
جیسن: تمھیں وہ پیارے تھے نا
اسی لیے انھیں قتل کیا
میڈیا: تا کہ تم یہ ضرب محسوس کرو اور
دل کے ٹکڑے گنتے جاؤ
جیسن: ہائے! کتنابد نصیب ہوں میں
کس طرح تو اپنے بچوں کے
ہونٹوں کو چومنے کی امید لیے بیٹھا ہے؟
میڈیا: اب کہتے ہو، چوموں گا، پہلے کبھی نہیں
جیسن: میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ
مجھے اپنے بچوں کے ریشمی بدن کو چھونے دے
میڈیا: قطعاً نہیں اب تمہاری باتیں بے سود ہیں
جیسن: میرے زیوس دیوتا!
دیکھ رہے ہو یہ ستم؟
میرا یہ دُکھ جو اس ذلیل عورت نے مجھے دیا
اپنے ہی بیٹوں کو قتل کرنے والی اس ڈائن نے
پھر بھی جو کچھ میں کر سکتا ہوں، میں کروں گا
میں دیوتاؤں کے سامنے جامہ چاک ہو کر
اُن سے کہوں گا کہ وہ گواہ رہیں
کہ تم نے کس طرح میرے دو بچوں کی گردنیں کاٹ ڈالیں

انھیں مجھے چھونے تک نہیں دیا
ان کی لاشوں کو دفن کرنے نہیں دیا
کاش! میں نے انھیں اس سنسار میں اس لیے نہیں لایا ہوتا
کہ میں اپنی آنکھوں سے انھیں
تمہارے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھوں!

(جیسن یہی آہ وزاری کر رہا ہے کہ میڈیا اپنی اڑنے والی ہوائی بگھی میں بیٹھ کر خلاؤں میں غائب ہو جاتی ہے)

میڈیا یوری پیڈیز نے 431 ق م میں ڈرامائی مقابلے میں پیش کیا اور اسے تیسرا انعام دیا گیا۔ پروفیسر ایچ، ڈی، ایفِ کٹو اس ڈرامے کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "یہ ڈراما ایک جذباتی عورت کا کرداری مطالعہ ہے جس کی زندگی کی عمارت پہلے محبت اور پھر نفرت سے پاش پاش ہو جاتی ہے"۔ اس تخلیق میں ڈراما نگار نے یہ دکھایا ہے کہ جب کوئی انسانی احساس کسی اور احساس پر غالب آجاتا ہے تو یہی انسان اس احساس کے غلبے سے حیوان کی طرح عمل کرتا ہے اور اس کے ہاتھوں ایسی دہشت ناک حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جن کا تصور بھی ایک عقل مند شخص اپنی زندگی میں بھولے سے بھی کر سکتا ہے اور جنھیں سن کر یا دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اخیر پر میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ یوری پیڈیز کے اس عالمی شہرت یافتہ ڈرامے "میڈیا" کا میں نے کشمیری زبان میں ترجمہ کیا ہے جو کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری کے اہتمام سے کتابی شکل میں 1998ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔



تاثرات

غلام نبی خیالؔ کی اردو ادبی خدمات

رُوبینہ ناز
شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ

فی الحال: لندن

ڈاکٹر محی الدین زورؔ کشمیری کی ایک مختصر سی کتاب ''دبستانِ کشمیر میں اُردو'' پڑھنے کو ملی۔ یہ کتاب آر پار پورے جموں وکشمیر میں اردو کا مجموعی طور پر خاکہ پیش کرتی ہے اور اس کتاب میں زور صاحب نے جموں وکشمیر کے اہم ادباء کے زمرے میں غلام نبی خیالؔ صاحب کو بھی شامل کرلیا ہے۔ تو اس طرح خیال صاحب کو جاننے کا مجھے بہت اشتیاق ہوا۔ مجھے مختلف ذرائع سے اس بات کا پتہ چلا کہ خیال صاحب بیک وقت تین زبانوں میں لکھتے ہیں اوران کا زیادہ تر فوکس کشمیر میں رہتا ہے۔ تو ہم جیسے غیر کشمیریوں کے لیے یہ بات بہت ہی خوش آئند ہے کہ ہم کشمیر کو دیکھے بغیر ایک ادیب کی تحریروں کے مطالعے سے کشمیر کا وہ مزہ لے سکتے ہیں جو یہاں کی سیر کرنے سے آجاتا ہے۔

میں غلام نبی خیال کے بارے میں اور اُن کی تحریروں اور کتابوں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے ڈاکٹر محی الدین زور سے رابطہ قائم کر کے اُن کے بارے میں مواد حاصل کر کے یہ مقالہ تحریر کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر زور خیالؔ صاحب کے بارے میں اپنی کتاب ''ادبی افکار اور اقدار'' میں لکھتے ہیں:

''کشمیر کے ادبی اُفق پر ان کا نام کوئی نیا نہیں ہے۔ وہ برسوں سے لکھ رہے ہیں مگر سوچ سمجھ کر اور پڑھ کر لکھتے ہیں۔ وہ تمام مشرقی اور مغربی ادب کی تحریکات اور ادبی کاوشوں سے باخبر ہیں، اسی لیے ان کی فکر میں ادبی صورتِ حال کا جائزہ لینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے اور وہ تنگ حلقوں کو توڑ کر وسیع تر پیمانے پر ادب کو پرکھنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ ایک نوجوان قاری خیالؔ صاحب کے مضامین پڑھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف کئی اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تن من دھن سے لگاتار اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہاں کے نوجوان ادیبوں کی پود کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتے جا رہے ہیں''۔

خیال صاحب نے اُردو تحریروں کے انبار لگائے ہیں۔ میں کشمیری کو چھوڑ کر صرف ان کی اردو تخلیقات کے بارے میں ہی کچھ عرض کروں گی۔ خیالؔ صاحب ایک کل وقتی صحافی اور قلم کار ہیں۔ اُن کی کتابوں پر بات کرنے سے پہلے میں اُن کی صحافتی زندگی پر بھی ایک نظر ڈالوں گی۔

غلام نبی خیالؔ نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ایک کشمیری جریدے ''کونگ پوش'' (زعفران کا پھول) سے 1954ء میں کیا۔ اُس وقت کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک زوروں پر تھی۔ اس کے بعد انھوں نے 1964ء میں ''محاذ'' نام کے ایک اخبار کی ادارت کی۔ اُس وقت کی سیاسی کشمکش کی وجہ سے اس اخبار پر پابندی عائد کی گئی۔ 1965ء میں انھوں نے پہلا کشمیری ہفت روزہ اخبار ''وطن'' شروع کیا اور اس کے بعد اپنے ایک اور اخبار ''اقبال'' کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ وہ مشہور انگریزی جریدے ''انڈیا ٹوڈے'' کے ریاستی نامہ

نگار بھی بن گئے اور پھر ''سٹیٹس مین'' سے وابستہ ہو گئے۔ خیال صاحب نے برسوں تک پاکستانی روزنامہ ''نوائے وقت''، ''گارڈین'' لندن اور امریکہ کے مشہور عالم میگزین ''ٹائم'' کے لیے بھی کام کیا۔

مئی 2003ء میں خیالؔ صاحب نے انگریزی ہفت روزہ **Voice of Kashmir** جاری کیا جو آج تک برابر پابندی سے ہر شکروار کو منظر عام پر آجاتا ہے۔ اس میں حالات حاضرہ کے ساتھ ساتھ زیادہ تر مقامی ادب اور ثقافت کو اس بین الاقوامی زبان میں تشہیر دی جاتی ہے۔ اسی اخبار میں خیال صاحب نے کشمیر کی سیاسیات سے متعلق ایک سلسلہ وار کتاب ''مائی سٹوری مائی کشمیر'' کے نام سے تحریر کی جواب کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہے۔ مختلف موضوعات پر خیال صاحب کے مضامین مقامی اخبار ''گریٹر کشمیر''، ''رائزنگ کشمیر'' اور دیگر اردو اور انگریزی جرائد میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

غلام نبی خیالؔ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد 1954ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ ہوئے تھے لیکن چار سال بعد ہی انھوں نے یہ نوکری چھوڑ دی اور زندگی کے کئی منازل طے کرنے کے بعد وویس آف امریکہ اور جرمن ریڈیو کے لیے کام کرتے رہے اور اس دوران انھیں اپنی حقیقت بیانی کے لیے سرکار کی طرف سے کئی جوکھم اُٹھانے پڑے۔ غلام نبی خیالؔ 1954ء کے آس پاس ترقی پسند ادبی تحریک میں شامل ہو گئے اور جلد ہی انھوں نے ''کونگ پوش'' کی ادارت سنبھالی۔ مجھے مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ کشمیر میں ترقی پسند تحریک اُس وقت شروع ہوئی جب پورے برصغیر میں یہ دم توڑ چکی تھی اور جدیدیت دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس موضوع پر خیال صاحب کی کتاب **Progressive Literary Movement in Kashmir** کے عنوان سے انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔

خیالؔ صاحب اچھا شعری ذوق بھی رکھتے ہیں۔ اُن کا کلام مختلف نشریاتی اداروں سے سنایا جاتا ہے اور کشمیری میں ان کے کئی مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں جنھیں بہت سرایا گیا ہے۔ آپ نے کئی مقامی اور ملکی مشاعروں میں شرکت کی ہے جہاں انھیں بہت داد ملتی رہی ہے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ غلام نبی خیال نے اپنی مادری زبان کشمیری میں پندرہ کتابیں لکھی ہیں۔ انگریزی میں دو اور اُردو میں مندرجہ ذیل نو کتب تخلیق کی ہیں:

اقبال اور تحریک آزادی کشمیر، خیابان کشمیر، کاروانِ خیال، اظہار خیال، فکر خیال، چنار رنگ، خیالات، فغانِ کشمیر، خیال قلم

(1) ''اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' خیال صاحب کی ایک اہم تصنیف ہے جس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جن میں ایک ایڈیشن اقبال اکیڈیمی پاکستان، لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں اس کے موضوع کے حوالے سے خیال صاحب نے ذیل کے الگ الگ ابواب پیش کیے ہیں:
تحریک حریت کشمیر، اقبال کا حسب ونسب، سوانح حیات، اقبال اور درد وطن، اقبال اور یاران وطن اور اقبال اور تحریک آزادی کشمیر۔
یہ کتاب اپنے اندر کئی اہم موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے، جیسے علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری اور کشمیر کی سیاسی تواریخ کے حوالے سے خیال صاحب نے کئی اہم مسائل کو زیر بحث لانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ یہ تجزیہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ اس سے اُن کے ایک مدبر سیاسی تجزیہ نگار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔
اقبال اور کشمیر کے موضوع پر جگن ناتھ آزاد نے بھی ایک مختصر کتاب لکھی

ہے، لیکن خیال صاحب کا انداز بیان بالکل مختلف ہے۔ خیال صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ آزاد نے اپنے ایک مقصد کے حصول کی خاطر اپنی کتاب میں اقبال اور کشمیری سیاست دان شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں جو غلط بیانی کی ہے اُسے سراسر ادبی بے ایمانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خیال صاحب کی یہ منفرد موضوع کی کتاب اولین ایڈیشن سے تیسرے ایڈیشن تک برابر ناقدین اور مبصرین کے لئے موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ ہند و پاک کے بڑے بڑے اخباروں میں اس پر تبصرے شائع ہوئے جن میں نوائے وقت لاہور، اُمت کراچی، کشمیر ٹائمز جموں اور آہنگ وغیرہ شامل ہیں۔

(2) خیابانِ کشمیر: جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ اینڈ کلچر کی طرف سے شائع شدہ اس کتاب میں کشمیری شاعری کی منتخب منظومات کا منظوم اردو ترجمہ کیا گیا ہے جس میں خیاؔل صاحب کے علاوہ کئی اور کشمیری ادیبوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ خیاؔل صاحب نے کتاب میں شامل تمام شعراء کا تعارف بھی شامل کیا ہے۔ کشمیری زبان نہ جاننے والوں کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے جو انہیں کشمیر کی سات سو سالہ شاعری پر طبع آزمائی کرنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔

(3) ''کاروانِ خیال'' : کشمیری رائٹرس کانفرنس کی طرف سے 1998ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب چار سو چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اسے تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مواد بیشتر کشمیری ادب اور ثقافت اور دیگر موضوعات پر مبنی ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں کشمیری زبان اور صحافت پر لکھے گئے تیرہ مضامین شامل ہیں، جن میں اس زبان کا عوامی ادب، مختلف اصناف ادب، کچھ تقابلی

خیالؔ صاحب اچھا شعری ذوق بھی رکھتے ہیں۔اُن کا کلام مختلف نشریاتی اداروں سے سنایا جاتا ہے اور کشمیری میں ان کے کئی مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں جنھیں بہت سراہا گیا ہے۔آپ نے کئی مقامی اور ملکی مشاعروں میں شرکت کی ہے جہاں انھیں بہت داد ملتی رہی ہے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ غلام نبی خیال نے اپنی مادری زبان کشمیری میں پندرہ کتابیں لکھی ہیں۔انگریزی میں دو اور اُردو میں مندرجہ ذیل نو کتب تخلیق کی ہیں:

اقبال اور تحریک آزادی کشمیر، خیابانِ کشمیر، کاروانِ خیال، اظہار خیال، فکر خیال، چنار رنگ، خیالات، فغانِ کشمیر، خیال قلم

(1) ''اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' خیال صاحب کی ایک اہم تصنیف ہے جس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جن میں ایک ایڈیشن اقبال اکیڈیمی پاکستان، لاہور نے شائع کی ہے۔اس کتاب میں اس کے موضوع کے حوالے سے خیال صاحب نے ذیل کے الگ الگ ابواب پیش کیے ہیں:

تحریک حریت کشمیر، اقبال کا حسب و نسب، سوانح حیات، اقبال اور درد وطن، اقبال اور یاران وطن اور اقبال اور تحریک آزادی کشمیر۔

یہ کتاب اپنے اندر کئی اہم موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے، جیسے علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری اور کشمیر کی سیاسی تواریخ کے حوالے سے خیال صاحب نے کئی اہم مسائل کو زیر بحث لانے کی بھرپور سعی کی ہے۔یہ تجزیہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ اس سے اُن کے ایک مدبر سیاسی تجزیہ نگار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

اقبال اور کشمیر کے موضوع پر جگن ناتھ آزاد نے بھی ایک مختصر کتاب لکھی

ہے، لیکن خیال صاحب کا انداز بیان بالکل مختلف ہے۔ خیال صاحب
کا یہ بھی کہنا ہے کہ آزاد نے اپنے ایک مقصد کے حصول کی خاطر اپنی
کتاب میں اقبال اور کشمیری سیاست دان شیخ محمد عبداللہ کے بارے
میں جو غلط بیانی کی ہے اُسے سراسر ادبی بے ایمانی سے تعبیر کیا جاسکتا
ہے۔ خیال صاحب کی یہ منفرد موضوع کی کتاب اولین ایڈیشن سے
تیسرے ایڈیشن تک برابر ناقدین اور مبصرین کے لئے موضوع بحث
بنی ہوئی ہے۔ ہند و پاک کے بڑے بڑے اخباروں میں اس پر
تبصرے شائع ہوئے جن میں نوائے وقت لاہور، اُمت کراچی، کشمیر
ٹائمز جموں اور آہنگ وغیرہ شامل ہیں۔

(2) خیابانِ کشمیر: جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ اینڈ کلچر کی طرف سے
شائع شدہ اس کتاب میں کشمیری شاعری کی منتخب منظومات کا منظوم
اردو ترجمہ کیا گیا ہے جس میں خیاؔل صاحب کے علاوہ کئی اور کشمیری
ادیبوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ خیاؔل صاحب نے کتاب میں شامل
تمام شعراء کا تعارف بھی شامل کیا ہے۔ کشمیری زبان نہ جاننے والوں
کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے جو انہیں کشمیر کی سات سو سالہ شاعری پر
طبع آزمائی کرنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔

(3) ''کاروانِ خیال'' : کشمیری رائٹرس کانفرنس کی طرف سے 1998ء
میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب چار سو چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور
اسے تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مواد بیشتر
کشمیری ادب اور ثقافت اور دیگر موضوعات پر مبنی ہے۔ کتاب کے
پہلے حصے میں کشمیری زبان اور صحافت پر لکھے گئے تیرہ مضامین شامل
ہیں، جن میں اس زبان کا عوامی ادب، مختلف اصناف ادب، کچھ تقابلی

مطالعات پر مقالات، کشمیری زبان و ادب پر دوسری زبانوں اور ادبیات کے اثرات، تراجم اور صحافت وغیرہ وغیرہ اپنے خاص انداز میں خیال صاحب نے بیان کئے ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ زبان وادب کے اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مشاہیر کشمیر میں حضرت شیخ یعقوب صرفی اور غنی کشمیری پر مضامین ہیں۔ ساتھ ہی عالمی شہرت یافتہ ادباء جیسے اقبال، حافظ، ارسطو، عمر خیام اور دیگر مشہور عالمی ہستیوں پر سوانحی، شخصی، فکری، تنقیدی اور تقابلی مقالات رقم کیے گئے ہیں۔

کتاب کے تیسرے حصے میں خیالؔ صاحب کے نام وہ خطوط شامل کیے گئے ہیں جو انہیں برصغیر کی معتبر ہستیوں نے وقتاً فوقتاً بھیجے ہیں۔ ان خطوط سے نہ صرف ان کی شخصیت کو جاننے اور پرکھنے کی خاطر بھرپور مواد ملتا ہے بلکہ ان خطوط میں زندگی کے بیشتر معاملات بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ان حالات وواقعات کا تعلق ہماری تاریخ اور ثقافت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ان شخصیات میں مولانا امتیاز علی عرشی، رام لعل، ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن، شمس الرحمٰن فاروقی، شیخ محمد عبداللہ، بلراج ساہنی، دیو آنند، راج کپور، رامانند ساگر، آل احمد سرور، بشیر بدر، جگن ناتھ آزاد اور احمد ندیم قاسمی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کتاب غیر کشمیریوں کو کشمیر کی ثقافت اور ادبیات سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی یہ خطوط اور اس کتاب میں شامل ایک مضمون ''کاروانِ خیال'' پڑھنے سے ہمیں خیالؔ صاحب کی ادبی شخصیت سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

(4) ''اظہار خیال'': یہ کتاب 2003ء میں منظر عام پر آئی۔ ایک سو بتیس

صفحات کی اس کتاب میں نو مضامین ہیں، جن میں چند ایک کو چھوڑ کر باقی سارے مضامین کا تعلق کشمیری زبان و ثقافت کے ساتھ ہے۔ جنوبی ایشیا میں اردو زبان و ادب، فراق اور گنگا جمنی تہذیب کے علاوہ یہ مضامین ریاست کی ادبی شخصیات جیسے اثر صہبائی، خوشی محمد ناظر، مہجور، آزاد اور دیگر اکابرینِ ثقافت کے بارے میں ہیں۔ مخدوم محی الدین، ٹیگور اور بلراج ساہنی جیسے ادیبوں کے کشمیر کے ساتھ رشتوں کو بھی زیر بحث لانے کی خیال صاحب نے سعی کی ہے۔ یہ سبھی مضامین بڑے دلچسپ ہیں اور اس کتاب میں کچھ تلخ حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں۔

(5) ''فکر خیال'': یہ کتاب 2007ء میں منظر عام پر آئی۔ دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں انواع واقسام کے سولہ مقالات درج ہیں۔ بیشتر مضامین کا موضوع کشمیر اور کشمیری ادب ہے۔ اس کے علاوہ ''اُردو ادب میں کشمیر کی غلط تصویر کشی'' کے عنوان سے جو مضمون شامل کتاب ہے اُس میں موصوف نے اُن غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جو اُردو کے بڑے بڑے قلم کاروں نے اپنی تحریروں میں کی ہیں۔ ان لوگوں نے کشمیر کو دیکھے بغیر اس کے حُسن اور ثقافت کے بارے میں ایسے حالات و واقعات بیان کئے ہیں جن سے کشمیر اور کشمیریت کے حوالے سے کبھی کبھی بدگمانیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

کشمیر پر یورپی قلم کاروں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ کشمیری ادبیات کا ماخذ بھی قدیم سنسکرت یا عربی فارسی ادب بنتا ہے۔ اس پر بھی خیال صاحب نے تحقیقی نوعیت کے مضامین لکھے ہیں، جن میں سے اکثر مضامین ہمیں ملکی اور بین الاقوامی رسالوں میں وقتاً فوقتاً پڑھنے کو ملے ہیں۔

(6) ''چنار رنگ'': کشمیر کے فطری حسن و جمال پر تحریر کردہ مختلف اُردو شعراء کی منظومات پر مبنی اس عنوان کی پہلی جلد کلچرل اکیڈیمی نے شائع کی تھی جسے خیالؔ صاحب نے آگے بڑھایا۔ یہ ضرورت اس لئے آن پڑی کہ اولین مرتب نے کئی ایسی نظمیں نظر انداز کی تھیں جو فردوس کشمیر کے پس منظر میں نہایت اہم تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی تدوین میں جتنی منظومات جمع کی تھیں، خیال صاحب نے اس تعداد سے کہیں زیادہ ''منظوماتِ کشمیر'' کی شیرازہ بندی کر کے انہیں دوسری جلد میں شامل کرلیا اور کتاب کا ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا۔ یہ کتاب پیش کر کے خیالؔ صاحب نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

(7) ''خیالات'': نام کی کتاب 2009ء میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی خیال صاحب کے سترہ مضامین شامل ہیں۔ کشمیر پر لکھی گئی قدیم تاریخ ''راج ترنگنی''، کشمیری ادب پر دوسرے ادبیات کے اثرات، کشمیری ادب کی ترقی اور اس کے رجحانات، صحافت، کشمیر میں اُردو کے حوالے سے چند مباحثات اور دیگر ادبی اور ثقافتی مضامین سے یہ کتاب آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین سے ہمیں کوئی نہ کوئی جانکاری نصیب ہوتی ہے۔ خیال صاحب نے ہر مضمون ایک نئے انداز میں لکھا ہے۔

(8) ''فغانِ کشمیر'': سرزمین کشمیر جو 1990ء کے بعد سالہا سال تک انسانی خون میں نہاتی رہی، تاریخ کے اس سب سے بڑے حادثے سے صبر و استقلال کے ساتھ گزرتی رہی۔ اس کتاب میں جور و جبر، ظلم و استبداد اور سرکاری اور دوسری دہشت گردی کے خلاف برصغیر کے معتبر شعرا کی مزاحمتی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ ان شعراء میں ہندوستان اور

پاکستان کے درجنوں برگزیدہ شعرا کا مزاحمتی شعرا کی تخلیقات پہلی بار مجتمع کی گئی ہیں، جس کے لئے خیالؔ صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(9) ''خیال قلم'': غلام نبی خیالؔ صاحب کی ایک دیدہ زیب اور اہم کتاب ہے۔ تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی اور رنگا رنگ تصاویر سے مزین اس تخلیق میں ایسے تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں جن پر کسی کشمیری ادیب نے پہلی بار قلم اُٹھایا ہو۔ مثال کے طور پر ''گویٹے اور دیوان مغربی'' اور ''جوشؔ اور حفیظ کی شاعری میں کشمیریت'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوبصورت درآمدی کاغذ پر بہترین کمپوزنگ کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ کتاب میں خیالؔ صاحب کی شخصیت اور اُن کے فن پر مشہور قلم کار فاروق ارگلی کا ایک جامع مضمون اور مراد آباد میں ''جشنِ خیال'' کی روئداد محترمہ قمر قدیم اِرم کے قلم سے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ خیال صاحب نے قاری کو بہترین مواد مطالعہ کے لئے فراہم کیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، خیالؔ صاحب بیک وقت تین زبانوں میں لکھتے ہیں۔ کشمیری زبان سے نابلد ہونے کی بنا پر میں ان کے اُس حصے پر اظہار خیال کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ ایک مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر انگریزی اور دیگر زبانوں سے کشمیری میں چند بے مثال تراجم کئے ہیں۔ وہ ایک سرکردہ محقق بھی ہیں اور اُردو میں ان کی اکثر تحریریں تحقیق وتنقید پر مشتمل ہیں۔

اُردو زبان وادب کی خدمت کا سلسلہ جاری وساری رکھتے ہوئے خیالؔ صاحب نے مشہور مغربی ماہر ارضیات اور مورخ سر والٹر لارنس کی کشمیر پر لکھی گئی شہرۂ آفاق انگریزی کتاب ''دی ویلی آف کشمیر'' کا اُردو ترجمہ کیا ہے جو نئی دہلی

میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔اس کے علاوہ خیالؔ صاحب نے ٹنڈیل بسکو کی ایک اور انگریزی کتاب ''کشمیر اِن سن لائٹ اینڈ شیڈ'' کا اُردو ترجمہ بھی کیا ہے، اِسے بھی اُردو کونسل ہی نے شائع کیا ہے۔

یہ تھا جناب غلام نبی خیالؔ صاحب کی خدماتِ اُردو کا ایک مختصر سا جائزہ۔

والسلام

(روبینہ ناز ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کے بعد برطانیہ منتقل ہو چکی ہیں)



غلام نبی خیال کا اُردو میں ادبی مقام و مرتبہ

رفیق سرہانوی

کشمیر خوبصورتی کے لحاظ سے پوری دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ٹھیک اسی طرح ریاست جموں و کشمیر نے بہت ہی عظیم المرتبت لوگوں کو جنم دیا، جن میں چند ادیب کشمیر سے باہر ہجرت کر کے بھی اپنے وطن کو نہ بھول سکے۔ خاص کر علامہ اقبال، رتن ناتھ سرشار، سعادت حسن منٹو، دیا شنکر نسیم وغیرہ، اور بہت سے ادیب اپنی مٹی سے بے انتہا محبت کی وجہ سے کشمیر میں ہی ادب کی خدمت کرتے رہے، جن میں عبدالاحد آزاد، غلام احمد مہجور، پریم ناتھ پردیسی، حامدی کاشمیری، محمد عبداللہ عارج، ارجن دیو مجبور، غلام نبی خیال، امین کامل وغیرہ شامل ہیں۔

ریاست کے ادبی اُفق پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو بہت سے ادیب ایسے ہیں جنھوں نے ادب کے ہر شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔اس لمبی فہرست میں ایک نام پچھلی نصف صدی سے بھی زیادہ وقت سے اپنی ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔اس مایہ ناز ادیب کا نام غلام نبی خیال ہے جو میرے تحقیقی مقالہ کا موضوع ہے۔غلام نبی خیال نے ادب کے تقریباً ہر شعبے میں طبع آزمائی کی، لیکن صحافت اور تحقیق و تنقید میں آپ نے ایسے سنگ میل قائم کیے جس جن کو عبور کرنا آسان نہیں۔

غلام نبی خیالؔ کا اصلی نام غلام نبی میر ہے اور تخلص خیالؔ کیا۔ وہ 4 مارچ 1939ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن بڑی عیش و عشرت میں گزرا ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے حاصل کی۔ 24 فروری 1958ء کو ایک سیاسی کیس میں قید کیے گئے اور ان کو سینٹرل جیل سرینگر میں منتقل کیا گیا۔ جہاں انھوں نے انتہائی مصائب کے باوجود اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھا اور سینٹرل جیل سرینگر میں ہی انھوں نے 1960ء میں اپنا بی اے امتیازی حیثیت کے ساتھ مکمل کیا۔ قید خانے میں ہی انھوں نے مولانا محمد سعید مسعودی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 1960ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد خیالؔ نے مختلف صحافتی میدانوں میں کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم کو جاری رکھا۔ چونکہ تعلیمی قوائد اور ضوابط کے مطابق خیالؔ نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کیا۔ غلام نبی خیال ریڈیو کشمیر سرینگر میں بحیثیت منادی Announcer تعینات ہوئے تھے۔ لیکن اس ملازمت سے انھیں اُس وقت سبکدوش ہونا پڑا جب انھیں چار سال تک نوکری کرنے کے بعد ڈیوٹی سے گھر جاتے وقت راستے میں ہی ایک سیاسی سازش کے الزام کے تحت گرفتار کیا گیا۔

غلام نبی خیالؔ کی ادبی دلچسپیوں کا آغاز بمبئی کے ہفتہ وار فلمی رسالے ''چترا'' سے ہوا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خیالؔ صاحب اسلامیہ ہائی سکول میں زیر تعلیم تھے۔ اس فلمی رسالے نے ان کے دل میں ایک ادبی ذوق قائم کیا۔ یہ تو تھا طالب علمی کا زمانہ، اس کے بعد غلام نبی خیالؔ نے جب اپنی شعور کی آنکھیں کھولی تو ان کو ہر طرف ادبی تحریک کا ہی سماں دکھائی دیا۔ یہ ادبی تحریکوں کا دور تھا۔ جس نے خیالؔ کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا۔ 1954ء میں انھوں نے باضابطہ طور پر ریاست جموں و کشمیر کی ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شمولیت اختیار کی تو پہلے وہ کشمیری میں شاعری کرنے لگے اور بعد میں اردو ادب اور

انگریزی ادب کی طرف بھی راغب ہوئے اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 1954ء میں ''کونگ پوش'' رسالہ سے کیا۔ وہ اس کے مدیر تھے۔ اس کے بعد 1964ء میں خیالؔ کی ادارت میں اردو ہفت روزہ ''محاذ'' شائع ہوا۔ اور 1964ء کے آخر میں ہی اس اخبار ''محاذ'' پر ایک سرکاری حکم نامے کے تحت پابندی عائد کی گئی۔ لہازا انھوں نے اپریل 1965ء میں اپنا ہفتہ وار پہلا کشمیری اخبار ''وطن'' جاری کیا۔ یہ اخبار بھی چند وجوہات کی بناء پر 1968ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد 1968ء میں ہی انھوں نے اردو ہفت روزہ ''اقبال'' شائع کیا جو بعد میں روزنامہ بھی بن گیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد انھیں کئی مجبوریوں کی بنا پر یہ اخبار بھی بند کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی محنت ولگن کے ساتھ صحافتی پیشے کو ہمیشہ جاری رکھا اور اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ پھر وہ انگریزی صحافت کی طرف راغب ہوئے۔ جن ملکی وغیر ملکی انگریزی واردو اخبارات اور رسائل سے وہ وابستہ رہے اُن میں ''انڈیا ٹوڈے''، ''سٹیٹس مین'' روزنامہ ''نوائے وقت'' (پاکستان)، اخبار ''گارڈین'' (لندن) ''ٹائم'' میگزین (امریکہ) وغیرہ شامل ہیں، اور 2003ء میں انھوں نے ایک ہفت روزہ انگریزی اخبار **Voice of Kashmir** جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔ انگریزی زبان میں اس اخبار کو نکالنے سے خیالؔ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کشمیر کا ادب، ثقافت اور تاریخ وغیرہ وغیرہ غیر کشمیری لوگوں تک بھی پہنچ سکے تاکہ وہ کشمیر کے بارے میں اچھی خاصی واقفیت حاصل کر سکیں۔

اس کے علاوہ وہ 1954ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر میں بحیثیت منادی چار سال تک کام کرتے رہے۔ ریڈیو کشمیر میں چار سال تک نوکری کرنے کے بعد ایک سیاسی سازش میں قید کیے گئے اور 1960ء میں رہا ہونے کے بعد صحافتی

میدان میں ملکی سطح پر کام کرتے رہے اور اس کے بعد 1990ء میں وویس آف امریکہ، جرمن ریڈیو، سکائی نیوز ٹی وی لندن سے وابستہ ہوئے، اور 1992ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے بھی کشمیر میں نمائندے کے طور پر کام کرتے رہے۔ کشمیر میں جب بھی کوئی سیاسی، سماجی، تہذیبی مسئلہ اُٹھ جاتا تو خیالؔ اپنے اخبارات اور صحافتی فرائض کے ذریعے مسائل کا ازالہ کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ سماج میں موجود برے رسوم ورواج اور توہم پرستی کے خلاف اپنے اخبارات کے ذریعہ آواز اُٹھائی۔

عراق میں صدر صدام حسین کے دور اقتدار میں ہر سال یوم انقلاب جولائی کے مہینے میں منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر وہ دنیا کے تمام اخبار نویسوں کو بلاتے تھے۔ 1979ء میں ہندوستان سے بھی اخبار نویسوں کا ایک وفد روانہ ہوا۔ جس میں خیال صاحب کو اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ انھوں نے دوسری مرتبہ 1986ء میں عراق کا سفر کیا۔ وہاں دیگر ممالک کے صحافیوں سے ملاقاتیں کیں۔

غلام نبی خیال کو ان کی مختلف تصانیف اور صحافتی کردار پر بہت سی انجمنوں اور حکومتی اداروں سے تقریباً بیس ایوارڈ مل چکے ہیں۔ وہ جموں وکشمیر کے واحد ادیب اور صحافی ہیں جنھوں نے بیک وقت تین زبانوں میں اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ جن میں موضوعاتی مضامین، شاعری، تاریخ، ادب، ادبی تحریکات کا جائزہ، تحقیق وتنقید اور ترتیب وتدوین شامل ہیں۔ ان کی اب تک دو درجن سے زیادہ کتابیں تینوں زبانوں اردو، کشمیری اور انگریزی میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں کشمیری ادب کی سترہ (17) کتابیں، اردو ادب کی نو (9) اور انگریزی ادب کی دو (2) کتابیں شامل ہیں۔

انسان کی زندگی میں کبھی ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جو کہ انسان

کے لیے ظاہر طور پر بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوتے ہیں، جن کو قبول کرنے کے لیے انسان خود کبھی تیار نہیں ہو سکتا ہے۔ کچھ ایسا ہی واقعہ غلام نبی خیالؔ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جب بقول خیالؔ صاحب ان کو ایک جھوٹے الزام میں دو سال تک قید کیا گیا۔ یہاں پر غلام نبی خیالؔ کی صعوبتوں کو بیان کرنا مقصود نہیں۔ چونکہ ان کی زندگی کے یہ دو سال ادبی قد و قامت میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی کشمیر کی سیاست نے غلام نبی خیالؔ کو بھی بہت متاثر کیا، جس کے نتیجے میں انھوں نے کئی نظمیں، غزلیں تخلیق کیں۔

غلام نبی خیالؔ کے گھر کا ماحول اطمینان بخش ہے۔ بڑے ہونے کے بعد ان کے بچے دبئی منتقل ہو گئے، جس کی وجہ سے ان کی اہلیہ رفیقہ بیگم بھی اپنے بچوں کے ساتھ دبئی منتقل ہوئیں۔ غلام نبی خیالؔ کو ہمیشہ ایسے استاد اور دوست ملے جنھوں نے ان کے علمی ذوق کو نکھارا۔ ان کو بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا اور یہ شوق پچھلے ساٹھ سال سے لگاتار بڑھتا جا رہا ہے، جس کا ثبوت ان کی تخلیقات کی شکل میں ہمارے لیے نئے نئے علمی دریچے کھول رہا ہے۔

غلام نبی خیالؔ فیض احمد فیضؔ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فیضؔ کی طرح غلام نبی خیالؔ بھی جیل گئے اور وہاں انھوں نے فیضؔ کا بھرپور مطالعہ کیا۔ اگرچہ وہ خود اقبالؔ سے متاثر ہونے سے انکار کرتے ہیں، لیکن ان کی اقبالؔ پر تصنیف ''اقبالؔ اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' اور اس کے علاوہ ان پر دیگر مضامین سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ علامہ اقبال سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ خیالؔ صاحب ریاست کے ہی مشہور و معروف ادباء و شعراء اختر محی الدین، دینا ناتھ نادم، سوم ناتھ زتشی اور امین کامل کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔

جموں و کشمیر میں 1950ء میں ترقی پسند تحریک رواں دواں رہی اور اس

تحریک میں وادیٔ کشمیر کے تقریباً سبھی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے حصہ لیا۔ اس تحریک کے علمبرداروں میں دیناناتھ نادم، رحمٰن راہی، موتی لال ساقی، امین کامل، اختر محی الدین اور غلام نبی خیال وغیرہ شامل تھے۔

کشمیر کے سیاسی حالات اور مقامی حالات اور موجودہ صورتحال کے اثرات براہ راست غلام نبی خیال پر پڑے ہیں، کیونکہ پچھلے بیس پچیس سال میں جو شعر و شاعری انھوں نے کی، وہ مزاحمتی شاعری ہی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان حالات سے متاثر ہوئے ہیں۔

حقوق انسانی کے لیے انھوں نے براہ راست کوئی جدوجہد نہیں کی ہے۔ البتہ وہ ہیومن رائٹس فورم کے ایک رکن رہے ہیں۔ ملی ٹنسی کی وجہ سے جب بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ یا دیہاتی علاقوں میں لوگوں سے کوئی زیادتی ہوتی تھی تو وہ اراکین جن میں غلام نبی خیالؔ بھی شامل تھے وہاں جاتے اور حکومتی سطح پر اس واقعہ کی تفتیش بھی کرواتے، تاکہ جن لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اُن کو انصاف مل سکے۔

ذرائع ابلاغ کا کشمیر کی ترقی میں اہم کردار ہے۔ چونکہ غلام نبی خیالؔ اس شعبے سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے ابلاغ کے ذریعے کشمیر کی ترجمانی کی ہے اور بلکہ آج بھی کرتے رہتے ہیں۔ اسی کے ذریعے لوگوں کے مسائل کو حکومت کے سامنے رکھا تاکہ ان کے مسائل حل ہوجائیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے نامساعد حالات کو ابلاغ کے ذریعہ ہی بین الاقوامی سطح پر پیش کیا۔

غلام نبی خیالؔ اور کشمیریت کی اگر بات کی جائے تو انھوں نے کشمیری ادب و ثقافت پر بہت سی تخلیقات اور تصانیف پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں تحقیق و تنقید کے میدان میں ''کاروان خیال''، ''خیالات''، ''فکر خیال''، ''اظہار خیال'' اور ''خیال قلم'' لکھی۔ ان سبھی کتابوں میں تحقیقی،

تنقیدی، تاریخی، ثقافتی اور ادبی مضامین شامل ہیں۔ان کی یہ تصانیف کشمیریت کے مطالعہ کے لیے نہایت ہی عمدہ تصانیف ہیں۔ نہ صرف کشمیریت بلکہ جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا، موضوع کی گہرائی پر نظر رکھی اور اپنے نظریہ کی سادگی سے وضاحت کرتے چلے گئے۔

غلام نبی خیاؔل ریاست جموں وکشمیر کے ایک دانشور، صحافی، ادیب، محقق ونقاد بھی مانے جاتے ہیں۔اردو، کشمیری اور انگریزی زبان کے نامور محقق، معتبر نقاد اور صاحب طراز ادیب کے طور پر انھوں نے ادبی حلقوں میں اپنا نام اور خاص مقام حاصل کرلیا۔ تحقیق وتنقید کے شعبے میں اردو کے حوالے سے ان کی حسب ذیل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور انھیں ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔

(1) اقبال اور تحریک آزادئ کشمیر 1997ء

(2) کاروانِ خیال 1998ء

(3) اظہار خیال 2003ء

(4) فکر خیال 2007ء

(5) خیالات 2009ء

(6) خیال قلم 2012ء

ان تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے جائزے سے غلام نبی خیاؔل کی نقادانہ اور محققانہ صلاحیت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ترتیب وتدوین کے میدان میں بھی غلام نبی خیاؔل نے بحیثیت مدون ومرتب تین کتابوں کی ترتیب وتدوین کی ہے۔ جو اس طرح ہیں: خیابان کشمیر 1998ء، فغان کشمیر اور چنار رنگ۔ترتیب وتدوین کے حوالے سے یہ تینوں کتابیں اردو تحقیق میں تدوین وترتیب کے فن پر پوری اترتی ہیں۔اس طرح یہ مرتب شدہ کتابیں اردو تحقیق میں اضافے کا باعث بنیں

اور اردو ادب کا دامن وسیع ہوا، اور اس طرح وہ ایک کامیاب مدون اور مرتب کے ادب کی تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔

صحافت کے میدان میں انھوں نے اعلیٰ مقام پایا ہے اور وہ آج بھی صحافتی فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ وہ بین الاقوامی، ملکی اور ریاستی سطح کے اخبارات میں کالم، مضامین اور اپنا شاعری کلام لکھتے ہیں۔ غلام نبی خیالؔ نے زیادہ تر ترجمے دوسری زبانوں سے کشمیری میں کیے ہیں۔ اس کے علاوہ سر والٹر کی مشہور ومعروف انگریزی کتاب **The Valley of Kashmir** کا بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے جو چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور انگریزی کتاب **Kashmir in Sunlight & Shade** کا بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی اردو کونسل نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس طرح سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام نبی خیالؔ کس نوعیت کے ترجمہ نگار ہیں۔ کشمیر سے اپنی والہانہ محبت کو انھوں نے ادبیت کی چاشنی سے ہم آئینہ کرکے اسے افادیت بخشی ہے۔

غلام نبی خیالؔ نے 1955ء میں کشمیری زبان میں شاعری شروع کی۔ زیادہ تر شاعری انھوں نے مادری زبان میں ہی کی ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان میں ان کی منظوم تخلیقات برصغیر کے جریدوں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی۔ اردو زبان میں انھوں نے زیادہ تر مزاحمتی شاعری ہی کی ہے۔ ان کے کلام میں سادہ لب ولہجہ اور آسان اسلوب پایا جاتا ہے۔ پچھلی دو دہائیوں میں جو خون خرابہ انھوں نے کشمیر میں دیکھا، اُن ہی حالات وواقعات کو اُنھوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

اُردو زبان کے علاوہ انھوں نے کشمیری اور انگریزی زبان میں بھی اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔ کشمیری شاعری کے حوالے سے غلام نبی خیالؔ کی آج تک

پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

پراگاش، لولک پرتو، زنجور ہندساز، الہام، گلزار خیال

اس زبان میں جو شاعری خیالؔ صاحب نے کی ہے، ان کے کلام میں زیادہ تر رومانیت پائی جاتی ہے۔

ترتیب وتدوین کے حوالے سے ان کی کشمیری زبان وادب میں آج تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

سام نامہ، سون ادب، کاشُر نثر، اکہ نندٕن، محمود گامی

اس طرح انھوں نے کشمیری کے مختلف ادیبوں اور شاعروں کے کلام کو مرتب کر کے کشمیری لوک ادب وشاعری میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہی ایک اچھے تدوین وترتیب نگار کی خصوصیت ہے۔

اس زبان میں انھوں نے آج تک چھ کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، جو اس طرح ہیں:

رباعیاتِ عمر خیام، پوٹیکا، ویور، گلزار خیال، میڈیا، کشمیر کی وادی اور کشمیر: دھوپ اور چھاؤں میں۔

اس طرح بحیثیت مترجم ان کی ہمہ پہلو خدمات کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ ایک کامیاب مترجم قرار پاتے ہیں۔ ترجمہ محض ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام نہیں ہے، بلکہ مختلف علوم کی کتب کو پڑھنا، ان سے فیض حاصل کرنا اور مضمون کی روح تک پہنچنا ضروری ہے اور یہ کام خیالؔ صاحب نے بخوبی کیا ہے۔ بحیثیت ایک مترجم ہی نہیں بحیثیت ایک سکالر بھی ان کی تحریروں کو سراہنا چاہیے۔ اس طرح انھوں نے اردو زبان کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی ایک بڑے اور معتبر ترجمہ نگار کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ کشمیری زبان وادب میں انھوں نے تحقیق وتنقید کے

میدان میں آج تک دو کتابیں تخلیق کیں:

(1) گاشرِ منار (2) قلم پارہ

غلام نبی خیال نے ایک اچھے محقق کی حیثیت سے تحقیق وتنقید میں نمایاں کارنامے انجام دئے اور چھان بین، تلاش و تحقیق کے بعد اپنی تحقیق وتنقید کو حتمی انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر کشمیری ادب میں محققین اپنا فرض اسی طرح انجام دیتے رہے تو وہ دن دور نہیں ہے جب کشمیری زبان بھی دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار کی جائے گی۔

غلام نبی خیال عصر حاضر کے ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے اردو اور کشمیری کے علاوہ انگریزی ادب کا دامن بھی نہ چھوڑا۔ انھوں نے انگریزی زبان میں اپنے ہفتہ وار اخبار کے علاوہ آج تک دو کتابیں تحقیق وتنقید کے حوالے سے شائع کیں ہیں:

(1) **Leaves of Chinar**

(2) ***Progressive Literary Movement in Kashmir***

''لیوز آف چنار'' میں سبھی تحقیقی وتنقیدی مضامین کشمیری ادب سے وابستہ ہیں، اور ''پروگریسیو لٹریری موومنٹ اِن کشمیر'' میں کارل مارکس کے سوانح اور کشمیری ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق مضامین شامل ہیں۔ اس ترقی پسند تحریک نے کشمیری ادب میں نیا پن پیدا کیا۔ اس طرح غلام نبی خیالؔ کے ادبی وتنقیدی کارناموں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اہم مقام حاصل ہے۔

غلام نبی خیالؔ اردو ادب کے بڑے ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ اپنا ادبی سفر ایک کشمیری اخبار ''کونگ پوش'' سے 1956ء کے

آس پاس کیا، لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے اردو ادب سے اپنا دامن نہ چھوڑا۔ انھوں نے کشمیری اور انگریزی زبان کے علاوہ اردو ادب میں صحافت اور تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی بہت اہم کارنامے انجام دئے ہیں اور آج کل وہ اس دوڑ دھوپ میں رواں دواں نظر آرہے ہیں۔ ان کے مضامین ملکی وغیر ملکی رسائل اور جرائد کی زینت بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب پر نو کتابیں لکھی ہیں۔ ان سبھی کتابوں کے مطالعے سے اردو ادب میں غلام نبی خیال کے ادبی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اردو ادب کے حوالے سے چھ کتابیں زیر طبع ہیں، جن میں خاص کر ترجمے کے حوالے سے "دی ویلی آف کشمیر" کا اردو ترجمہ جو تاریخ کے لحاظ سے بہت عمدہ کتاب ثابت ہوگی۔ جسے ایک مشہور انگریزی مؤرخ سر والٹر لارنس نے کشمیر کی تاریخ پر لکھا ہے۔ یہ کتاب اردو کونسل برائے فروغ اردو کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں جہاں بھی اردو کے حوالے سے جو بھی سمینار اور پروگرام منعقد ہوتے ہیں، چاہے وہ ساہتیہ اکادمی کے پروگرام ہوں یا کسی اوسٹیٹ کے اردو اکادمی کے پروگرام ہوں، ان سبھی میں غلام نبی خیال کو بطور خاص مہمان یا صدرِ محفل مدعو کیا جاتا ہے، جس کی ایک مثال میں یہاں مدھیہ پردیش کے روزنامہ ندیم کے حوالے سے پیش کرتا ہوں:

"ملا رموزی"، محفل طنز ومزاح

مدھیہ پردیش اردو کے زیر اہتمام 10 اکتوبر 1982 بروز اتوار اکادمی کے زیر اہتمام 7 بجے شام "یادِ ملا رموزی" تقاریب کا تیسرا پروگرام مقامی ٹیگور بھون میں محفل طنز ومزاح منعقد ہورہی ہے، جن میں حضرت فکر تونسوی، یونس ناظم، مسیح انجم، پرویز یداللہ، احمد مہدی، جہانقدر چغتائی، فضل جاوید اور مصطفیٰ تاج حصہ لے رہے ہیں، جہاں مہمان خصوصی کیف بھوپالی ہوں گے اور صدارت کے

فرائض جناب غلام نبی خیال انجام دیں گے۔ یہ خبر تفصیل کے ساتھ **Chronicle** کے 12/ اکتوبر 1982 کے شمارے میں شائع ہوئی۔

غلام نبی خیاؔل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی مجلس عامہ اور ریاستی سرکار کی لائبریریز کی مشاورتی کمیٹی کے رکن بھی ہیں۔ بہر حال اردو ادب کے حوالے سے غلام نبی خیاؔل کی ادبی وصحافتی شخصیت بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔اس طر یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ غلام نبی خیاؔل آج بھی برصغیر کے ادبی حلقوں خصوصاً اردو ادب کے حوالے سے مختلف معنوں میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ جس محفل میں وہ شرکت کرتے ہیں پورے ماحول پر وہی چھا جاتے ہیں۔اس کی مثال ہمیں قمر قدیر صاحبہ ارم کے اس بیان سے ملتی ہے:

''شہر جگر میں شام خیاؔل: 19 فروری 1974ء کی شفق رنگ اجالوں میں ڈوبی ہوئی ایک حسین شام ہے۔مراد آباد کے وسیع ۔ ۔۔ ۔

جناب خیاؔل نے اپنے مخصوص انداز میں اہل مراد آباد کا شکریہ ادا کیا۔

۔ ۔ ۔ ۔ مشاعرہ گاہ بقعہ نور بنی ہوئی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہکشاں عرسہ گیتی پہ اُتر آئی ہے۔ مشاعرہ گاہ کے دونوں جانب بڑے بڑے پردوں پر نہایت خوبصورت تحریریں ''شام خیاؔل'' لکھا ہوا ہے''

ان باتوں کے پیش نظر غلام نبی خیال ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو اردو ادب میں اعلیٰ مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ اردو ادب میں ان کی تصانیف چاہے وہ تحقیق وتنقید کے حوالے سے ہوں یا ترتیب وتدوین یا تراجم ہوں، ان سبھی چیزوں کا بغور مطالعہ کرنے سے غلام نبی خیاؔل کا اردو ادب میں مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں وہ کشمیر کے صفِ اوّل کے نقاد مانے جاتے ہیں۔



غلام نبی خیال

پروفیسر قدوس جاوید

کشمیر محض مقام نہیں ، مرکز بھی ہے۔ علم و آگہی ، تہذیب و تمدن اور رشد و ہدایت کا مرکز ۔ مادی مفاد کے حاشیوں میں گم رہنے والوں کو اس کا احساس کہاں؟ ہزار ہا برسوں پر محیط کشمیری، سنسکرت ، اور فارسی عربی سے لے کر اردو اور جدید کشمیری میں مخطوطات ، ملفوظات ، فرمودات اور مختصر یا طویل علمی ، ادبی تخلیقات کے کیسے کیسے حیات افزا نوادرات کو ہماری بے حسی اور بے خبری کی دیمک چاٹ رہی ہیئے ، کتنوں کو پتہ ہے؟ پھر بھی انگلیوں پر گنے جانے والے جن چند سر پھروں نے ''ستی سر'' کے کشیپ رشی سے لے کر عہد حاضر تک کے تازہ وارداں علم و ادب کی سرگرمیوں کو اپنے عرفان و ادراک کے کشکول میں سمیٹ رکھا ہے ان میں ایک اہم نام غلام نبی خیاؔل کا بھی ہے۔

غلام نبی خیال ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک صحافی ، ادیب ، شاعر ، محقق ، نقاد اور دانشور ہیں ۔ اُردو انگریزی اور کشمیری میں یکساں طور پر لکھتے ہیں۔ چونکہ ان کی تحریریں عام طور پر کشمیری تہذیب و تمدن ، رسوم و رواج ، علوم و فنون اور شعر و ادب کے موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے ان کا شمار گنے چنے ماہرین کشمیریات ، محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ مرغوب بانہالی ، رحمٰن راہی ، شفیع شوق وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے ۔ اسی لئے ہر حلقہ اور طبقہ میں غلام نبی خیال اور ان کی

تحریروں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ خیال صاحب کے علمی و ادبی اعمال کا مفصل تجزیہ محال ہے۔ اک بحرِ بے کراں ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ پھر بھی چند لہروں کو گرفت میں لینے کی کوشش تو کی ہی جا سکتی ہے اس ضمن میں خاص طور پر انکی اُردو تصنیفات ''اقبال اور تحریک آزادی کشمیر'' (1997)، دوسرا ایڈیشن (2003)، تیسرا ایڈیشن (2011)، چوتھا ایڈیشن (2016) خیابان کشمیر (1998) کاروانِ خیال (1998) ظہارِ خیال (2003)، اختر محی الدین (2012) فکر خیال (2007) چنار رنگ (2009)، خیالات (2009) کشمیر کی وادی (2014) خیال قلم (2012) کے علاوہ ارسطو اور فن شاعری، فیض احمد فیض، تلخئی امروز اور شیرینیٔ فردا کا شاعر، منٹو اور کشمیر، مخدوم محی الدین اور کشمیر، مجاز اور کشمیر، جوش اور حفیظ کی کشمیریات، جموں کشمیر میں اردو وغیرہ مضامین پر گفتگو کر کے دیکھتے ہیں۔

''کشمیر کی وادی'' سر والٹر لارنس کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جس کا اردو میں پہلی بار ترجمہ خیال صاحب نے کیا اور اسے اردو کونسل نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ خیال اس وقت ٹنڈیل بسکو کی کتاب **Kashmir: in Sunlight and Shade** کا بھی اردو ترجمہ کونسل ہی کی فرمائش پر کیا ہے اور وہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

غلام نبی خیال کی اس وقت تک انتیس تصانیف چھپ چکی ہیں جن میں کشمیری میں سترہ، اردو میں دس اور انگریزی میں دو کتابیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مقالہ غلام نبی خیال کی اردو کے لیے خدمات کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے لہازا اب خیال صاحب کی اردو تصانیف کا کچھ تفصیلی تذکرہ ہو جائے۔

(1) ''اقبال اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر'': یہ تحقیقی تصنیف جسے ڈاکٹر بشیر احمد نحوی نے ایک 'معرکتہ الآرا' تخلیق قرار دیا ہے پہلی بار کشمیری رائٹرس

کانفرنس سرینگر کی طرف سے 1997 ء میں شائع ہوئی۔اس اہم کتاب میں مصنف نے علامہ اقبال کے بارے میں خاص کر جگن ناتھ آزاد کے اختراعی بیانات اور مفروضوں کو رد کر کے دستاویزی ثبوت کے ساتھ حقائق کو منظر عام پر لاکر علامہ کے حوالے سے متنازعہ فیہ باتوں سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ خیال صاحب نے دستاویزی ثبوت کے ساتھ آزاد کی اس اختراع کو رد کہ کشمیری سیاستدان شیخ عبداللہ کو علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اقبال اکیڈیمی لاہور پاکستان نے اس کا دوسرا ایڈیشن 2003ء میں شائع کیا اور اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن خیالات پبلشرس سرینگر کی طرف سے 2011ء میں منظرِ عام پر آیا۔ چوتھا ایڈیشن گلشن پبلشرس سری نگر نے 2016ء نے منظر عام پر لایا۔

(2) کاروانِ خیال: مصنف کی ایک ضخیم تصنیف ہے جس کی مثال احمد ندیم قاسمی نے اس کے پیش لفظ میں ''ایک ایسے چمن زار سے دی ہے جس میں اُن تمام رنگوں کے پھول کھل رہے ہیں جواب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آتے ہیں''۔ موضوع کے تنوع نے خیال صاحب کی اس خوبصورت تخلیق کو ایسی بوقلمونی عطا کی ہے کہ قاری کے دل اور دماغ کو اس کتاب کی رنگارنگی پے در پے روشنیوں سے منور کرتی چلی جائے گی اور جب وہ اپنا مطالعہ مکمل کر چکے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کے وجدان وادراک ایک تازہ ہوا کے جھونکوں سے لہلہا اٹھے ہیں''۔ چارسو انتالیس صفحات پر مشتمل اس تصنیف کا سرورق پاکستان کے مشہور مصور اسلم کمال نے بنایا ہے۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہیں جن میں پہلے باب میں کشمیر کی ثقافت، ادب وتاریخ، صحافت اور

دیگر موضوعات پر نہایت مفید مضامین درج ہیں۔ دوسرا حصہ خیال صاحب کی تحقیقی کاوشوں کا ماحصل ہے جس میں خاص طور پر غنی کشمیری، اقبال، حافظ، گویٹے، ارسطو، عمر خیام وغیرہ کی حیات اور فن پر مضامین درج ہیں اور تیسرے باب میں خیال صاحب کے نام مشاہیر کے خطوط شامل ہیں۔ یہ کتاب سولہ صفحات کی تصاویر سے بھی مزین ہے۔

(3) خیابانِ کشمیر میں خیال صاحب نے للّہ عارفہ اور شیخ نورالدین ریشی سے لے کر ہم عصر کشمیری شعراء کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ مرتب کیا ہے جو کئی پختہ مشق مقامی ادیبوں کا کیا ہوا ہے۔ یہ منفرد کتاب کشمیر کلچرل اکیڈیمی نے 1998ء میں شائع کی ہے۔

(4) فغانِ کشمیر: تحریک آزادیٔ کشمیر سے متعلق اُن منظومات کی شیرازہ بندی جو ہندوپاک کے شعرانے وقتاً فوقتاً قلم بند کی ہیں۔ان شعرا میں مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال، جوش ملسیانی، محمد دین فوق، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، خلیفہ عبدالحکیم، مجاز لکھنوی، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

(5) اظہارِ خیال: یہ بھی تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا ایک گل دستہ ہے جس میں مخدوم اور کشمیر اور ٹیگور اور کشمیر جیسے موضوعات پر پہلی بار قلم اٹھایا گیا ہے۔ یہ تصنیف 2003ء میں شایع ہوئی ہے۔

(6) خیالات : انیسویں صدی کے وسط سے لے کر خیال صاحب نے کشمیری میں شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ب میں تحقیق وتنقید کے حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے۔ خیالات اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ اس مجموعے میں کتھا سرت ساگر، راج ترنگنی، قدیم یونان

کا کلاسیکی ڈرامہ، ذکر رومی، جنگ آزادیٔ ہند اور کشمیری ادب جیسے عنوانات کے مضامین درج ہیں۔ خیالات کی اشاعت کشمیری رایٹرس ایسوسی ایشن کی طرف سے 2009ء میں ہوئی۔

(7) فکرِ خیال: مصنف کا ایک اور مجموعہ مضامین ہے جس کے چند مندرجات میں قدیم کشمیری شاعری میں تصوف اور بابا فرید، کشمیری شاعری پر ہندو دیومالا کے اثرات، اردو ادب میں کشمیر کی غلط تصویر کشی، رابرٹ تھورپ۔ کشمیر کا جان نثار ہمدرد، حاتم کی کشمیری کہانیاں، میرا زنداں نامہ، کشمیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک، حضرت امیر خسرو اور ہندوستانیت، لالہ رخ۔ کشمیر کی ایک رنگین داستانِ حرم جیسے دلچسپ مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب جے اینڈ کے رایٹرس ایسوسی ایشن سرینگر نے 2007ء میں منظر عام پر لائی ہے۔

(8) چنار رنگ: 368 صفحات پر محیط یہ تخلیق اس لحاظ سے ایک منفرد مجموعہ ہے کہ اس میں جنتِ ارضی یعنی سرزمین کشمیر کی مدح خوانی میں تحریر کردہ منظومات کو مجتمع کیا گیا ہے جن میں فارسی اور اردو کے شعراء کی تخلیقات نے اس گلدستہ کو آراستہ کیا ہے۔ خیال صاحب اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ ''کشمیر اپنے قدرتی حسن اور دل فیب نظاروں کی وجہ سے سارے عالم میں، مشہور ہی نہیں بلکہ منفرد مقام بھی رکھتا ہے۔ ماضی میں اور آج بھی یہ رشکِ بریں خطۂ ارضی اپنوں پرایوں سبھی کے لیے باعث کشش رہا ہے۔ جو بھی یہاں آیا ہے اسے اس سرزمین کی کوئی نہ کوئی خصوصیت، خوبی یا انوکھاپن بھایا ہے اور اس مسحور کن صورت حال کو اس نے قبائے سخن پہنا کے پیش کیا ہے۔ اس طرح اس نے ایک وسیع چمنستان کی صورت اختیار کی جس میں رنگارنگی بھی ہے

اور بوقلمونی بھی۔ اس میں اظہار بیان کی ندرت بھی ہے اور تخیل کی بلندی بھی۔ اس قابل فخر سرمائے کو جب ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کی جائے تو وہ ''چنار رنگ'' کا روپ اختیار کر لیتا ہے''۔ اس میں ایک سو اکتیس شعرا کی منظومات شامل ہیں اور اسے ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے 2010ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کا آغاز فارسی اور اردو کے ان لافانی اشعار سے کیا گیا ہے:

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ بہ بال و پر آید (عرفی)

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے (چکبست)

(10) خیال قلم: 480 صفحات پر مشتمل یہ کتاب خیالؔ صاحب کی ایک اہم اور قابل قدر تخلیق ہے جس میں پہلی بار چند ایسے مقالات موجود ہیں جو اردو دنیا میں پہلی بار قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان میں سے گویٹے اور دیوان مغربی، جوش اور حفیظ کی کشمیریات، رومی اور ان کے ہم عصر مشاہیر، شورش کشمیری کا زور خطابت، اردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی، انگریزی اور کشمیری کا لین دین اور مقبول فدا حسین جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ کتاب چالیس سے زیادہ دلکش تصاویر سے مزین ہے۔ اسے 2012ء میں میزان پبلشرس سری نگر نے شائع کیا ہے۔

(10) کشمیر کی وادی: ایک مشہور مغربی مفکر اور تاریخ دان سر والٹر روپرٹ لارنس کو کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور میں کشمیر بلایا گیا

اوران سے سرکاری سطح پر درخوات کی گئی کہ وہ وائ کشمیر میں زرعی زمین کی جمع بندی کرانے کا منصوبہ ہاتھ میں لیں، اس دوران لارنس کو ساری وادی کے اطراف و اکناف میں گھومنے کا بھرپور موقعہ ملا اور پھر انھوں نے کشمیر کی تاریخ، سماجیات، ثقافت، مذہب، توہمات اور زندگی سے وابستہ دیگر امور کا غایرانہ مطالعہ کر کے ایک عدیم المثال کتاب **The Valley of Kashmir** تصنیف کی جو 1895 میں شائع ہوئی۔

ہندسرکار کی اردو کونسل نے خیاؔل صاحب کو اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کا کام تفویض کیا جو کم و بیش دس سال میں مکمل ہوا۔ کونسل نے تقریباً چھ سو صفحات کی اس کتاب کو پنتالیس تصاویر کے ساتھ ''کشمیر کی وادی'' کے نام سے 2014ء میں شائع کیا اور اس کی قیمت صرف 217 روپے رکھی گئی ہے۔

خیال صاحب کو اب تک بیس اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا ہے جن میں کشمیر کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ (1974 , 2013) ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ (1975)، بہار اردو اکیڈیمی ایوارڈ (2014) اور جموں و کشمیر سرکار کا ایوارڈ (2013) بھی شامل ہیں۔

خیاؔل صاحب کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے 1965 میں پہلا کشمیری اخبار وطن جاری کیا جو برابر تین سال تک شائع ہوتا رہا۔ 1968 میں انھوں نے ہفت روزہ اقبال شروع کیا جو بعد میں روزنامہ میں تبدیل کیا گیا۔ آج کل وہ انگریزی ہفتہ وار اخبار ''وویس آف کشمیر'' چلا رہے ہیں جو مئی 2003ء سے باقاعدگی سے اشاعت پذیر ہے۔

غلام نبی خیاؔل کشمیر کے وہ واحد ادیب ہیں جن کی تخلیقات ہندو پاک کے سب سے زیادہ رسائل و جرائد میں شایع ہو چکی ہیں جن میں آج کل (دہلی)،

بیسویں صدی (دہلی)، نگارش (امرتسر)، پگڈنڈی (امرتسر)، راہی (جالندھر)، انشا (کلکتہ)، تحریک (نئی دہلی)، تعمیر (سری نگر)، راوی (لندن)، روبی (دہلی)، سب رس (حیدرآباد)، شب خون (الہ آباد)، شاعر (بمبی)، شیرازہ (سری نگر)، صبا (حیدرآباد)، صدا (لندن)، فکر و تحقیق (نئی دہلی)، معاصر (لاہور)، جہات (سرینگر)، حکیم الامت (سری نگر)، جوش بانی (الہ آباد)، کسوٹی جدید (سمستی پو)، ماہِ نو (لاہور)، نیا دور (لکھنو)، نیا سفر (الہ آباد)، ندائے ملت (لاہور)، قومی ڈائجسٹ (لاہور)، اردو دنیا (نئی دہلی)، زندگی (لاہور)، اسباق (ناگپور) نگینہ (سری نگر)، تریاق (بمبی)، فنون (اورنگ آباد) بازیافت (سری نگر) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غلام نبی خیال 4۔مارچ 1939 سرینگر کشمیر کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔کشمیر یونیورسٹی سے انھوں نے اعلیٰ تعلیمی سندیں حاصل کیں۔سن ساٹھ کی دہائی میں انھوں نے کشمیر اورینٹل کالج سرینگر میں لکچرر کے فرائض انجام دئے اس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں انھوں نے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے طلبا کو تربیت دی۔غلام نبی خیال نے اپنی ادبی وصحافتی زندگی کا آغاز اخبار نویسی سے کیا۔ 1950 میں انھوں نے کئی رومانی افسانے لکھے۔ بعد میں مرزا عارف کے ساتھ مل کر ایک ادبی رسالہ گلریز جاری کیا۔اس کے علاوہ وہ ہفتہ وار ''محاذ'' کے بھی ایڈیٹر رہے اور محاذ کا یادگار ''شیر کشمیر نمبر'' شائع کیا۔

غلام نبی خیال کا خیال ہے کہ '' آزادی کشمیر کی تحریک'' کے آغاز وارتقا میں علامہ اقبال کے افکار ونظریات کا بھی اہم کردار رہا ہے 1909 میں کشمیر کے مشہور مورخ، محقق اور نقاد محمد الدین فوق نے اہل کشمیر کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے لاہور میں ایک انجمن ''مسلم کشمیری کانفرنس'' کے نام سے قائم کی تھی۔اس کانفرنس کو علامہ اقبال کی بھی حمایت حاصل تھی۔لیکن کچھ عرصہ کے

بعد کشمیر کانفرنس کی سرگرمیاں تھم گئیں لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب اہل کشمیر کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ ختم ہونے کے بجائے اور شدت اختیار کرنے لگا تو کشمیر میں ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اور آخر کار یہ احتجاج باضابطہ طور پر تحریک آزادی کے سانچے میں ڈھل گیا۔

علامہ اقبال نے تحریک آزادی کشمیر کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ 1931 میں جب لاہور میں ''کشمیر کمیٹی'' بنائی گئی تو علامہ اقبال کو اس کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ اس کمیٹی نے علامہ اقبال کی صدارت میں تحریک آزادی کشمیر کی بھرپور حمایت کی اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی ''آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس'' کی سرگرمیوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ اقبال نے شیخ محمد عبداللہ اور کشمیری قوم کو مخاطب کرتے ہوئے واضح لفظوں میں کہا:

توڑ اس دست جفا کیش کو یارب جس نے

روح آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

محمد الدین فوق نے جب اپنا رسالہ ''کشمیری میگزین'' جاری کیا تو اقبال نے کشمیر کی جنگ آزادی کی حمایت میں چند ایک مضامین بھی لکھے تھے۔ بعد میں یہ مضامین بشیر احمد ڈار نے پاکستان میں اور جگن ناتھ آزاد نے کشمیر میں شائع کیے۔ محمد الدین فوق اور علامہ اقبال دونوں کشمیری الاصل تھے۔ دوست بھی تھے۔ اور دونوں کو کشمیر اور کشمیری قوم سے عشق تھا۔ چنانچہ محمد الدین فوق نے جب ''رہنمائے کشمیر'' کے نام سے ایک کتابچہ لکھا جس میں کشمیر کے تاریخی کوائف، جغرافیائی محل وقوع، ثقافتی پس منظر اور قابل دید مقامات کو اس خوبی سے بیان کیا کہ علامہ اقبال کے دِل میں کشمیر جانے کی آرزو بھڑک اُٹھی۔ اور علامہ اقبال نے فوق کو ایک خط لکھا جس کا ذکر غلام نبی خیال نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔ فوق کے نام اقبال کا مذکورہ خط اس طرح ہے۔

ڈیئر فوق:

السلام وعلیکم۔آپ کا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ کشمیر اور اہل کشمیر پر لکھ کر آپ نے اہل کشامرہ اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا یہ رسالہ ’’رہنمائے کشمیر‘‘ جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے۔نہایت مفید اور دِلچسپ ہے۔طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔افسوس ہے کہ میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا اس سال اُمید ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی اُدھر کھینچ لے جائے‘‘۔

علامہ اقبال جون 1921ء میں کشمیر آئے اور نشاط باغ میں قیام کیا۔ آزادئ کشمیر سے وابستہ رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں،صورت حال کا جائزہ لیا اور کشمیر کی زبوں حالی کے موضوع پر ایک فارسی نظم ساقی نامہ لکھی ۔اس نظم کے منفی اور مثبت اثرات کے بارے میں غلام نبی خیال نے ’’خیالات‘‘ میں تفصیل سے بات کی ہے۔

غلام نبی خیال نے کشمیر کی تحریک آزادی میں اقبال کے کردار کے حوالے سے تحریک آزادی کشمیر کے بانی شیخ محمد عبداللہ کا ذکر بھی بار بار کیا ہے۔خود شیخ محمد عبداللہ نے بھی آتش چنار میں اقبال کے تئیں اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہئے۔خیال نے اپنے مضامین میں کشمیری،اُردو اور عالمی ادب کے مشاہیر کے فکر وفن پر بھی تبصرے کئے ہیں۔شیخ محمد عبداللہ کے انتقال کا بیان جس انداز میں کیا ہے اس سے غلام نبی خیال کے اسلوب بیان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ’’....ستمبر 1982ء کے اوائل میں جب وادی کشمیر کے جان نثار دہقان خون اور پسینہ سے سینچی ہوئی دھان کی لہلہاتی بالیوں کو اپنے کھیتوں میں پر اُمید نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔جب خیابانوں اور گلستانوں کی روش روش سے فضا میں

تحلیل ہونے والی رنگا رنگ اور گوناگوں پھولوں کی مہک
سارے ماحول کو عطر بنا رہی تھی اور جب وسیع وعریض باغوں
میں سرخ سیبوں سے لدی ہوئی، درختوں کی ٹہنیاں سرخوشی
اور سرمستی میں جھوم رہی تھیں تو وادی کشمیر پر ایک قیامت
ٹوٹ پڑی''۔(1)

یہ انداز بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ اگر غلام نبی خیال کی تخلیقیت (Creativity) کے دھارے بہ یک وقت، کشمیری، اردو، اور انگریزی میں تقسیم نہ ہوتے اور ان کا قلم مثلاً اردو کے رخ ہی کی طرف سربسجود ہوتا تو یقیناً غلام نبی خیال صاحب طرز نثر نگاروں کی صف میں کچھ اور نمایاں نظر آتے۔اس صاحب اسلوب دانشور نے اُردو تحقیق کے میدان میں جو کارنامے انجام دئے ہیں ان سب کا احاطہ کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔لیکن چند ایک مثالوں پر ہی اکتفا کیجئے۔

کشمیر کی اولین تاریخ۔ پنڈت کلہن کی ''راج ترنگنی'' آج بھی ایک متنازعہ تصنیف ہے۔ غلام نبی خیال نے راج ترنگنی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''کلہن پنڈت کشمیر کا ایک ممتاز مورخ اور شاعر ہے۔اس کا باپ چمپک راجہ ہرش (1089-1107ء) کے دور میں دوارپتی یا سرحدی گذرگاہوں کا کماندار تھا.... جب راجہ کی وفات (1127ء) کے بعد جئے سمہا نے حکومت سنبھالی تو کلہن کو درباری شاعر بنا دیا گیا، اس طرح اسے راج ترنگنی لکھنے کا موافق ماحول میسر ہوسکا جو اس نے 1248 سے لے کر تقریباً دو سال کے عرصہ میں مکمل کرلی...راج ترنگنی کے بارے میں کلہن نے خود واضح طور پر کہا ہے کہ اس نے یہ کتاب لوککا (Laukika) کے عہد کے 4224 ویں سال یعنی 49-1248 میں

لکھنی شروع کی اور اگلے سال اس کام کو مکمل کر لیا''۔(2)

افسانوی ادب کی ابتدائی ہندوستانی کتابوں میں سے ایک ''کتھاسرت ساگر'' (مصنف، سوم دت) کے بارے میں غلام نبی خیال کا تفصیلی تحقیقی مقالہ ایک کارنامہ ہے۔ اپنے مقالہ ''ہنٹن نوولز۔ کشمیر کی لوک کہانیوں کا اولین ترتیب کار'' میں خیال نے اول تو انگریز پادری جے ہنٹن نوولز کا تعارف پیش کیا ہے اور پھر ''کتھاسرت ساگر'' کے بارے میں اپنے تحقیقی اور تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

روایت یہ ہے کہ سوم دیو کی کتھاسرت ساگر دنیا کی اولین لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ تھا جس میں اس کشمیری قلم کار نے لاکھوں اشعار پر مشتمل ہزاروں کشمیری لوک کہانیوں کی شیرازہ بندی کی گئی تھی۔ حاکم وقت نے سوم دیو کی جمع کردہ کہانیوں کے اسلوب پر تنقید کی جس کے ردعمل میں سوم دیو نے کہانیوں کے اس ذخیرے کو نذر آتش کر دیا۔ پھر بھی جو کچھ بچا اسے جمع کر کے کتھاسرت ساگر کو مرتب اور شائع کیا گیا۔ اُس نے اپنے فرقہ کی رسم کے مطابق اپنے نام کے ساتھ دیو کا اضافہ کیا۔

سوم دیو نے اپنی ضخیم کتھاسرت ساگر یعنی ''کہانیوں کا سمندر'' 1070 کے آس پاس مکمل کر لی جس میں حکایات، پریوں کی کہانیاں اور لوک کتھائیں شامل ہیں۔

کتھاسرت ساگر، اٹھارہ جلدوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نثری عبارت کے علاوہ اکیس ہزار اشعار درج ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سوم دیو کی تخلیق میں لاکھوں اشعار درج تھے۔ اس تصنیف میں مرکزی کہانی نرواہن دیوتا کے بارے میں ہے جو حکایاتی بادشاہ اُدیانا کا بیٹا تھا۔

کتھاسرت ساگر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گناڈیہ کی برہت کتھا پر مبنی ہے جسے جنوبی ہند کی پشاچی بولی میں لکھا گیا تھا لیکن بعض محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ برہت کتھا جس سے سوم دیو نے استفادہ کیا پشاچی سے مختلف

تھی۔ کیونکہ کشمیر میں برہت کتھا کے دو متن موجود تھے۔ خیال صاحب کے مطابق ''موجودہ کتھا اٹھارہ جلدوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نثری حصے کے علاوہ بائیس ہزار اشعار درج ہیں ان میں تین سو پچاس سے زائد کہانیاں بیان کی گئی ہیں اس کا حجم ہومر (Homer) کی ایلیاڈ اور اوڈیسی دونوں کو ملا کر بھی ان سے دوگنا بن جاتا ہے۔ ایک تاریخ داں کے مطابق اس کا سال تحریر 1050 عیسوی بتایا گیا ہے۔ یہ عرصہ کھیمیندر کے بعد کا تیس سال کا عرصہ بتایا جاتا ہے''۔

خیال ایک کثیر المطالعہ محقق اور نقاد ہیں انھوں نے سنسکرت، فارسی، انگریزی، کشمیری اور اردو شاعری اور شاعروں کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، فکشن، ڈرامہ، سیاست، ثقافت اور صحافت وغیرہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ کشمیر اور کشمیریت پر کشمیری شعر وادب سیاست اور ثقافت، تاریخ کے جبر، قوم کے صبر وغیرہ مختلف ومتضاد موضوعات پر جتنا لکھا ہے اتنا ان کے معاصرین میں کسی اور نے نہیں لکھا ہوگا لیکن اس کے باوجود غلام نبی خیال کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات پر ان کے معاصرین، مقلدین یا اساتذہ نے تفصیل سے لکھنے کی زحمت نہیں کی ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے۔ البتہ اب ایک نوجوان قلم کار ڈاکٹر رفیق احمد بانڈے نے ''غلام نبی خیال، شخصیت اور فن'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔

خیال صاحب عالمی اردو ٹرسٹ کے ریاستی چیرمین بھی ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے 2014ء میں اپنی ذاتی بچت سے چند نوجوان ادیبوں، صحافیوں اور گلوکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں پانچ پانچ ہزار روپے کے نقد انعامات سے نوازا۔ انعام یافتگان میں شاداب بشیر (سری نگر ٹائمز)، میر شبیر (ای ٹی وی اردو)، شازیہ بشیر (گلوکارہ)، مہاراج کشن سحر گاندربلی (ادیب)، غلام نبی شاہد

(افسانہ نگار)، سلیم سالک (ادیب) محی الدین زور (محقق) اور نگہت صاحبہ (شاعرہ) اور 2015 کے انعام پانے والوں میں واجدہ تبسم (افسانہ نگار)، منوج کول (ای ٹی وی اردو)، صبا شاہین (شاعرہ)، سیدہ نسرین (شاعرہ)، بہاری کاک (اداکار) اور شہناز رشید (شاعر) شامل تھے۔

غلام نبی خیال نے پیر رومی، اقبال، جوش، فیض، غلام رسول نازکی اور منٹو وغیرہ پر بھی تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں،۔احمد ندیم قاسمی اور غلام رسول سنتوش پر خیال کے شخصی مضامین کے علاوہ کشمیر سے متعلق کئی مغربی دانشوروں اور ان کی تصنیفات کے حوالے سے بھی متعدد مضامین لکھے ہیں۔جن میں سے بیشتر ان کے اُردو مضامین کے مجموعوں میں شامل ہیں۔

دراصل غلام نبی خیال نے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کے ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے لیکن ابھی تک ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔

حوالہ جات:

(1) بحوالہ۔جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین ۔از۔جان محمد آزاد، ص153 ناشر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، 2004ء

(2) شیرازہ ۔ جموں کشمیر اور لداخ نمبر، ناشر کلچرل اکیڈمی سرینگر، جلد 45، شمارہ 8 تا 11، ص104-105



خیال صاحب

ایک نابغہ روزگار قلم کار

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

غلام نبی خیال کی ادبی زندگی کا آغازِ سفر 1951ء میں نو عمری سے ہی شروع ہوا، جب کہ ان کی پہلی تصنیف 1959ء (لولُک پرتو، کشمیری شعری مجموعہ) میں منظر عام پر آگئی۔ تب سے لے کر آج تک یکے بعد دیگرے ان کے متعدد انگریزی، اُردو، کشمیری مضامین کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیق، ترجمہ و تالیف کردہ تیس (30) کتابیں (نظم و نثر میں) انگریزی، اُردو اور کشمیری میں منصۂ شہود پر آکر دادِ تحسین وصول کر پائیں اور آج کل ہمیں ان کی کشمیر کی تاریخ پر انگریزی میں ایک مبسوط کتاب **My Story My Kashmir** کی آمد آمد ہے۔

خیال صاحب بنیادی طور پر ایک آزاد خیال صحافی ہیں (3-4)۔ بقول ہنری ہیوم اور لارڈ کیمس کے:

Every man who attends to his own ideas, will discover order as well as connexion in their succession.(5)

ان کے زیر ادارت کئی اخبارات اور رسائل اپنا لوہا منوا چکے ہیں اور اس وقت بھی وہ ایک ہفتہ وار اخبار **Voice of Kashmir** کے مدیر مسئول ہیں۔

اس کے علاوہ کئی میڈیا ایجنسیوں سے منسلک ہیں۔ چونکہ ہر کوئی بڑا ادیب سرکاری قید میں رہ کر جینا نہیں چاہتا ہے اور نہ اپنے قلم کو وہ ان کے خیالات کا غلام بنانا چاہتا ہے جس کی لاتعداد مثالیں دنیائے ادب سے ہمیں ملتی ہیں۔ مثلاً ورڈسورتھ، برناڈ شا، ٹی ایس ایلیٹ کو ہی لے لیجیئے یا پھر علامہ اقبال کی زندہ مثال ہمارے پاس موجود ہے۔ غرض کہنے کا یہ ہے کہ خیال صاحب بھی ایک زمانے میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں سرکاری نوکری سے منسلک تھے، مگر اُن کی آزاد خیالی نے انھیں وہاں زیادہ دیر تک جمنے نہیں دے دیا اور وہ بھی ایلیٹ کی طرح نوکری سے الگ ہو کر کل وقتی ادیب "Full time Writer" بن گئے۔

غلام نبی خیال کو اُردو انگریزی اور کشمیری زبانوں پر یکساں دست رس حاصل ہے اور انھوں نے عمر خیام کی رُباعیوں کو کشمیری زبان کے قالب میں ڈھال کر اس زبان پر بھی پورا عبور ہونے کا ثبوت دے دیا۔ تنقید نگاری کے حوالے سے یہاں مولانا محمد حسین آزاد کی رائے خیال صاحب پر بھی صادق آجاتی ہے، جس میں انھوں نے کہا تھا:

''اردو کا بہترین نقاد وہ ہوگا جس کی دونوں آنکھیں روشن ہوں گی'' (6)

چونکہ زیرِ نظر تصنیف ''اظہار خیال'' سے قبل راقم کو ان کی دو اور اہم تصانیف ''گاشری مُنار'' اور ''کاروان خیال'' نے بھی کافی متاثر کیا ہے، اس لئے پہلے ضمناً ان دونوں کے حوالے سے کچھ کہنا یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں اور یہ بات بھی واضح رہے کہ ''اظہار خیال'' اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس سلسلے کے تحت مذکورہ بالا دونوں کتابیں معرض وجود میں آگئیں۔

''گاشری مُنار'' کو خیال صاحب نے 1972ء میں شائع کیا اور 1975ء میں ساہتیہ اکادمی نے انھیں اس کتاب پر انعام سے نوازا۔ اس شاہکار کتاب میں انھوں نے دنیا کے گیارہ عظیم شاعروں اور مفکروں (ہومر، رحلّ، کالیداس، امراء

القیس، ڈانٹے، حافظ، شیکسپیئر، گوئیٹے، پشکن، اقبال اور ٹیگور) کی حیات اور اُن کے تفکرات پر مفصل مضامین رقم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''دنیا کے گیارہ عظیم شاعروں پر مضامین کی یہ کتاب دراصل اُس شوق کا ثمر ہے جو مجھے کئی برسوں سے عالمی ادب کے زیادہ سے زیادہ مطالعے سے پیدا ہو گیا ہے''۔(7) بے شک ''گاشرِ مُنار'' مصنف کی اُس داخلی اضطراب کا مظہر ہے جو عالمی ادب اور بڑے بڑے حکماء کے گہرے مطالعے سے ہر سنجیدہ فکر ادیب کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ خیال صاحب نے یہاں کسی نئے فلسفے کو فروغ دینے کی کوئی کاوش نہیں کی۔ البتہ اپنی مادری زبان میں موجودہ مواد میں ایک اہم اضافہ کیا اور کشمیری زبان میں لکھنے والوں کے لیے ایک نئی تحریک بخشی ہے۔ یہاں یہ بات بھی میں وثوق سے کہتا ہوں، چونکہ 1975ء میں جب یہ کتاب قومی سطح پر انعام کے لیے منتخب کی گئی، ٹھیک اُسی سال برصغیر ہندو پاک کے ایک عظیم اُردو محقق نقاد جمیل جالبی نے بھی ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' مغربی مفکرین پر مضامین کا ایک ایسا ہی مجموعہ شائع کیا۔ چونکہ اُردو زبان کا دائرہ کشمیری زبان سے کافی وسیع ہے، اس وجہ سے جالبی صاحب کی کتاب زیادہ مقبول ہوئی اور خیال صاحب کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن کشمیری زبان کے کم قارئین کی وجہ سے ابھی تک نہ چھپ سکا، ورنہ موضوع مواد اور معیار کے اعتبار سے ''گاشرِ مُنار'' ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' سے کچھ کم نہیں ہے۔(8)

''کاروانِ خیال'' چونکہ کشمیری ادب و ثقافت پر اُردو زبان میں لکھی گئی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس اعتبار سے ایک تو یہ اپنی الگ انفرادیت رکھتی ہے اور دوسرا یہ کہ کشمیری کے علاوہ اُردو قارئین تک بھی خیال صاحب کے خیالات اس کتاب کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔(9) یہ کتاب تین حصوں میں منقسم کی گئی ہے۔

پہلے حصے کے ۱۳ مضامین کشمیری زبان وادب اور اس کے دیگر مسائل سے متعلق ہیں اور دوسرے حصے میں کشمیر کی ثقافت کے ساتھ ساتھ ۱۱ متفرق موضوعات پر مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے تیسرے حصے میں خیالؔ صاحب نے 100 کے قریب وہ خطوط شامل کیے ہیں جو پچھلے کئی برسوں سے ان کے رفقاء اور احباب نے انھیں ارسال کئے ہیں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ادب میں خطوط نگاری کو ایک الگ صنف کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ خطوط اکثر وبیشتر نجی ہوتے ہیں۔ ادبی خط ہمیں اس دور کا وہ سارا سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ پیش کرتا ہے جو کہ ہمیں ایک تاریخ کی کتاب سے بھی ملتا ہے۔ جس کی مثال اُردو میں ابوالکلام آزاد کے خطوط (غبارِ خاطر) غالبؔ کے خطوط (عودِ ہندی اور اُردو معلیٰ) یا پھر انگریزی میں برونگ و دیگر شاعروں کے خطوط ہمیں ملتے ہیں۔ کاروانِ خیال کا یہ حصہ 1950ء کے بعد ادبیات کشمیر پر کام کرنے والے ریسرچ سکالروں کے لئے کافی معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

ستمبر 2003ء میں بنا کسی دکھاوے کی محفل یا سستی تشہیر کے غلام نبی خیال کی تصنیف ''اظہارِ خیال'' منظر عام پر آ گئی۔ عمدہ کاغذ، بغیر کسی خاص گیٹ اپ، کتابی سائز، اچھی خاصی چھپائی، 103 صفحات پر پھیلے ہوئے 9 مقالات پر مشتمل کتاب کی قیمت اس مہنگائی کے دور میں صرف 100 روپے ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل کیے گئے نو مضامین میں سے سات مضامین ہمیں براہ راست کشمیری ادب، ثقافت اور تاریخ کے کچھ نئے نئے گوشوں سے روشناس کرواتے ہیں اور باقی دو مضامین جنوبی ایشیا میں اُردو زبان وادب اور فراق اور گنگا جمنی تہذیب'' اُردو زبان کے کچھ خاص تاریخی وتہذیبی اکائیوں کی غمازی کرتے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے میں اُس نظریہ نقد کے بارے میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، جس نظریہ تنقید کے تحت زیر تبصرہ کتاب کے مضامین لکھے

گئے ہیں۔ ادبی نظریات اور تنقیدی اصول وضوابط کوئی قونین فطرت نہیں ہیں کہ ان میں تغیر وتبدل قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو، اندازِ زندگی میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضے اور اجتماعی شعور نت نئے روپ اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اس لیے ادبی شعور بھی نئے سانچوں میں ڈھل کر اگر کاروانِ زیست کے لئے بانگ درانہ بن سکے تو بھی ساتھ دینے کی کوشش یقیناً کرتا ہے۔ زندگی تغیر ہے اور تغیر پذیر معاشرہ ہی ادبی ارتقاپذیری کا باعث بنتا ہے (10)۔

ایک زمانے میں تنقید کا معیار قافیہ ردیف محاورات، صنائع وبدائع، صحتِ زبان، عروض صوتی حسن، ظاہری شکل اور لفظی خوبیوں پر تھا۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلا، لوگوں کے نظریات بدلے، کیونکہ ہر کسی قوم میں ہر طرح کی تبدیلی ایک یقینی بات ہے۔ اُسی طرح ادبی تنقید بھی بدل گئی۔ اس کے مختلف دبستان وجود میں آنے لگے، جیسے تشریحی تنقید، تاریخی تنقید، عمرانی تنقید، رومانی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، سائنٹفک تنقید، مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، تقابلی تنقید، امریکی دبستان تنقید، شکاگو تنقید، تجزیاتی تنقید، نوتنقید، اسلوبیات، ساختیات پس ساختیات، ردتعمیر، اطلاعاتی تنقید اور آج کل "Metacriticism" (یعنی تنقید پر تنقید) وغیرہ وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں تک ہر کوئی بڑا انقاد اپنا اپنا نظریہ تنقید دینے لگا، جیسے جمیل جالبی کی فکری تنقید، وزیر آغا کی امتزاجی تنقید اور حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید ہمارے سامنے زندہ مثالیں ہیں۔ بقول ڈاکٹر شارب ردولوی کے:

> ''ادب کی تعبیر وتشریح کے مختلف نظریئے نظر آتے ہیں۔ کوئی تخلیق کے نفسیاتی پہلو پر زور دیتا ہے، کوئی رومانی، تاریخی، سماجی، جمالیاتی، تاثراتی اور کلاسکی پہلو پر۔ ادب کی ان تمام تشریحات پر بحث کرنے کے لیے بہت سی اُلجھنوں اور

دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے"۔(11)

دراصل ہر بڑا نقاد ایک فن پارے کو پرکھنے یا اس کی تعبیر وتشریح کے لیے اپنا کوئی خاص معیار یا نظریہ مقرر کرتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی پسند یا ناپسند ہی کارفرما ہوتی ہے۔ تو اپنے ہی اصولوں کے تحت وہ اس فن پارے کے متعلق اپنی آراء کو پیش کرتا ہے۔ یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نقاد ایک فن پارے میں کسی خاص چیز کی تلاش کرتا ہے تو وہ کسی تخلیق میں وہ چیز پا کر اس پر اپنا ردعمل پیش کرتا ہے۔ اس طرح بھی تنقید کا ایک الگ نظریہ یا دبستان سامنے آجاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال غلام نبی خیالؔ کا بھی بطور ایک نقاد کے ہوا۔ انھوں نے مختلف ادب پاروں میں زیادہ تر اُن عناصر کی چھان پھٹک کی جن میں "کشمیریت" سرایت کر گئی تھی۔ اس لحاظ سے ہم انھیں اپنے نظریے کے تحت ثقافتی نقاد کہہ سکتے ہیں۔ "اظہار خیال" کے پہلے مضمون میں وہ مختلف حوالے دے کر کہتے ہیں کہ اُردو زبان کا دائرہ اگرچہ جنوبی ایشیا میں زیادہ برصغیر ہندوپاک تک ہی محدود رہا، مگر اس زبان نے آغاز سے لے کر آج تک بے خوف وخطر برصغیر میں انسانی یکجہتی کے کاز کو بڑی تقویت بخشی ہے۔ اس زبان کے سوا یہ کام کسی اور زبان کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا۔ یہ زبان برصغیر کی کلچرل شناخت "Cultural Identity" برقرار رکھنے میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ موجودہ دور میں ہندوپاک کے ماس میڈیا پر اس کا اثر غلبہ رہا۔ البتہ ہندوستانی فلموں کے تیئں ہر کوئی اُردو محبّ اس بات پر سخت نالاں ہے کہ شستہ اُردو فلموں پر سرکاری طور پر ہندی کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔ اس بات کو پروفیسر عبدالمغنی نے بھی اس طرح کہا ہے:

"مرزا غالب" جیسی فلم پر بھی سنسر بورڈ نے ہندی کا نشان لگادیا"۔(12)

خیالؔ صاحب نے 1947ء سے پہلے اور آزادی کے بعد اُردو کی

صورتحال کا جائزہ لے لیا ہے اور غدر کے وقت جو صعوبتیں اُردو اخبارات کو جھیلنی پڑیں یا پھر 1947ء کے بعد جو سیاسی رنگت اُردو زبان کو دے دی گئی، اُس پر انھوں نے بڑے فکر انگیز پیرائے میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں آج کل اُردو زبان کے گھٹتے ہوئے معیار کا رونا بھی رویا گیا۔ آخر پر موصوف نے اُردو دنیا کے ان چند شعراء وادباء کی نشاندہی کی ہے جو کہ ہمارے مادرِ وطن کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔

چونکہ سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے ان شعراء وادباء کے تئیں فاضل مصنف کا جذبہ والہانہ ہے، اس لیے انھوں نے ان پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اگر اس ریاست سے باہر کے کسی شاعر نے کشمیر کے تئیں کچھ بھی لکھا ہے یا ہمارے کسی شاعر نے دنیا کے کسی بڑے مفکر کی کسی قسم کی کوئی تقلید کی ہے۔ خیال صاحب ان عناصر کی بھی نشاندہی اپنے تنقیدی و تحقیقی مضامین میں کرتے رہتے ہیں۔ یعنی وہ ان عناصر کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، جن کی بدولت ایسی تخلیق وجود میں آگئی۔ اس سلسلے کے تحت عبدالسمیع پال آثر صہبائی کے متعلق ان کا دوسرا مضمون زیرِ بحث کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ آثر کشمیری تھے، مگر ان کی پیدائش سیالکوٹ میں ہوئی۔ پھر بھی ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سرکاری نوکری کی حیثیت سے اپنی ہی مادرِ وطن میں گزرا۔ خیال صاحب نے ان کی اُس شاعری کا جائزہ لے لیا ہے جو آثر نے کشمیر کے تئیں لکھی ہے۔ ہندوپاک کی ادبی تاریخ میں ایسے بھی بہت سے اشخاص ہیں جنھوں نے یہاں کے فلک بوس سفید پہاڑوں اور سبزہ زار وادیوں اور شور مچاتی ہوئی آبشاروں سے متاثر ہو کر شاعری کے بیش بہا نمونے تخلیق کیے۔ ان میں فاضل مصنف نے خوشی محمد ناظر اور مخدوم محی الدین پر دو اور مضامین سپردِ قلم کر کے اس کتاب کی زینت کو اور بڑھا دیا ہے۔ چونکہ خیال صاحب زیادہ تر ڈھونڈنے کی

کوشش کرتے ہیں، جس جگہ سے اُس ادب پارے کا خالق تعلق رکھتا ہو۔ جس ماحول کا اثر ایک تخلیق کار کی نس نس میں سرایت کر گیا ہو۔ انگریزی والے اس کو پنتھیوازم اور رومانیت بھی کہتے ہیں۔ ''فراق اور گنگا جمنی تہذیب'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے اُس میں بھی انھوں نے ہندوستانی تہذیب کی نشاندہی کرنے کی سعی کی ہے، حالانکہ باقی مضامین میں وہ کشمیری تہذیب اور ثقافت سے متعلق عناصر کو اُجاگر کر کے اپنی بات کو منواتے ہیں، مگر یہاں چونکہ تنقید کی بات ہے۔ یہ مضمون باقی مضامین سے ان کے نظریہ تنقید سے بالکل مختلف نہیں ہے، خیالؔ صاحب کا نظریہ تنقید پٹری سے نہیں ہٹتا ہے، البتہ کچھ اور منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

تاریخ ادبیات کشمیر میں عبدالاحد آزاد ایک اہم نام ہے، جو ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق بھی تھے اور اُس زمانے میں اُنھوں نے ''کشمیری زبان و شاعری'' ترتیب دے دی، جس وقت یہاں شخصی راج کے خلاف سیاسی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ یہاں آمد و رفت کے وسائل بہت ہی محدود تھے۔ تحقیق کے لیے مواد بھی وافر مقدار میں دستیاب نہ تھا۔ ان کے متعلق ایک مضمون میں خیالؔ صاحب نے ان کی انقلابی شاعری پر روشنی ڈالی ہے، جس میں انھوں نے آزاد کے دور کے بین الاقوامی، ملکی و ریاستی سیاسی کوائف بھی بیان کیے ہیں، جن کی وجہ سے آزاد نے اس قسم کی شاعری کی (13)۔ خیالؔ صاحب لکھتے ہیں:

> ''آزاد نے اس تقسیم کو انسانی اقدار اور بقاء کے لیے ایک ضرب کاری تصور کر لیا۔ چنانچہ اس نے ان خیالات کا اظہار کئی مواقع پر کیا ہے، جن کی رو سے وہ فرقہ وارانہ تعصب اور تنگ نظری میں اس واقعہ کو یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے

کہ ''انسان ایک ہے، دنیا ایک ہے جس طرح گوشت ناخن کے ساتھ پیوست ہے'' (14) چونکہ شاعری کے ساتھ ساتھ آزاؔد کا دوسرا اہم کارنامہ اُن کی تحقیقی کتاب ''کشمیری زبان اور شاعری'' (3 جلدیں) بھی ہے۔ اس کا تجزیاتی مطالعہ خیاؔل صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب پر اب تک اُردو اور کشمیری میں بہت سے مضامین ومقالے لکھے گئے، مگر میرے نزدیک خیاؔل صاحب کا یہ مضمون اس لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس مضمون میں اس سچائی سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جس میں بڑی بے باکی سے اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ اس کتاب کا اصل مسودہ جب ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں تھا تو چند لوگوں نے اس کی تیسری جلد میں کچھ اپنے مقاصد کے لیے قلم زنی کرلی۔ اس رائے سے کشمیری ادب پر کام کرنے والے لوگوں کو اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ اس کتاب کو اور تحقیق کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کریں۔

سعادت حسن منٹو اُردو فکشن میں ایک جانا پہچانا نام ہے اور فخر کی بات یہ ہے کہ اس کا رشتہ بھی کشمیر سے تھا۔ ان کا ہمعصر کرشن چندر ان کے بارے میں لکھتا ہے:

''منٹو جواہر لال اور اقباؔل کی طرح کشمیری پنڈت ہے'' (15)

یہاں خیال صاحب نے مہجوؔر، منٹو اور بلراج ساہنی پر ایک تحقیقی مقالہ شامل کتاب کیا ہے، جس سے اب تک کشمیری محققین کی پیدا کردہ کئی غلط بیانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً منٹو نے شاعر کشمیر مہجور پر پاکستان کے ہفت روزہ ''نصرت''

میں جو مضمون شائع کیا ہے اُس میں انھوں نے مہجورؔ کی جن نظموں کا حوالہ دیا ہے وہ نظمیں دراصل مہجورؔ کی نہیں ہیں۔ البتہ کسی کشمیری نصیر انور نے انہیں اُردو نثر میں خود لکھ کر مہجورؔ کو وقار بخشنے کے لیے پیش کیا تھا۔ اسی طرح دوسرے اہم واقعے کے بھی ٹھوس ثبوت فراہم کر کے اس بات کی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ مہجور پر بلراج ساہنی نے بڑی عرق ریزی سے جو فلم بنائی اُس کے ساتھ پھر کیا ہوا اور ساہنی کا کشمیر کے تیئں جذبہ کیا تھا، اس کے بارے میں ساہنی کے جو خطوط مقالے میں شامل کیے گئے ہیں وہ قابل غور ہیں اور کئی کھوکھلے دعووں کی بنیاد بھی مٹاتے ہیں۔

نوبل انعام یافتہ شاعر وادیب گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور 1915ء میں جگدیش چندر چٹرجی کی دعوت پر کشمیر آئے۔ اپنے قیام اور سیاحت کشمیر کے دوران ان کا پروگرام یہاں کیا کیا رہا، اس سارے پروگرام کی جانکاری بھی اس کتاب کے ایک مضمون ''رابندر ناتھ ٹیگور اور کشمیر'' میں فراہم کی گئی ہیں اور ساتھ ہی دوران سیاحت کشمیر میں جو نظم ''مانسی'' عنوان کے تحت ٹیگور نے لکھی ہے اُس کے چند اہم ٹکڑے بھی آزاد ترجمے کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔

آج اس صبح کی فضا میں اس گلستان کے اندر
شبنم کے قطرے دریا کے کنارے بیدزاروں کو
ہلکی ہلکی دھوپ میں ہلا دیتے اور روشن کرتے ہیں
پھر یہ درخت ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں
اور شاعر کے دل میں ایک ہجوم بن کر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں (16)

یہاں سے جانے کے بعد ٹیگور نے 1916ء میں ''بلاکا'' عنوان کے تحت شعری مجموعہ شائع کیا اور اس میں اُنھوں نے وہ نظمیں بھی شائع کیں جو کشمیر سے متعلق رقم کی تھیں۔ خیالؔ صاحب نے ان ترجموں کا بھی تفصیلاً جائزہ لیا ہے، جو ٹیگورؔ کی تخلیقات کو کشمیری زبان میں کئے گئے۔ ریاست میں اُردو اور کشمیری تنقید

کے حوالے سے اگر بات کی جائے گی تو ہم یہ وثوق سے کہتے ہیں کہ خیالؔ صاحب ادب کو بالکل صاف اور صحیح نظر سے دیکھ رہے ہیں اور جو نظریہ وہ پیش کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ صحیح اور منفرد ہوتا ہے۔ جو بات وہ کہتے ہیں وہ سب سے الگ اور نئی ہوتی ہے۔ وہ بغیر کسی جھجک کے کہتے ہیں۔ کسی خوف کے بغیر کہتے ہیں۔ بڑی بے باکی سے کہتے ہیں جو کہ میرے نزدیک تنقید کا ایک اہم منصب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُن کی ہر تصنیف نہایت باقاعدگی کا تاثر ہمیں دیتی ہے۔ خیالات کی ترتیب، طرز کی صفائی، روانی اور جدت سارے مضامین اور کتاب کی اکائی ان کے عقل سلیم و ہوش کو اُس درجہ پر دکھاتی ہے جو دبستان جموں وشمیر کے کسی دوسرے نقاد کو میسر نہیں ہے، کیونکہ باقی حضرات زیادہ تر روایت کی تقلید کرتے ہیں اور ہم یہ بھی کہیں گے کہ وہ کسی فرمائش کے تحت لکھتے ہیں۔ کسی کو خوش کرنے کے لیے لکھتے ہیں، اس کے برعکس خیالؔ صاحب کے نظریات اور آراء میں ایسی اُپج ضرور ہے جو ان کے معاصرین کو چونکا دیتی ہیں۔ البتہ ہمارے لئے وہ صرف دلکشی ہی نہیں پیدا کرتی ہے بلکہ نئے زاویہ نگاہ سے فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ ایسی مثال ہمیں اُردو ادب میں کلیم الدین احمد کے ہاں بھی ملتی ہے۔ جن کی اُردو ادب میں سخت مخالفت کی گئی ہے، مگر پھر بھی آل احمد سرور اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر کلیم الدین احمد ہمارے چوٹی کے نقادوں میں سے ہیں۔ میں اُنھیں ایک بہت اہم نقاد ہی نہیں، تنقید کا ایک بہت اچھا معلم بھی سمجھتا ہوں۔ نقاد کا کام صرف بُت گری نہیں، بُت شکنی بھی ہے اور کلیم الدین احمد نے بہت بُت توڑے ہیں''۔ (17)

ہمارے یہاں بھی کچھ حضرات ایسے بت کھڑا کرنے کی کوشش کرتے

ہیں، مگر خیالؔ صاحب یکدم ان بتوں پر برس پڑتے ہیں۔ چونکہ وہ بت بامیان کے بُت نہیں ہوتے ہیں کہ ان پر پورا عالم واویلا کرے گا، اس لیے وہ خیالؔ صاحب کی تحقیق وتنقید سے جلدی اپنا وجود مٹا دیتے ہیں۔

خیالؔ صاحب کلاسیکی وجدید ادب پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ تخلیقی قوت بھی خدا نے انھیں قابل رشک بخشی ہے اور تحقیق وتنقید کے فن میں بھی اچھی خاصی مہارت وہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ بنیادی طور پر وہ ایک اچھے صحافی ہیں۔ اس سارے کا فائدہ یہ ہوا کہ اُن کا وژن بہت ہی وسیع ہوگیا جو کہ ایک تنقید نگار کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کے تنقید نگار حضرات کا رویہ اکثر یہ رہتا ہے کہ کسی بڑے مغربی یا مشرقی نقاد کے ایک فقرے کو لے بھاگے اور اس طرح ادرک کی ایک گرہ لے کر پنساری بن بیٹھے۔ (18) مگر فن تنقید ہمیں تحقیق کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ انفارمیشن اور مواد چاہتا ہے اور صحیح معنوں میں اپنی آراء کو تجزیاتی انداز میں پیش کرنے کا تقاضا کرتا ہے، بھاگ دوڑ یہ نہیں چاہتا ہے۔

''اظہار خیال'' کے مطالعے سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب نے جگہ جگہ حواشی وحوالوں اور اشاروں کے ساتھ ساتھ تفصیلات سے بھی کام لے لیا ہے جو اُن کے اچھے خاصے تنقیدی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ خیالؔ صاحب ایک ذاتی اور انفرادی نظریہ کے ساتھ تنقید کے میدان میں اُتر آئے۔ کم وبیش اُن کے تمام معاصرین میں بھی اُسی طرح کے اپنے اپنے نظریات بہ درجہ اُتم موجود ہیں۔ جیسے حامدی کاشمیری، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ابوالکلام قاسمی، وزیر آغا ودیگر چوٹی پایہ اُردو نقادوں میں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی خاص اپنا اپنا نظریہ نقد ہے۔ خیالؔ صاحب کا ہر مضمون اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بالکل نئی نئی باتوں کا پتہ ہمیں دیتا ہے اور اسی وجہ سے نوجوانوں کے لیے اُن کے مضامین بڑی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ البتہ سابق بیانات تو خیالؔ

صاحب کی نئی دریافت کی وجہ سے رد ہوتے جاتے ہیں، تو ایسے بیانات کچھ لوگوں کے لیے تضاد بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں دنیائے ادب میں لاکھوں موجود ہیں، تو اس میں خیالؔ صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ خیالؔ صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ اُنھوں نے کشمیری ادب میں مغربی و مشرقی ادبیات سے استفادہ کرنے کو فروغ دے دیا ہے اور تنقید میں نئے پیمانے استعمال کرنے اور نئے نتائج اخذ کرنے کا تقاضا کیا۔ انھوں نے اپنے تنقیدی اور تحقیقی مضامین میں کشمیری کلچر، ثقافت وغیرہ کو فکری اساس کے طور پر استعمال کیا ہے اور کشمیری زبان وادب کی تنقید کو اس آزادی کے ساتھ برتا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر ان کے ہاں تنقید محض اظہار کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک مقصد بھی بن جاتی ہے، جس مقصد کے تحت وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ادب کا ایک اچھا خاصا معیار ہو اور ہم یورپی ادبیات کو اپنے قالب میں ڈھالیں اور ہمارا ادبی ورثہ Non Kashmiri Readers تک پہنچ جائے، جس کی لاتعداد مثالیں ان کے ہاں موجود ہیں۔ انھوں نے یورپی ادب پر کشمیری میں مضامین لکھے۔ یونان کے کلاسک ڈرامے میڈیا کو کشمیری میں منتقل کیا اور کشمیری ادبیات کا اُردو اور انگریزی میں ایک تو ترجمہ کیا اور ان زبانوں میں کشمیری ادب پر بہت سے مضامین بھی رقم کیے۔ آخر پر خیالؔ صاحب کے بارے میں یہ بھی کہتا چلوں کہ کشمیر کے ادبی اُفق پر ان کا نام کوئی نیا نہیں ہے۔ وہ برسوں سے لکھ رہے ہیں، مگر سوچ سمجھ کر اور پڑھ کر لکھتے ہیں۔ وہ تمام مشرقی و مغربی ادب کی تحریکات اور ادبی کاوشوں سے باخبر ہیں، اسی لیے اُن کی فکر میں ادبی صورتحال کا جائزہ لینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے اور وہ تنگ حلقوں کو توڑ کر وسیع تر پیمانے پر ادب کو پرکھنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ ایک نوجوان قاری خیالؔ صاحب کے مضامین پڑھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف کئی اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لیے وہ تن من اور دھن سے لگاتار

اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہاں کے نوجوان ادیبوں کی نئی پود کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے جاتے ہیں۔

حوالہ جات:

(1) کاروانِ خیال۔ غلام نبی خیالؔ، کشمیر رائٹرس کانفرنس سرینگر 1998ء، ص319

(2) مذکورہ کتاب آج کل خیالؔ صاحب کے ہفت روزہ اخبار **Voice of Kashmir** میں ایک سیریل کی صورت میں شائع ہورہی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ہی کتابی صورت میں شائع کی جائے گی۔

(3) مصنفین ''کاشرہ ادبک تواریخ'' میں خیالؔ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:
ان کی شاعری فیض احمد فیضؔ کی شاعری کی بازگشت ہے۔ ملاحظہ ہو۔
کاشرِ ادبک تواریخ۔ ناجی منصور۔ شفیع شوق، کاشر ڈیپارٹمنٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر 1978ء، ص203

(4) رینہ اپنی تاریخ میں خیالؔ صاحب کے بارے میں رقمطراز ہیں:
Ghulam Nabi Khayal (1938) is one of the most prominent literary personalities of the post progressive period in Kashmir. He has shown his metal in many fields as poet, essayist, literary/journalist, critic, translator-A History of Kashmiri Literature Trilokinath Raina-Sahitya Academy 2002, P 146

(5) Elements of Criticism, Henry Home, Lord Kames Anmol Publications Pvt.Ltd. New Delhi 2000, P4

(6) بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ایک مطالعہ مولف ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 1993ء، ص158

(7) گاشری منار۔ غلام نبی خیال، ادارہ ہفت روزہ اقبال، سرینگر کشمیر 1972ء

(8) راقم الحروف خیال صاحب کو کشیر کا جمیل جالبی کہتا ہے۔

(9) چند مہینے پہلے کی بات ہے کہ میرے ایک دوست محمد شفیع میر ریسرچ اسکالر ایجوکیشن کشمیر یونیورسٹی نے KAS کی تیاری کے دوران ''کاروان خیال'' سے کافی استفادہ کیا ہے۔

(10) تنقیدی دبستان۔ سلیم اختر، اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 1982ء، ص 12

(11) جدید اُردو تنقید اصول ونظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی، اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنو، چھٹا ایڈیشن 1994ء، ص 169

(12) ماہنامہ مریخ پٹنہ۔ مدیر عبد المغنی، جلد 2۔ 21، شمارہ 9 12۔1، جنوری 2003ء، ص 39

(13) یہاں مراد ہند پاک کی تقسیم KY کے فسادات سے ہے۔

(14) اظہار خیال۔ غلام نبی خیال، کشمیری رائٹرس کانفرنس سرینگر، کشمیر 2003ء، ص 68

(15) بحوالہ۔ سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر برج پریمی، مرزا پبلی کیشنز۔ سرینگر 1986ء ص 18

(16) اظہار خیال، غلام نبی خیال، کشمیر رائٹرس کانفرنس سرینگر کشمیر 2003ء ص 109

(17) ادبی تنقید کے اصول، پروفیسر کلیم الدین احمد۔ کے جی سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر نئی دہلی۔ دوسری بار: فروری 1983ء ص: 7

(18) کشمیری ناقدین کے بارے میں راقم نے اس لیے یہ جملہ لکھا ہے کیونکہ شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی نے ''ڈراما روایت اور تجزیہ'' کے عنوان سے اپنا سالانہ رسالہ ''انہار'' 1999ء کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا، تو میں نے سوچا کہ اس سے کچھ استفادہ حاصل کیا جائے، مگر پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس میں میرے موافق انفارمیشن آٹے میں نمک کے برابر ہے، یا آلو، شیرازہ، سون ادب، باوتھ وغیرہ میں شامل تنقیدی مضامین کے پڑھنے کے بعد بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ البتہ کشمیری زبان میں اچھا خاصا تخلیقی ادب لکھا جاتا ہے۔

(ادبی افکار واقدار، وطن پبلیکیشنز، سری نگر، 2013، ص 268-254)



غلام نبی خیالؔ کی مزاحمتی شاعری

رفیق بانڈے

دنیا میں انسان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی سماج کو فرضی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک میں ظالم اور دوسرے میں مظلوموں کی مخلوق رہتی ہے۔ ظالم و مظلوم کے مابین ایک لامتناہی کش مکش کا عمل صدیوں سے ہر ملک، ہر قوم، ہر فرقے اور ہر فرد کے ساتھ گویا اس کی قسمت کا ایک جزوِ لاینفک بن کے رہ گیا ہے۔ بنی آدم کی اسی غیر انسانی تقسیم نے فسطائیت، جبر و اکراہ، بے ایمانی اور بے رحمی کے خلاف باضمیر دانشوروں کو ہر دور میں اور ہر مرحلے پر اپنے قلم کو تلوار کی دھار بنا کر استیصالی قوتوں کو للکارنے کی ترغیب دی اور اس طرح سے ادبیات میں مزاحمتی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ غالباً ادب کی اس صنف نے انھی دنوں میں جنم لیا جب دو بھائیوں ہابیل اور قابیل میں سے ایک نے دوسرے کو شک سے پیدا شدہ مخاصمت کے نتیجے میں قتل کیا۔

تاریخ سے مختلف ادوار میں سماج میں کمزوروں کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کرنے اور سماجی نابرابری کو فروغ دینے کے خلاف سقراط، عیسیٰ اور منصور جیسی عظیم شخصیات کو اپنی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ انسانی عظمت کا پرچم بلند رکھنے کی انھیں یہ سزا ملی کہ وہ دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے اور تاریک راہوں میں مارے گئے۔

حق اور صداقت کا یہ مقابلہ کبھی بند نہیں ہوا۔ سماج کو استحصال سے نجات دلانے کیلئے اُن لاتعداد انسانوں کو بھی بڑی بڑی قربانیوں کے امتحان سے گذرنا پڑا ہوگا جنھیں زیر کرنے کے لئے ظالم قوتیں ہر ہتھکنڈا بروئے کار لاتی رہیں اور خوفِ خدا نے کبھی ان کے ضمیر پر دستک بھی نہیں دی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کئی ملکوں اور کئی زبانوں میں بہرصورت مزاحمتی ادب کا مالا مال سرمایہ موجود ہوگا جو ہمارے دستِ رسائی سے باہر ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر پس ماندہ ملک پر سالہا سال تک طاقتور قوتوں کا جارحانہ قبضہ رہا اور برطانوی نوآبادیاتی راج کے بارے میں تو یہ کہاوت مشہور ہوگئی کہ اس کے زیرِ اقتدار اتنے ممالک تھے کہ ان پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں یہاں ایک افریقی باغی قلم کار وول سوینکا کا ذکر برمحل ہوگا جس نے قید و بند کے دوران The Man Died (اور آدمی مرگیا) نام کی ایک شہرہ آفاق کتاب تخلیق کی جو بالخصوص افریقہ اور بالعموم مغرب میں بہت مشہور ہوگئی۔

برصغیر میں مزاحمتی شاعری کا آغاز برطانوی نوآبادیاتی راج کے دوران اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہوا اور اس انسانی تحریک کے ارواحِ رواں میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، واجد علی شاہ اختر، داغ دہلوی، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، بہادر شاہ ظفر اور اقبال سے لے کر حسرت موہانی تک اور اُس کے بعد رام نراین موزون، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، سردار جعفری، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، حبیب جالب، احمد فراز، مخمور جالندھری، ظہیر کاشمیری، تیغ الہ آبادی، جاں نثار اختر، وامق جونپوری، سکندر علی وجد، معین احسن جذبی، غلام ربانی تاباں اور کیفی اعظمی وغیرہ شامل ہوئے۔ ترقی پسند ادبی تحریک نے اس نوع کی شاعری کو مزید تقویت اور حدت بخشی جب اردو افسانہ نگاروں بیگم رشید جہاں، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ وغیرہ

فسطائیت اور سامراج کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے۔

میر انیس نے جو 1857ء میں انگریزوں کے ظلم و تعدی کے چشم دید گواہ تھے، اُس دورِ جبر و استبداد کی ان اشعار میں مکمل تصویر کشی کی ہے:

کوچے بھی اجڑ جانے سے بے ربط ہوئے ہیں
جو بھاگے تھے سب اُن کے مکاں ضبط ہوئے ہیں
کچھ خوف سے مخفی ہیں گرفتار ہیں کچھ لوگ
بگڑے ہوئے آمادۂ پیکار ہیں کچھ لوگ
کوفے سے نکل جانے پہ تیار ہیں کچھ لوگ
کچھ قتل ہوئے ہیں، بہ سرِ دار ہیں کچھ لوگ

1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی مغربی ایشیا میں امریکی اور برطانوی سامراج کی سازش کے نتیجے کے طور پر عربستان کے بیچوں بیچ اسرائیل نام کی ایک یہودی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اگر دنیا کے نقشے کو غور سے دیکھا جائے تو اسرائیل کی شکل ہو بہو ایک خنجر سے ملتی جلتی ہے اور یہ خنجر آج بھی عرب ممالک کے سینوں میں پیوست ہے۔ مغربی سامراج کی پشت پناہی سے اسرائیل کی تخلیق کے خلاف تاریخی ریاست فلسطین میں مزاحمت کی ایک منظّم تحریک کا پُر زور آغاز ہوا جو آج بھی اس تلخ حقیقت کے باوجود جاری ہے کہ یہودی استبداد کے ہاتھوں لاکھوں فلسطینیوں کو ہلاک کیا گیا ہے اور سرکاری دہشت گردی کا یہ انسان کُش سلسلہ برابر جاری ہے۔

فلسطین کے محبّ الوطن اور انقلابی شاعروں محمود درویش، غاشان کانافانی، توفیق زید، سمیع القاسم، سالم جبران اور فضوہ تقان نے وطن کی آزادی کی خاطر اپنے قلم کو تلوار بنا کر مزاحمتی شاعری کو ایک نئے آہنگ اور اثر انگیزی سے روشناس کیا ہے۔

ہند کی آزادی سے قبل مشرقی پاکستان میں بھی آمریت کے خلاف کئی آوازیں اٹھیں جن میں بنگالی شاعر قاضی نذرلاسلام کی آواز سب سے زیادہ واضع اور نمایاں تھی۔ نذرلاسلام نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں اپنے پُر جوش نغموں سے بنگالیوں کے دلوں میں حریت کا جوش وجذبہ بھر دیا۔ بنگلہ دیش کی اسی نوع کی لڑائی میں بھی اس کے گیت بنگالی قوم کو نیا ولولہ اور نئی جرات بخشتے رہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کی آواز بیٹھ گئی اور ان کی صحت بھی بری طرح بگڑتی ہی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریز حکام نے انہیں ختم کرنے کے لئے انھیں زہر دیا جو آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا رہا۔ بہر حال نذرلاسلام کی مزاحمتی شاعری آج بھی بنگلہ دیش اور بھارتی بنگال میں ہر خاص وعام کی زبان پر ہے۔

کشمیر چونکہ تقسیم ہند کے بعد ہی ایک متنازعہ ریاست کی شکل اختیار کر گیا لہذا یہاں کے حالات نے بھی کسی نہ کسی صورت میں ظالمانہ اور غاصبانہ رخ اختیار کر لیا۔ حکومتوں کی طرف سے برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ ہی عام انسان کے لئے آمرانہ طرز کار اور زبردستی کا عمل اختیار کیا گیا۔ دار وگیر کا یہ سلسلہ بغیر کسی روک ٹوک کے جاری وساری ہے۔

کشمیری زبان میں مزاحمتی شاعری کی باقاعدہ شروعات غلام احمد مہجورؔ نے کی جس نے نام نہاد آزادی کی اصل شکل وصورت کو اسی طرح بے نقاب کیا جس طرح فیض نے اپنی مشہور نظم:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

میں ہند وپاک کی آزادی کے بعد سارے برّصغیر میں خون کی ندیاں بہتی ہوئی دیکھیں۔

مہجور کی طنزیہ نظم ’’ آزادی‘‘ 1947ء کے بعد کشمیر میں قائم کردہ عوامی راج کے کھوکھلے پن پر ایک ضرب کاری ہے۔ مہجور کے علاوہ جن کشمیری سخن وروں

نے مزاحمتی شاعری کے سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ کیا اُن میں عبدالاحد آزاد، عبدالستار عاصی، مرزا عارف، دینا ناتھ نادم، امین کامل، رحمان راہی، نور محمد روشن، غلام نبی عارض اور دینا ناتھ المست کا نام قابل ذکر ہے۔

غلام نبی خیالؔ کشمیری زبان کے وہ منفرد شاعر ہیں جن کے سارے کلام میں مزاحمتی شاعری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خیال صاحب نے اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ہر درد کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ اقتدار اور استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں انسانی اعتبار کو آہنی پنجوں تلے نہ صرف پامال ہوتے دیکھتے رہے بلکہ یہ مسلسل بہیمانہ عمل ان کے محسوسات پر کاری ضربیں لگاتا رہا جس نے ان کے ضمیر کو بار بار عام انسان پر ہونے والے جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کرنے کی تحریک دی۔

خیالؔ صاحب کے اس ردِ عمل کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ جب اُن کی عمر صرف انیس سال کی تھی تو ریاست کی حکومتِ وقت نے انھیں ایک فرضی سیاسی مقدمے میں ملوث کر کے دو سال تک قید و بند کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا۔ ان کے خلاف یہ کارروائی غالباً اس لئے کی گئی کیونکہ انھوں نے سرکار کی طرف سے تحریر و تقریر پر قدغن لگانے اور سیاسی اختلاف کا اظہار کرنے والوں کو طرح طرح سے ہراسان کرنے کے خلاف چند نظمیں لکھی تھیں۔ خیال صاحب کو فروری 1958 سے 1960 تک سری نگر کے سنٹرل جیل میں نظر بند رکھا گیا۔ نظر بندی کے دوران خیال صاحب نے نہ صرف یہ کہ عمر خیام کی فارسی رباعیات کا منظوم کشمیری ترجمہ مکمل کر لیا بلکہ انھوں نے ''زنجورہ ہُند ساز'' یعنی سازِ زنجیر کے نام سے زنداں نامہ کی طرز کا ایک مجموعہ منظومات بھی تخلیق کیا۔

خیال صاحب کی اولین شعری کتاب کا نام ''لولکُ پرتو'' یعنی (عکسِ محبت) ہے جو 1959ء میں شائع ہوئی۔ اس مختصر سے مجموعہ کلام میں زیادہ تر اُن

کی ابتدائی سخن گوئی کے نمونے درج ہیں۔ اس کے بعد "پراگاش" (نورِ صبح) کے عنوان سے ان کا ایک اور مجموعہ کلام منظر عام پر آیا اور اس میں انھوں نے پہلی بار اپنی کچھ مزاحمتی منظومات بھی شامل کیں۔ جن میں سے چند اشعار کا آزادانہ ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے:

دورِ خسروی دیر تک قائم نہیں رہ ہوسکتا
اپنے تخت کو زور سے سنبھال!
کوہکن آج بھی نہ جانے کس گھڑی کے انتظار میں ہیں۔

"داستان" نامی ایک طویل نظم سے یہ چند اشعار:

وہ جاگیرداری کا طوفان اور استبداد کی قہر سامانیاں
بے کس کسان بھوکے اور زمیندار شکم پُر
عام انسان فقط قسمت کو کوستا تھا۔
آج تک ہم بار بار زار زار روتے رہے
آؤ! اب ہم ظلمتوں میں چراغ روشن کریں
یہی ہم مظلوم و مقہور کشمیریوں کی آرزو ہے!

ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل غلام نبی خیال کا زنداں نامہ "زنجورہ ہُند ساز" (سازِ زنجیر) کے نام سے 1963ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ شاعر نے مفکرِ کشمیر اور سرکردہ سیاست دان مولانا محمد سعید مسعودی کے نام معنون کیا ہے اور اس کے ابتدائی صفحات پر مجروح سلطانپوری کا یہ شعر درج کیا گیا ہے:

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غم، جاناں، دردِ وطن
کیا کہیئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

اس مجموعہ کلام میں ساری منظومات جیل کی دیواروں کے پیچھے ہی لکھی گئی

ہیں۔اس میں خیال صاحب کی ایک نظم ''شمع اور شاعر'' کے اردو ترجمے سے یہاں منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ شعری تخلیق کشمیری زبان کی مزاحمتی شاعری میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے:

اے شمع! تجھ پر جاں قرباں کیا نور کی دولت پائی ہے
اس قفس کے عالمِ ہجر میں بھی تو وصل کا مژدہ لائی ہے
یہ رنگِ جہاں بھی دیکھتا جا پر سوزِ دروں سے دور نہ ہو
بے دم احساسوں کے مارے مغموم نہ ہو مجبور نہ ہو
اک نظر تو میری طرف اٹھا مرمر کے میں بھی جیتا ہوں
اک جامِ عشق کے لب چھو کر امرت میں پیار کا پیتا ہوں
آنکھیں دے کر تارے سمٹے، اشکوں کے عوض شبنم لے لی
پستی میں اور بلندی پر ہر غم سے خوشی ہر دم لے لی
گر عشق ہوا محبوس تو کیا؟ دل کے نغمے آزاد تو ہیں
نظریں ہیں نظر بند آج اگر رنگیں جلوے آزاد تو ہیں
اس ہجر کا درد بھی سہنا ہے سہنے کے سوا چارہ کیا ہے
جو مر بھی گئے پھر بھی زندہ رہنے کے سوا چارہ کیا ہے
تجھ پر بھی پیہم بیتی ہے، یہ لمبی حکایت رہنے دے
یہ جور و ستم کی کہانی ہے اب اس سے شکایت رہنے دے
یہ حیات جو ہے ہاں ایسی ہے اک زہر بھرا ہو جام یہاں
سرِ رہ اک لاش پڑی ہو یہاں، اس زنداں کی ہو شام یہاں
اب چھوڑ یہ ذکرِ درد و الم اب تجھ سے یہی میں کہتا ہوں
تیرا بھی مقدر ہے جلنا اور میں بھی جلتا رہتا ہوں

اس مجموعے کے بارے میں یہ کہنا واجب ہوگا کہ اس پر کئی لحاظ سے فیض

احمد فیض کا اثر واضع اور نمایاں ہے۔ خیال صاحب نے قید و بند کے دوران خاص کر اُن ادیبوں اور دانشوروں کی تحریروں کا مطالعہ کیا جنھوں نے خود بھی جیل کے شب و روز دیکھے ہوں۔ انھوں نے جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ناظم حکمت، جولیس فوچک اور سجاد ظہیر کی قید خانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا اور اس حوالے سے ان کے فکر و ذہن پر سب سے زیاد فیض کی شاعری اثر انداز ہوئی۔

ان نابغۂ زمانہ اہالیانِ علم و دانش کی تخلیقات پڑھ کر خیالؔ صاحب کو اس صورت حال سے کم و بیش آگاہی حاصل ہوئی جس سے ایک حساس قیدی جیل میں دو چار ہو جاتا ہے اور پھر اپنے جذبات کو تحریری شکل دیتا ہے۔

یہ نظم فیض کی زندانی شاعری کی صدائے بازگشت کی طرح کانوں میں گونجتی ہے:

قید ہونے کا جنون بھی ہے اور دار کا عشق بھی
یوسف کا دامن روشن ہے اور منصور امر ہوگیا ہے
اگرچہ انداز بدلے گئے، ستم گری وہی کی وہی ہے
آج بھی وہی کمان ہے اور وہی جگر سامنے ہے
کبھی ہتھکڑیاں کبھی گھنگرو، عشق بھی کیا عجیب شے ہے
کبھی مئے ناب پلائے اور کبھی زہر پیش کرے
جب پرواز کا جنوں ہے تو آشیانے کی لگن نہ رکھ
جو صدف کو کاٹ کے نکلتا ہے وہی گہر کہلاتا ہے
ظلمات کو اور گہرا ہونے دو ستارے چمکتے ہی رہیں گے
سحر کسی صورت میں رات کی محتاج نہیں ہوسکتی

سازِ زنجیر میں کئی اور منظومات مزاحمتی شاعری کی عکاس ہیں جن میں نیا

عہد نامہ، فریاد، شب اور سحر، شیش محل، شہید کو سلام، قیدی کا خط، زندان نامہ وغیرہ قابل غور ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا ہے 1990ء کے آغاز سے کشمیر میں مسلح عسکریت پسندی کی وجہ سے یہ جنت نشاں خطہ ایک بہت بڑی قتل گاہ میں تبدیل ہوا جہاں انسانی خون سڑکوں، بازاروں، کارخانوں، درس گاہوں، ہسپتالوں اور عمارات میں بے رحمی کے ساتھ بہایا گیا اور اس انسان کُشی کا سب سے زیادہ شکار ایک عام آدمی ہی ہوا۔ نتیجے کے طور پر 2014ء کے وسط تک اس تشدد اور دہشت گردی کے شہر آشوب میں کم از کم ایک لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔

غلام نبی خیال اس تکلیف دہ اور پریشان کن حال کے منفی اثرات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے اور اُن کے قلم نے وقت طوقت پر اس کے ردِ عمل میں اپنے جذبات کو وقت کی آواز دی۔ اس تناظر میں چند مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

خون آلود جھیل ڈل

(1990ء کے بعد ہی کشمیر کی مشہور عالم جھیل ڈل کا پانی بالخصوص موسم گرما میں کناروں کے ساتھ ساتھ پہلی بار سرخ رنگ اختیار کرتا گیا۔ محققین کے مطابق اس دوران سطح آب پر Algae نام کے احتسابی اجزا مجتمع ہو جاتے ہیں جو سورج کی تمازت سے خون آلود رنگ اختیار کرتے ہیں۔

مقامی طور پر اب یہ کہاوت عام ہوگئی ہے کہ یہ لالی دراصل اُن ہزاروں لوگوں کے خون کے رنگ کا ظہور ہے جو کشمیر میں گذشتہ چند برسوں میں تشدد کا شکار ہو کر جاں بحق ہوئے۔ اسی تناظر میں یہ نظم موزون ہوئی ہے)

ڈل کا پانی سرخ ہوتا جارہا ہے
لوگ کہتے ہیں اسے خونِ شہیداں

ڈل کی سطح آب پر جو جم گیا ہے
اور جمتے ہی تھما ہے
خون جمتا ہے تو رکتا ہے

ڈلؔ کا خوں آلودہ چہرہ کہہ رہا ہے
میرے اس آئینے میں خونِ شہیداں
کا وہ نکھرا رنگ تو دیکھو ذرا
اور یہ بکھرا ہوا انگ انگ تو دیکھو ذرا

میرا آئینہ کبھی جو تھا روپہلا چاند جیسا
آج وہ گہنا گیا ہے
آج اُس کے سینے پر بارود کی برسات ہے
آج اُس کے نور پر حاوی اندھیری رات ہے

ڈل کا پانی سرخ ہوتا جا رہا ہے
ڈل کی خوں آشام لہروں پر شکارے میں کوئی یہ گا رہا ہے:
جھیل ڈل کی خامشی کا اضطراب
جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کا خواب

اے میرے ارض وطن تیری غلامی کب تلک؟
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

(21 دسمبر 1990ء کو کشمیر کی راجدھانی سری نگر شہر کے تارہ بل نوا کدل علاقے میں بندوق برداروں دستوں نے تین طالب علموں محمد حنیف بابا، امتیاز احمد نقاطی اور مظفر احمد کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ امتیاز اور مظفر اپنے استاد کے گھر درس لینے جا رہے تھے کہ ان پر فائرنگ کی گئی۔ انھوں نے اپنے شناختی کارڈ اور کتابیں اور ان کے بستے دکھا کر یہ باور کرانے کہ کوشش کی تھی وہ طالب علم ہیں۔ حنیف کو اس کے ہی گھر میں گولی مار کر شہید کیا گیا۔

یہ نظم انھی ادھ کھلے گلابوں کا ماتم ہے جو قاتلوں کے بے رحم ہاتھوں مٹی میں ملا دئے گئے۔ 1990ء کے اوایل سے ہزاروں حنیف، امتیاز اور مظفر بندوقوں کا شکار ہو کر اپنی عزیز جانیں گنوا چکے ہیں۔ ''خون کی خوشبو'' میں انھی معصوموں کے لہو کی حدت اور حرارت آپ کو کسی نہ کسی طرح موجزن نظر آئے گی)۔

تمہارے پھول جیسے جسم
خون آلود ہو کر بھی
میرے کشمیر کی آتش زدہ گلیوں میں

ہر کوچے میں، ہر آنگن میں، ہر گھر میں
گلابوں کی مہک بن کر
گل و گلزار کی صورت سجائیں گے
ہمارے بے زباں خوابوں کو
جن کی دل نشیں تعبیر تم ہی ہو
ہمارے نو جواں خوابوں کو
دورِ نو کی تعبیروں کا اک مژدہ سنائے گی
تمہارے خون کی خوشبو

مہکتی جو رہے گی تا ابد ہر خوں چکاں دل میں
اور اس ویران محفل میں
تمہارے خوں کا ہر قطرہ
افق کے آتشیں دریا کی لہروں میں
کھِلے گا اور مہکے گا
پھر ان تاریک راہوں پر اجالے کا چلن ہوگا
دوبارہ پھر سے پھولوں سے بھرا میرا چمن ہوگا
تمہارے تتلیوں جیسے بدن
جو آہن و بارود سے بھونے گئے ایسے
کہ ہر اک چشم گریاں تھی
ہر اک آواز نالاں تھی
وہ ہر اک موڑ پر لٹتی ہوئی اس میری بستی میں
گل لالہ کی صورت پھر کھلیں گے سرخ رو ہو کر
تمہارے خوں بہا کی شکل میں اک آبرو ہو کر!
تمہارے خون کی خوشبو سے پھوٹیں گے وہ سر چشمے
کہ جن کے سرد سینوں میں
کئی آتش فشاں صدیوں سے تھے خفتہ
وہی جب آگ اگلیں گے
تو نخوت کی خدائی میں پلے فرعون ترسیں گے
تمہارا خون بھی اس حشر کے میدان میں آ کر
نہ پانی بن سکے گا اور نہ ہی وہ پیاس کم ہوگی
چبائیں گے وہ انگارے

دہکتی پیاس کے مارے
تمہارا خونِ ناحق عمر بھر پانی نہیں ہوگا
فنا معصوم ہو سکتا ہے پر فانی نہیں ہوگا

چاندنی

محلّے کی گلی میں اک مکاں سے شور سا اٹھا
سُنا اک گھر کی بیٹی کو اٹھا کر لے گیا کوئی
جواں تھی چاندنی تھا نام اُس کا، چاند جیسی تھی

اور اس کے بھائی سورج پر تو گویا آسماں ٹوٹا
بہن کا لاڈلا تھا اور بہن میں روح تھی اس کی
کسی سے کچھ نہ بولا اور بہن کی کھوج میں نکالا
پھر اگلی رات کو جب چاندنی بستی میں لوٹ آئی
زباں خاموش تھی، آنکھیں بجھی تھیں، بال بکھرے تھے
بدن تھا چور اس کا اور قدم بھی لڑکھڑاتے تھے
محلے میں عجب عالم تھا، غم بھی تھا خوشی بھی تھی
کوئی خوش تھا کہ لوٹ آئی کوئی کہتا تھا کیوں آئی

خدایا! بے گناہوں کے گناہوں کا عفو کرنا
خدایا! عصمتوں کے پاک دامن کا رفو کرنا
حلے میں جو آئی چاندنی تو رات بھی نکھری
مگر سورج دوبارہ لوٹ کر واپس نہیں آیا

ایک جلوسِ شہادت

وہ پیر تھے جوان تھے وہ خاص تھے وہ عام تھے
قدم قدم رکاوٹیں مگر وہ تیز گام تھے
دلوں کے زخم رِس رہے تھے، چہرے شادکام تھے
وہ اک جلوس جوش کا جہاد کا حیات کا
خیال کا، ضمیر کا، حیات کے ثبات کا
وہ امن کے پیامبر، وہ دوستی کے پاسباں
جو نعرہ ہائے حق بلند کر رہے تھے بے گماں
وہ بے گمان بڑھ رہا تھا زندگی کا کارواں
کہ اقتدارِ وقت اُن پہ آگ بن کے چھا گیا
گلوں کا اک جلوس تھا کہ خون میں نہا گیا
نکیلے پیر آنچلوں کے روندتے چلے گئے
جنوں کا بس وہ ایک دن بھی چھین کر کے لے گئے
ہزاروں اہلِ گلستاں کو جلتے اشک دے گئے
اُدھر پڑی ہے رہ میں ایک لاش رہ نورد کی
ادھر جوانی لٹ چکی کسی جوان مرد کی
وہ سر بکف غلام تھے یہ شہہ سیاہ بخت ہیں
دہانے مسکرا رہے تھے دل جو لخت لخت تھے
جو معرکے کٹھن تھے آج تک وہ اب بھی سخت ہیں
وطن کی راہ میں جو مر گیا، شہید ہو گیا
وہ اک جلوس جو گذر گیا، شہید ہو گیا

2005ء میں، جب کشمیر میں آہن و آتش کا بہیمانہ کھیل جاری تھا اور جو کئی سال کے لئے اس جنتِ بے نظیر کو تاراج کرنے کا منحوس پیغام لے کر آیا تھا، غلام نبی خیالؔ کا ایک اور شعری مجموعہ ''الہام'' شائع ہوا۔ اس میں شاعر نے مزاحمتی شاعری کے حوالے سے کئی منظومات شامل کیں جنھیں ترجمے کی شکل میں یہاں نقل کرنا ایک غیر ممکن طوالت کا متقاضی ہوگا لہٰذا ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر ہی کافی ہوگا جن میں وطن کا نغمہ، ایک ملک ایک سیاح، شہید، مجاہد، شہر آشوب، شہر نا پرسان، آزادی، فریاد، یہ میرا شہر، کشمیر اور دعا قابل ذکر ہیں۔

صرف نظم آزادی سے یہ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں:

تمہارا وجود شاد کام ہے اگر تو آزاد ہے
عرشِ بریں کے مکین تمہارے ہم زاد ہیں اگر تو آزاد ہے
تو غلام ہے تو مکڑی کے جال سے لٹکا ہوا ہے
اگر آزاد ہے تو باتوں سے فولاد چبا سکتا ہے
تو زیرِ زمین دھنس گیا ہے اگر تو غلام ہے
عرش تیرے پاوں تلے ہے اگر تو آزاد ہے
غلامی میں تو شیطان کا خدمت گذار ہے
آزاد ہو تو فرشتے تمہارے نوکر ہیں
غلام ہے تو دشت کے پیچھے غائب ہے
آزادی میں تمہارا شہر ابد آباد ہے۔

خیالؔ صاحب زندگی کے ہر موڑ پر رونما ہونے والے حالات کے رد عمل میں اپنے حساس فکر کو جلا بخشتے رہے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر میں دہشت اور وحشت نے اس طرح اپنے پنجے گاڑ لئے ہیں کہ اس بے حال اور بے رنگ زندگی سے چھٹکارا پانا نظر نہیں آتا۔ یہ بات بھی ایک فطری عمل کی مظہر ہے کہ ایسے ہی بے ہنگم

حالات میں قلم کار کو اپنی طبع آزمائی کے لئے طرح طرح کا مواد حاصل ہوتا ہے جسے وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بروئے کالا کر فن پاروں کو جنم دے سکتا ہے بشرطیکہ اسے فنی صلاحیتوں اور شاعرانہ نزاکتوں پر پوری دسترس حاصل ہو۔

موجودہ عالمی، ملکی اور مقامی صورت حال کے پیش نظر خیالؔ صاحب نے مزاحمتی شاعری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا کیونکہ ان حالات میں عام انسان بھی ایک قلم کار سے اس پر گذرنے والی ہر واردات کو شاعر کی زبان سے سننے کا آرزومند ہوتا ہے۔

غلام نبی خیال کے غیر مطبوعہ کلام میں جو منظومات اس قبیل سے تعلق رکھتی ہیں اُن میں سے فقط ایسی مثالیں یہاں درج کی جارہی ہیں جنھیں فن شاعری کے میزان پر پرکھ کر مزاحمتی شاعری کی نمایندہ نظموں کا نام دیا جاسکتا ہے: متفرق اشعار کی یہ مثالیں ملاحظہ ہو:

☆ نظریں گلستانوں کی طرف دیکھ رہی ہیں اور پاؤں میں زنجیریں بندھی ہیں
ارے! بہار تو ابھی آئی ہے تو یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے؟

☆ چروا ہے الگ الگ راستوں پر ہو لئے
اسی لئے ریوڑ کو اب گیدڑ اور شیر نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں

☆ فیضؔ کہتا ہے کہ کوئی نہ سر اٹھا کر چلے
میں کہتا ہوں کہ یہاں تو سر ہی قلم کر لیتے ہیں

☆ سورج کو بھی نیند آگئی اور وہ پھر نہیں جاگا
میں ہی چراغ لے کر نکلا اور ہر طرف روشنی ہوئی

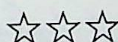
☆ وہ جنونی تھے، وہ گھروں سے نکلے
پھر واپس لوٹ کے نہیں آئے
وہ بے قصور تھے، اسی لئے قتل ہوئے

تم سلامت رہو۔

اور نظم ''نوحہ کشمیر'' سے یہ شعر:

وہ پہاڑ کے اُس پار سے یہاں آگئے
اور ہمارے باغ وراغ اجاڑ دئے
پہلے ہمیں سچ کے راستے سے ہٹایا
اب وہ ہماری تقدیر کا سودا کریں گے۔

دنیا میں جب تک طاغوتی قوتوں کا دور دورہ ہے اور انسانی اقدار کو پامال کیا جارہا ہے، غلام نبی خیالؔ جیسے ضمیر پرست اور جرت مند قلم کار مظلوم کی سربلندی اور ظالم کی شکست کے گیت گاتے رہیں گے۔ یہی وہ حیات بخش نغمات ہیں جو پژمردہ چہروں پر زندگی کی روشنی کو منور کریں گے اور انسان زندہ رہے گا:



ایک ہمہ جہت شخصیت

وحشی سعید

غلام نبی خیال صاحب اردو اور کشمیری زبان و ادب کے تعلق سے ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ خیال صاحب نہ صرف کشمیری کے رسیلے، رومان پرور، مسحور و متاثر کن گیتوں اور غزلوں اور نغموں کے کامیاب اور ہر دلعزیز شاعر ہیں بلکہ وہ نصف صدی سے دھان کے سرسبز اور لہلہاتے کھیتوں اور کھلیانوں، محبوبہ کے سرخ و گلابی رخساروں جیسے سیبوں کے باغیچوں، خوبصورت اور دیدہ مرغزاروں اور میدانوں، سرسراتی اور معطر ہواؤں سے نغمہ ریز وادیوں اور صاف و شفاف پانی کے گنگناتے اور گاتے ہوئے سبک رفتار جھرنوں کی زبان میں کلام کرتے ہیں جنھیں سن کر عمر خیام کی رباعیات اور جان کیٹس کی نظموں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

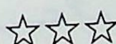
خیال صاحب کے کشمیری کلام بلاغت نظام میں وہ فکر انگیز نظمیں ہیں جو الفاظ و معانی و مفہوم، خیال آفرینی اور پرواز تخیل کی بلند و بالا وادیوں میں پہنچاتی ہیں اور فہم و ادراک کے نئے نئے دروازے بھی وا کرتی ہیں۔

خیال صاحب کشمیری شاعر بھی ہیں، مصنف، بھی، مفکر بھی، محقق بھی اور نقاد بھی ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنے اظہار کے آغاز میں انھیں ہمہ جہت شخصیت قرار دیا ہے۔

اردو زبان و ادب کے تعلق سے بات کی جائے تو خیال صاحب ہو بہو

انھی مذکورہ صفات اور خصوصیات کے حامل ہیں، شاعر بھی، محقق و مصنف اور نقاد اور صحافی بھی۔ دونوں زبانوں کی مختلف اصناف سخن میں ان کی گران قدر تصانیف کی اچھی تعداد میرے اس دعوے کی تصدیق کے لیے موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی ہمہ گیر شخصیت کے ادبی، علمی اور تحقیقی کام پر مفصل بات کرنے کے لیے لاتعداد صفحات درکار ہوں گے۔ ان چند سطور کو دریا کو کوزے میں بند کرنے والی بات کہی جا سکتی ہے۔

محترم خیالؔ صاحب کے لیے حق بات کا تقاضا یہ ہے کہ انھوں نے نصف صدی سے ادب میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اُن پر انھیں مزید انعامات و اعزازات سے نوازا جائے لیکن اس کے برعکس ان کی دریا دلی یہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ ٹوہ لینے میں مشغول رہتے ہیں کہ مادرِ وطن کے کس کس فن کار کی حوصلہ افزائی درکار ہے۔



غلام نبی خیالؔ کا صحافتی کردار

رفیق احمد

صحافت ایک پیچیدہ فن اور کام ہے۔ اس میں بہت تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فن بہت ہی محنت اور مشقت کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک صحافی بننے کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم ہی نہیں بلکہ وسیع تجربے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ایک صحافی کا پیشہ بہت ہی ذمہ داری کا پیشہ ہوتا ہے۔ کیونکہ صحافی جس سماج میں آج کل اپنی صحافتی ذمہ داری نبھاتا ہے وہ سماج کافی اُلجھنوں کا شکار ہوگیا ہے۔ اس سماج میں مختلف قسم کے ٹکراؤ ہیں۔ مختلف نظریات اور سرمایہ کا ٹکراؤ ہے۔ ان نامساعد حالات کے باوجود بھی ایک صحافی کو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رول ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک صحافی کو زبان و بیان پر کافی دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی واقفیت بھی ہونی چاہیے۔ صحافت میں مادی فوائد کو اہمیت دینے کے بجائے لوگوں کے ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت کو ہی اپنا فائدہ مانا جاتا ہے۔ صحافی کی تحریر جتنی اثر انگیز اور خیال انگیز ہو ٹھیک اُسی قدر اس کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور ایسی تحریر اپنا اثر کرکے دکھاتی ہے۔

کشمیر میں 1947ء کے بعد غلام رسول عارف، صوفی غلام محمد، خواجہ ثناء اللہ بٹ، شمیم احمد شمیم، غلام جیلانی قادری، ترلوکی ناتھ، غلام نبی شیدا، محمد شعبان

وکیل، صوفی محی الدین، طاہر محی الدین، عاشق کشمیری، غلام نبی خیال وغیرہ جیسے بہت صحافی پیدا ہوئے۔ ان میں کچھ صحیفہ نگار ایسے بھی ہیں جو کشمیر میں صحافت کے فن کو مختلف صورتوں میں تقویت پہنچاتے رہے۔ ان شخصیات میں صفِ اوّل میں جناب غلام نبی خیال صاحب شامل رہے، جنھوں نے اپنی محنت، مشقت اور لگن کے ساتھ ہماری صحافت کو عالمی معیار دے دیا۔ غلام نبی خیالؔ نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا ''کونگ پوش'' رسالہ سے کی۔ ''کونگ پوش'' رسالے کو 1954ء کے آس پاس کشمیر کے ترقی پسند مصنفین نے جاری کیا تھا۔ جناب خیال صاحب اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس کی ادارتی مجلس میں خیال صاحب کے علاوہ عبدالعزیز ہارون اور نور محمد روشن بھی شامل تھے۔ اس کے بعد 1964ء میں جناب خیال صاحب کی ادارت میں اردو ہفت روزہ ''محاذ'' شائع ہوا جو محاذ رائے شماری کا ترجمان تھا۔ 1964ء کے اخیر میں ہی اس اخبار پر ایک سرکاری حکم نامے کے تحت پابندی عائد کی گئی۔ اُس وقت کشمیر میں غلام محمد صادق کی حکومت قائم تھی۔ اُن دنوں خیال صاحب کو حکومت کی نظروں میں ایک سیاسی مخالف کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپریل 1965ء میں اپنا لفت وار پہلا کشمیری اخبار ''وطن'' جاری کیا۔

کہتے ہیں کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ایک بار کشمیر آئے، تو انھوں نے شیخ محمد عبداللہ کو یہ مشورہ دیا کہ کشمیریوں کے لیے اُن ہی کی زبان میں کم از کم ایک اخبار ہونا چاہیے۔ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری زبان کے معروف شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور کو یہ کام سونپ دیا۔ چونکہ مہجور خود کوئی صحافی نہ تھے اور صحافت سے اُن کا دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کے باوجود بھی مہجورؔ نے ایک کشمیری اخبار ''گاش'' جاری کیا۔ مذکورہ اخبار کے متعلق بہت سے دعوے کیے گئے کہ یہ اخبار ایک دو سال تک جاری رہا، لیکن تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کل تین

ہی شمارے چھپ چکے تھے۔ اس کے برعکس غلام نبی خیالؔ کے اخبار ''وطن'' کے کل 106 اچھے خاصے شمارے چھپ گئے تھے۔ اُن دنوں کشمیر میں سیاسی وسماجی بے چینی تھی اور تعلیم بھی کچھ زیادہ عام نہ تھی۔ اس وجہ سے یہاں پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اس لیے یہ اخبار جون 1968ء میں ہی بند ہو گیا۔

''وطن'' کی خصوصی اشاعتوں میں ''امن نمبر''، ''شہید نمبر''، ''محرم نمبر'' یادگاری حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ اخبار اُن دنوں بہت مشہور ہو گیا اور آج بھی کشمیر کی صحافتی تاریخ میں قابل ذکر اور یادگار ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''امن نمبر'' کا خصوصی شمارہ ایک سو صفحات پر مشتمل تھا، جس میں قابلِ قدر مواد شامل کیا گیا تھا۔ مزید برآں یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ایسا ضخیم شمارہ کشمیر کی صحافتی تاریخ میں ہمیں پہلی بار نظر آیا۔

خیر کارواں جاری ہے۔ خیال صاحب نے 1968ء میں اُردو کالفت روزہ ''اقبال'' شائع کیا جو بعد میں روزنامہ بھی بن گیا تھا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد انھیں کئی مجبوریوں کی وجہ سے یہ اخبار بند کرنا پڑا۔

اس سب کے باوجود بھی جناب خیال صاحب نے ہمت نہ ہاری اور اپنی انتھک محنت ولگن کے ساتھ صحافتی پیشے کو ہمیشہ برقرار رکھا اور وہ اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ پھر انھوں نے انگریزی صحافت کی طرف رجوع کیا۔ اس طرح وہ بڑی حوصلہ مندی اور خداداد قابلیت کے ساتھ انڈیا ٹوڈے ماگزین کے کشمیر میں پہلے نامہ نگار بن گئے اور دس سال تک اس سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد 1977ء میں انھوں نے سٹیٹس مین دہلی کی نامہ نگاری بھی کی۔ وہ کشمیر یونیورسٹی میں دو سال تک شعبہ صحافت کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے بڑے بڑے اخبارات

کے ساتھ کام کیا۔ خیال صاحب نے زیادہ تر کام غیر ملکی پریس کے لیے کیا۔ خاص کر جب کشمیر میں 1990ء میں عسکری پسندی تحریک شروع ہوئی تو وہ وولیس آف امریکہ، جرمن ریڈیو، سکائی نیوز ٹی وی لندن اور گارڈین اخبار لندن کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور پاکستان ٹیلی وژن کے لئے بھی کشمیر میں نمائندے کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن چار سال تک پی ٹی وی سے منسلک رہنے کے بعد اُن پر پہلا قاتلانہ حملہ مارچ 1996ء میں ہوا۔ اُس دن سرینگر ریڈیو اور دوردرشن سرینگر نے اپنی خبر میں کہا کہ یہ حملہ عسکریت پسندوں نے کیا ہے۔ لیکن بی بی سی اور وولیس آف امریکہ نے کہا کہ یہ حملہ اُن پر سرکار نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کروایا ہے جس کی رو سے بی ایس ایف کے اہلکاروں نے خیال صاحب کے گھر پر فائرنگ کی اور گرنیڈ داغے۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ خیال صاحب کے چند پڑوسیوں نے بی ایس ایف کی ایک جیپ کو اُن کے گھر کے باہر دیکھا تھا جو وہاں رُکی ہوئی تھی۔ لیکن اس جان لیوا حملے کے باوجود بھی جناب خیال صاحب نے صحافتی پیشہ کو ترک نہیں کیا۔ اس کے چند سال بعد اُن پر دوبارہ قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ پھر بھی وہ پی ٹی وی کی نمائندگی کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے کیونکہ وہ ایمانداری اور غیر جانبدارانہ طریقے سے اپنا کام انجام دینے کے قائل رہے۔ لیکن کچھ دوستوں نے خیال صاحب سے کہا، چونکہ آپ کی جان اب خطرے میں ہے اور اس بات کا اصرار کیا کہ آپ پی ٹی وی کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیں۔ تو اس طرح ان چند مجبوریوں کی بنا پر انھیں پی ٹی وی سے اپنا ناطہ توڑنا پڑا۔ پی ٹی وی کے لیے کام کرنے کی پاداش میں مرکزی سرکار نے ان کا پاسپورٹ بھی ضبط کیا۔ اس کے باوجود بھی اُنھوں نے بڑی جرأت مندی اور بہادری کے ساتھ صحافتی پیشے کو برقرار رکھا اور پاکستان کے ایک اخبار "نوائے وقت" کے نامہ نگار بھی رہے۔

غلام نبی خیالؔ کے صحافتی کردار کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جب بھی اُن کا کوئی مضمون، خبر یا کوئی تجزیاتی مقالہ رسالوں اور جریدوں میں چھپتا تھا تو دوسرے لوگ ان سے اس بات کا اصرار کرتے تھے کہ ہمارے لیے بھی کام کیجیے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس کے علاوہ جناب خیال صاحب نے امریکہ کے ایک مشہور میگزین ''ٹائم'' کے لیے بھی کام کیا۔ عسکریت پسندی کی وجہ سے کشمیر عالمی میڈیا کا موضوع بحث رہا، تو ان حالات میں خیال صاحب نے کشمیر کی ترجمانی کر کے عالمی سطح پر اس کھیل میں اہم رول ادا کیا۔ اب چونکہ یہاں حالات نے کچھ اور ہی پلٹ کھائی ہے اور نئے نئے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی مسائل پیدا ہوتے ہیں، تو ان حالات میں ہمیں اندرون پر ہی زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس بات کو خیالؔ صاحب نے بھی بھانپ لیا ہے۔ انھوں نے اس بات کے پیش نظر اپنا ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار **Voice of Kashmir** جاری کیا جو آج بھی اپنے جوش و خروش کے ساتھ رواں دواں ہے۔ انگریزی میں یہ اخبار جاری کرنے کا خیالؔ صاحب کا بنیادی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کا ادب، ثقافت اور تاریخ وغیرہ کشمیری لوگوں تک بھی پہنچ سکے تا کہ وہ کشمیر کے بارے میں اچھی خاصی واقفیت حاصل کر سکیں۔

صحافت کے میدان میں جناب خیالؔ صاحب نے ناگری پرجا سبھا کلکتہ ایوارڈ 1976ء میں حاصل کیا اور 1989ء میں جناب خیال صاحب کو لالہ ملک راج صراف صحافتی انعام سے بھی نوازا گیا، اور آزاد کشمیر ریڈیو کے امتیازی ایوارڈ سے بھی وہ نوازے گئے۔

غلام نبی خیالؔ میری نظروں میں کشمیر کے واحد صحافی ہیں جنھوں نے اپنی مجاہدانہ صلاحیت کو ہمیشہ برقرار رکھ کر تین زبانوں کشمیری، اردو اور

انگریزی میں اخبار نکالے اور آج کل بھی اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو وہ بڑی غیر جانبداری سے انجام دے رہے ہیں۔

(دبستان علم وادب، کتابی سلسلہ نمبر ایک، دارالادب پبلی کیشنز، بڈگام کشمیر)



غلام نبی خیالؔ۔ کشمیر کا جمیل جالبی

ڈاکٹر محی الدین زور

انگریزی ہفت روزہ ''وویس آف کشمیر'' کے بیشتر شمارے پڑھے اور انھیں میں نے بہت پسند کیا کیونکہ یہ شائد وادی کا ایسا منفرِد اور واحد اخبار ہے جو ہمیں موجودہ سیاسی، سماجی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ کافی ادبی اور ثقافتی معلومات فراہم کرتا ہے۔

اخبار چونکہ Part time book ہوتا ہے مگر مذکورہ اخبار مجھے All time book کا کام بھی دیتا ہے۔ اسی لیے، میں اس کی کاپیوں کو اپنی لائبریری میں محفوظ رکھتا ہوں کیونکہ مستقبل میں اس کے شمارے کشمیر کی تاریخ و ادبیات پر کام کرنے والے سکالروں کے کام ضرور آئیں گے۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وویس آف کشمیر شائع کرنا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ ایک مشن جس کا محرک غلام نبی خیالؔ ہے۔ (خیال صاحب اور ان کے ادبی مشن کے بارے میں میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں مگر فی الحال یہاں چند ہی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔)

جب کبھی کوئی ادب کا طالب علم یا ادب کا کوئی بھی شائق مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ میں وادی کے کس ادیب کو پڑھوں گا؟ تو میری زبان پر فوراً صرف غلام نبی خیال ہی کا نام آتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ میں خود ادب میں فرسودہ

موضوعات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا ہوں۔ ادب میں مجھے کچھ نئی تلاش ہے۔

خیال صاحب نہ صرف اردو، کشمیری انگریزی زبانوں پر مساوی دسترس رکھتے ہیں جس سے ہر طرح کے قارئین کو تسلی بخش مواد ملتا ہے البتہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے باک لکھتے ہیں۔ انفارمیٹو لکھتے ہیں۔ نئے نئے موضوعات و مسائل پر قلم آزمائی کرتے ہیں جس کی زندہ مثال ''گاشری منار'' اور ''کاروان خیال'' میرے نجی کتب خانے میں موجود ہیں۔

خیال صاحب کے پاس ان کے معاصرین کی طرح ایک قصیدے کا فارمیٹ نہیں ہے۔ جو وہ لوگ ہیں کہ کسی محفل میں کچھ بولنا ہو، کسی سرکاری رسالے کے لیے رائلٹی حاصل کرنے کے لیے کچھ لکھنا ہے تو وہ لوگ ناموں میں ہیر پھیر کر کے مضمون تیار کر لیتے ہیں۔ اپنے معاصرین کی طرح خیال صاحب ''من ترا حاجی بگوئم تو مرا حاجی بگو'' والی بات ان کے یہاں بالکل نہیں ہے۔ البتہ وہ ایک زندہ تاریخ ہے، ایک زندہ کتاب ہے، ایک چلتا پھرتا ادبی کاروان ہے اور ہر پہلو سے راست گو ہے۔

خیال صاحب نہ صرف زبان کا صحیح استعمال جانتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ زبان اور کیا چاہتی ہے اور وقت کے تقاضے اور کیا کیا ہیں۔

انھوں نے کشمیری زبان کو یورپی ادب سے مالامال کیا۔ کشمیری میں ''گاشری منار'' کا درجہ جمیل جالبی کی کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کے برابر ہے۔ انھوں نے ہمیں میڈیا دیا۔ عمر خیام کو کشمیری میں منتقل کیا، کشمیری ادبیات کے بیشتر شاہ پاروں کو Non Kashmiri قارئین کیلئے انگریزی میں ڈھالا۔

الغرض خیال صاحب کو کشمیر کا جمیل جالبی کہوں تو وہ کسی بھی صورت میں بے جا نہیں ہوگا۔



تبصرات

کاروانِ خیال

احمد ندیم قاسمی

غلام نبی خیالؔ کی اس کتاب کا پینو راما اتنا وسیع ہے کہ اُفق تا اُفق پھیلا لگتا ہے۔ پہلے حصے میں کشمیری ادب و ثقافت پر تیرہ مضامین شامل ہیں جن کی اہمیت اور افادیت عنوانات ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے: کشمیری ادب کا جائزہ۔ اکہ نندن، کشمیر کی مشہور لوک کہانی، للہ عارفہ اور شیخ العالم، کشمیری زبان کی بزمیہ مثنویاں۔ محمود گامی کشمیر کا نظامی۔ کشمیری ادب میں دیگر زبانوں کے تراجم۔ کشمیری شاعری پر غالب کا اثر۔ کشمیری جنگ نامے۔ کشمیری رزمیہ اور سامنامہ، کشمیر، وسط ایشیائی اور روسی ادب، کشمیری زبان کی شاعرات، کشمیری صحافت، کشمیری شاعری پر تحریک آزادی کے اثرات۔ یوں سمجھئے کہ پورے کشمیری ادب کا ایک تجزیہ، ایک محاکمہ اس باب اوّل میں درج ہے۔

دوسرا باب متفرقات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی بڑے پائے کے مضامین ہیں۔ مثلاً غنی کشمیری کے سوانح اور شخصیت پر ایک نہایت عمدہ مضمون۔ اقبال، حافظ اور گوئٹے کا سلسلہ محسوسات کے مطابق جائزہ۔ یوری پیڈیز، ارسطو اور فن شاعری۔ رُباعیات عمر خیام پر ایک نظر۔ اس باب میں شامل سفر نامہ عراق بھی بے حد معلومات افزا ہے۔

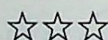
تیسرے یعنی آخری باب میں مشاہیر کے خطوط (غلام نبی خیال کے نام)

درج ہیں۔ان میں سے چند نام یہ ہیں:

پریم ناتھ بزاز، سہیل عظیم آبادی، لارڈ برٹرینڈرسل، امتیاز علی خاں عرشی، شاذ تمکنت ، رام لعل، ڈاکٹر رادھا کرشنن، شمس الرحمٰن فاروقی، شیخ محمد عبداللہ، بلراج ساہنی، دیو آنند، راج کپور، رامانند ساگر، آل احمد سرور، فکر تونسوی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبدالحق، اشفاق احمد، واجدہ تبسم، ہاشم رضا، جگن ناتھ آزاد، طاؤس بانہالی، ڈاکٹر سید عابد حسین وغیرہ۔

ان ابواب کے عنوانات ہی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ''کاروانِ خیال'' کی اہمیت پوری طرح سے واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے بارے میں ایک بار لکھا تھا کہ ''غلام نبی خیال کی اس تصنیف کی مثال ایک چمن زار کی ہے جس میں اُن تمام رنگوں کے پھول کھل رہے ہیں جو اب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آئے ہیں''

(سہ ماہی ''فنون'' لاہور، اپریل تا جولائی 1999)



غلام نبی خیال کی تصنیف ''خیال قلم''

تلخی امروز اور شیرینی فردا کی بات

ڈاکٹر قدوس جاوید

کن فیکنُ کے اسرار ورموز خدائے بزرگ و برتر ہی جانتا ہے۔انسان اپنے محدود ماحول یا بے کنار کائنات سے متعلق اگر قلم اٹھاتا ہے تو اسے بھی توفیق خداوندی ہی ماننا چاہئے اور خداوند خود بھی جاننا چاہتا ہے کہ وہ جو صاحبان فکر و قلم ہیں وہ اپنے قلم کے وسیلے سی حقائق اور مسائل کی پردہ کشائی کرتے رہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پہلی مخلوق جو خدا نے پیدا کی وہ قلم ہی ہے۔اوّل مخلوق القلم (ترمذی شریف)۔

لیکن قلم 'علم' بھی ہے، 'عمل' بھی اور 'علم' بھی۔اب سوال یہ ہے کہ غلام نبی خیال کی تازہ ترین کتاب ''خیال قلم'' کو کس خانے میں رکھا جائے؟ اس کا جواب ہر اس شخص کو معلوم ہے جو خود کو بھی کشمیر کے حوالے سے اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے۔ اور ان کو بھی جن کے ورطۂ خیال میں کشمیر بستا ہے۔ غلام نبی خیال کی ''خیال قلم'' میں شامل تحریروں کا مطالعہ ذہن پر تاثر کی پہلی چھاپ یہی چھوڑتا ہے کہ اگر کشمیر سے متعلق اضافی علم حاصل کرنا ہو، کشمیر کو عصری حالات کے جبر سے نجات دلانے کے لئے لائحہ عمل طے کرنا ہو یا پھر فرسودہ سیاست سے الگ تعمیری اور منطقی انجام تک پہنچنے کے لئے علم بلند کرنا ہو تو ''خیال قلم'' کا مطالعہ ضروری

ہے۔غلام نبی خیال نے فیض احمد فیض کا یہ شعر نقل کیا ہے:

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

الفاظ فیضؔ کے قلم سے نکلے ہیں لیکن مضمون کی جڑیں ہر کشمیری کے ذہن و ضمیر میں بہت دور، بہت اندر پیوست ہیں۔

''خیال قلم' کا ایک نمایاں امتیاز اس کا سچا اور کھرا کھرا لب ولہجہ ہے جو ان کی شخصیت کی بھی پہچان ہے۔ خیال صاحب نے اپنے انفرادی شعور اور اجتماعی لاشعور میں محفوظ کشمیر کی کئی دہائیوں بلکہ صدیوں کی ادبی اور ثقافتی، سماجی او سیاسی نشیب وفراز کی تاریخ کے اشارے پیش کیے ہیں، کچھ تحقیقی، کچھ تنقیدی انداز میں اور کہیں سوانحی خاکوں کی شکل میں تو کہیں صحافتی تبصروں کے روپ میں۔ چونکہ خیال کے قلم کے روشن سمندر میں سچائیوں کا زہر بھی ہے اور امرت بھی، اس لیے اس کے منتھن مطالعے کے لیے صرف اور محض ادبی اپروچ کافی نہیں ہوگا بلکہ کشمیر کی تاریخ کی ہر لمحہ کروٹیں بدلتی لہروں کو بھی گرفت میں لانا ہوگا۔اس مرحلے سے گزر جانے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آئے گا کہ کن لوگوں نے کشمیر کو نیا کشمیر بنانے کی کوششیں کیں اور وہ کون لوگ تھے جن کی سازشوں کی وجہ سے کشمیر، کشمیریوں کے خوابوں کا کشمیر نہیں بن سکا۔

''خیال قلم'' میں غلام نبی خیال صاحب نے دونوں طرح کے لوگوں کی قطاریں پوری ایمانداری کے ساتھ قارئین کے سامنے کھڑی کردی ہیں۔ان کے چہروں کو پہچاننا یا نہ پہچاننا قارئین کی ذمہ داری ہے۔اس ضمن میں خیال قلم میں مولانا محمد سعید مسعودی، شورش کشمیری اور مجاز وغیرہ کے حوالے سے ان کے بعض انکشافات چشم کشا بھی ہیں اور عبرت ناک بھی۔غلام نبی خیال کی ایک اہم خوبی اُن کی حقیقت نگاری ہے۔کبھی یہ حقیقت نشتر کی طرح دل میں چبھتی ہے تو کبھی

ہونٹوں پر تبسم بھی پیدا کرتی ہے۔ تھوڑی سی تحریف کے ساتھ یہ عبرت ناک اقتباس دیکھیے:

''1977 میں مولانا مسعودی کے آبائی قصبے گاندربل میں ایک عوامی جلسے میں شیخ محمد عبداللہ نے مولانا پر تابڑتوڑ حملے کر کے انھیں ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں کا زرخرید ایجنٹ قرار دیا۔ جب مولانا اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی خاطر سٹیج کی طرف بڑھنے لگے تو انھیں دھکے دے کر دور پھینکا گیا اور وہ مضروب بھی ہوئے ، اس کار ثواب میں مولانا کا ایک احسان مند شمیم احمد شمیم پیش پیش تھا جس کے لیے مولانا نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود پارلیمانی انتخاب میں رات دن ایک کر کے گاؤں گاؤں ، قریہ قریہ مہم چلائی تھی۔ میں بنفس نفیس اس جتماع میں موجود تھا۔ (ص 240-239)

منٹو اور کشمیر کے حوالے سے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام منٹو کے 19رنومبر 1952 کے خط سے ہر شخص واقف ہے۔ اس خط کے ان جملوں کی صداقت سے کس کو انکار ہوگا:

1۔ کشمیری خواہ مسلمان ہو یا ہندو، وہ ہر حالت میں کشمیری ہے۔
2۔ تم کشمیر کے باشندے نہیں لیکن تمہاری روح کشمیری ہے۔

خیال کے مطابق منٹو نے اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

'' مجھے ندامت ہے کہ میرے آباواجداد نے ہجرت کی ۔ جو روستم سہنا بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے''

منٹو نے اپنے مضمون میں مہجور کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ خیال صاحب نے اپنے مضمون میں کشمیر اور کشمیریت کے حوالے سے منٹو کے جذبات کا سلسلہ مہجور کے جذبات سے جوڑ دیا ہے اور چونکہ یہ خود خیال صاحب

کے بھی جذبات ہیں اس لیے انھوں نے مہجور کی پانچ نظموں کے اردو ترجمے نقل کیے ہیں لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ ''کشتی'' اور ''شرابی'' جیسی نظموں کا کلام مہجور میں کہیں نام ونشان بھی نہیں۔ لیکن یہ ایک تحقیق طلب مسلہ ہے پھر بھی خیال صاحب کا یہ خیال غلط نہیں لگتا کہ کشمیر اور سیاست کشمیر کے حوالے سے مہجور کے بارے میں مبالغہ آمیزی بھی بہت کی گئی ہے۔

''خیال قلم' کا تنقیدی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں شامل تحریریں روائتی صنفی حدبندیوں سے آزاد ہیں۔ اس تصنیف میں شامل ستائیس تحریروں میں سوانح، خاکہ، تحقیق وتنقید، آپ بیتی وغیرہ اصناف کے عناصر ملتے ہیں ویسے بھی اب ادب میں اصناف کی حدیں ٹھوس نہیں رہ گئی ہیں بلکہ سیال ہوچکی ہیں۔ سوسئر کے نظریہ لسان، ڈریڈا کے رد تشکیل، رولاں بارتھ اور ژولیا کرسٹیوا کے علاوہ روسی ہیت پسندوں شکلوسکی اور رومن جیکب سن وغیرہ کے نظریات نے دنیا کی تمام بڑی زبانوں کے ادب کی زبان، ہیت، تکنیک اور اظہار وبیان پر محسوس یا نامحسوس طور پر جو اثرات مرتب کیے ہیں یہ اُسی کا نتیجہ ہے ہے کہ صرف مغربی ہی نہیں مشرقی زبانوں کے ادب میں بھی صنفی امتیازات کی لہریں ایک دوسرے کو کاٹتی بھی ہیں اور آر پار بھی ہوجاتی ہیں۔ ''خیال قلم'' کے مضامین میں بھی مختلف اصناف کی جلوہ گری نظر آتی ہے مثلاً سوانح نگاری کے عناصر اس اقتباس میں دیکھئے:

''عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور ان کے کئی احباب کو راولپنڈی کیس میں ملوث کرکے قید خانے میں ڈال دیا گیا تو یہاں 1958 ہی میں مجھے کشمیر سازش کیس میں ماخوذ کرکے دو سال تک قید وبند میں رکھا گیا''۔ (ص163)

فیض کے حوالے سے ہی خاکہ نگاری کی شان اس اقتباس میں محسوس کیجئے:

''فیض اور ایلس کی شادی کے بارے میں یہ پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ

فیض 1938ء میں امرتسر میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی قیام گاہ پر اپنی ہونے والی شریک حیات سے پہلی بار ملاقی ہوا۔ تاثیر اس وقت وہاں کالج میں فیض کا ہم جماعت تھا۔ تاثیر ہی نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا منشور تیار کیا تھا جہاں اس نے فیض کی منگیتر ایلس کی ہمشیرہ کرٹو بیل المعروف بلقیس کے ساتھ شادی کی تھی''۔ (ص 177)۔

غلام نبی خیال ایک مستند محقق ہیں۔ یہ بات دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ ''خیال قلم'' میں بھی ان تحقیقی انکشافات کی نادر و نایاب مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ یہاں صرف ایک آدھ نمونہ ہی پیش کرنے کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ خیال صاحب کا مضمون ''گویٹے اور دیون مغربی'' ویسے تو ایک بے مثل تحقیقی تحریر کی حیثیت سے مکمل قرات کا متقاضی ہے لیکن یہاں میں چند سطریں ہی نقل کروں گا۔ خیال صاحب کا خیال نہیں تحقیق ہے کہ ''جب 1813ء میں لپزگ میں جنگ اقوام چھڑ گئی تو گویٹے کے ہاتھ میں غیر متوقع طور پر کاغذ کا ایک ورق آگیا جو ویمر کے سپاہیوں نے جنگ ہسپانیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پر عربی میں قران پاک کا سورۃ الناس لکھا ہوا تھا جس میں اللہ تعالی اپنے پیغمبر اعظم سے فرماتا ہے کہ:

''کہہ دے اے رسول اللہ، میں مالکِ کائنات سے پناہ مانگتا ہوں اُس شیطان کے شر سے جو لوگوں میں وسواس ڈالتا ہے، خواہ یہ وسواس پیدا کرنے والا جن ہو یا انسان''۔

گویٹے اس کلام اللہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی تشریح اس کی اپنی زندگی کی تصویر بن گئی''۔

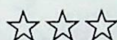
غلام نبی خیال کا تحقیقی شعور کتنا بالیدہ ہے اس کا اندازہ انھی کے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

''تحقیق کا صبر آزما کام اس امر کا متقاضی ہے کہ اُن قدیم ادبی اور ثقافتی خزانوں کو کھنگالا جائے جن کی چابیاں زمانے کی دست برد سے کھوگئی ہیں اور ان کے دروازے وا کرنے کے تمام راستے ہم پر مسدود ہو چکے ہیں۔ تحقیق کار کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے یا قدیم نسخے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے بے پناہ صبر اور استقامت کا مالک ہو جس کی بدولت وہ کسی بھی غیر مصدقہ تخلیق کو تاریخی اعتبار سے حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی توثیق یا تصحیح کر سکے''۔ (ص 194)

اسی طرح غلام نبی خیال کے مضامین میں عمدہ تنقیدی رویوں کی بھی کمی نہیں۔ خیال صاحب، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی یا حامدی کی طرح جا و بے جا غیر مانوس انگریزی الفاظ و تراکیب استعمال کر کے قارئین کو مرعوب کرنے اور ان کے لیے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن خیال صاحب اپنی تحریروں میں کشمیر کی سماجی و ثقافتی، علمی و ادبی اور سیاسی تاریخ کی کروٹوں کو جس طرح بنیادی حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اس کی وجہ سے خیال صاحب کی تنقید زمین سے جڑی رہتی ہے اور قارئین کو ان کی تنقید کی تفہیم اور قبولیت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اس زاوئے سے خیال صاحب کی تنقید نگاری اپنی ایک منفرد شعریات کی حامل ہے جو محمد دین فوق، عبدالاحد آزاد اور نندلال کول طالب وغیرہ کے علاوہ کسی اور تنقید نگار کے یہاں کم ہی نظر آتی ہیں۔ ''خیال قلم'' میں خیال صاحب کی تنقید نگاری کے اس انفراد و امتیاز کی مثالیں علامہ اقبال، غنی کشمیری، فیض جوش، حفیظ، منٹو اور اختر محی الدین، خوشی محمد ناظر اور طاؤس بانہالی وغیرہ سے متعلق ان کے مضامین میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بحیثیت مجموعی ''خیال قلم''، کشمیر کے معتبر شاعر، محقق، ترجمہ کار اور صحافی محترم غلام نبی خیال کی ایک ایسی قابل قدر تصنیف ہے جس میں کشمیر کو مرکز میں رکھ کر شعر و ادب پر، سیاست اور ثقافت کی رنگ آمیزی کے ساتھ تحریریں پیش کی

گئی ہیں۔ ان تحریروں میں رواں دواں، تلخی امروز اور شیرینی فردا کو گرفت میں لے کر غور وفکر کریں تو آپ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ''خیال قلم'' صرف ایک کتاب نہیں۔ کشمیر اور کشمیریت میں ایک نئی روح پھونکنے کی پر خلوص کوشش ہے اور اگر آپ کو کشمیر سے محبت ہے اور کشمیریت سے عقیدت ہے تو ''خیال قلم'' کے مطالعے کے بغیر آپ کی محبت اور عقیدت ادھوری رہ جائے گی۔



خیال قلم ــــ ایک جائزہ

ڈاکٹر مشتاق حیدر

سینئر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

کلیم الدین احمد نے تنقید کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے: ''تنقید ایک صحیح تربیت پائے شائستہ اور مہذب دماغ کا مجموعی جوہر وصف ہے۔ اور اُس کی بے انتہا متنوع رنگارنگ خصوصی شکلیں بھی ہوتی ہیں''۔

عبدالستار دلوی تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مواد کی فراہمی میں محقق کو جاسوس کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور اس کو مکھیوں کے ذریعے شہد کی فراہمی جیسی محنت ومشقت سے کام لینا پڑتا ہے''

سوانح نگاری کے بارے میں مشہور انگریزی ادیب جانسن لکھتے ہیں: ''سوانح بیانیہ تحریر کی مختلف اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد پر اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے''۔

سربرآوردہ ادیب جناب غلام نبی خیالؔ کی تازہ کتاب خیالِ قلم پر مختصر جائزہ کی ابتداء میں ان تعریفات کو نقل کرنا میری ضرورت اس لیے بن گئی کیونکہ مذکورہ کتاب کے عنوان کے ساتھ یا تعارفی صفحے پر اس بات کا ذکر موجود نہیں ہے کہ آیا یہ کس نوعیت کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ البتہ جس صفحہ پر انگریزی زبان

میں کتاب سے متعلق کوائف درج ہیں وہاں لفظ Genre کے آگے Literary Research لکھا ہوا ہے۔

میں نے جب کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے مضامین صرف تحقیقی نوعیت کے ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ مضمون تنقیدی اور نیم سوانحی نوعیت کے بھی ہیں۔

خیالؔ صاحب کی آج تک کل ملا کر اٹھائیس کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں کشمیری زبان میں سترہ، انگریزی زبان میں دو اور اردو زبان میں نو کتابیں شامل ہیں۔ ایسے میں آپ جیسے کہنہ مشق ادیب، محقق اور صحافی کی کتاب پر خامہ فرسائی کرنا میرے جیسے طفلِ مکتب کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔ خیالؔ صاحب نے اس کام کے لیے میرا انتخاب کیا، یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ خیالؔ صاحب ایک جینوین مصنف اور خطر پسند شخصیت کے طور پر حلقۂ یاراں میں مشہور ومقبول ہیں۔ تبھی انھوں نے برائے تبصرہ میرا انتخاب کرنے کا جوکھم اُٹھایا۔ کیونکہ گزشتہ دنوں چند کتابوں پر میرے تبصروں اور جائزوں کو کچھ دوستوں نے دوائی کی تلخ گولیوں سے تشبیہ دی تو کچھ نے تیر و تفنگ سے۔ بہر کیف اشتہارات کے 6 صفحات کو ملا کر 480 صفحات پر محیط زیر تبصرہ کتاب ''خیالِ قلم'' از جناب غلام نبی خیالؔ 27 مضامین کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ جیسا کہ میں نے ابتداء میں عرض کیا کہ یہ مضامین صرف تحقیقی نوعیت کے ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ مضامین تنقیدی بھی ہیں اور کچھ نیم سوانحی بھی۔

اگر چہ کتاب میں شامل تمام مضامین ایک جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں لیکن جوں جوں میں قرأت کے مراحل طے کرتا گیا میرے اندر اِن سب مضامین کے بیچ ایک نا معلوم ربط کا احساس گہرا ہوتا گیا۔ آخرش جب میں نے کتاب کا پچیسواں مضمون ''خیال نامہ'' پڑھا تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ نا معلوم ربط

مصنف کی اپنی ادبی اور سماجی شخصیت ہے جو الفاظ کی صورت میں تحلیل ہو کر ابدیت کے قالب میں سمانے میں سر گرداں ہے۔

کتاب کا مذکورہ مضمون ''خیال نامہ'' اگر بالفرض پہلے مضمون کی جگہ پر رکھا جائے تو کتاب کے مضامین میں ایک معنوی وحدت صاف نظر آئے گی۔ جس کی تین صورتیں واضح طور پر ایک سنجیدہ قاری کو نظر آئیں گی: تحقیقی، تنقیدی اور نیم سوانحی۔

تحقیق کے زمرے میں درج ذیل مضامین رکھے جا سکتے ہیں:

چنار کے رنگ، شیخ یعقوب صرفی، غنی کشمیری، کشمیری زبان میں تحقیق ادب، علامہ اقبال کا سفر کشمیر، اردو اور جنوب ایشائی ہم آہنگی، انگریزی اور کشمیری کالین دین، عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم'' اور'' سعادت حسن منٹو اور کشمیر۔

تنقید کے ذیل میں مندرجہ مضامین آسکتے ہیں:

جوش اور حفیظ کی شاعری میں کشمیریات، فیض احمد فیض: تلخیٔ امروز اور شرینیٔ فردا کا شاعر، شورش کشمیری کا زورِ خطابت، خوشی محمد ناظر--- جوگی کا شاعر، اختر محی الدین-- بلبل ہزار داستان۔

نیم سوانحی ذمرے میں مندرجہ ذیل مضامین رکھے جا سکتے ہیں:

اقبال اور کشمیر، ذکر رومی اور اُن کے ہم عصر مشاہیر، مفکر کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی، یاران وطن جو چلے گئے، مقبول فدا حسین، خیال نامہ، جشن خیال- مراد آباد، غلام نبی خیال: کشمیریات کا مجسم از فاروق ارگلی۔

آخر الذکر دو مضامین خیال صاحب کے لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کی ادبی شخصیت پر دو دیگر مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں شامل دو مضامین ایسے ہیں جو ہمہ وقت تحقیق اور تنقید کی نوعیت کے ہیں۔ ان مضامین کے عناوین ہیں:

اول: سنتوش ____ کشمیر کا ممتاز مصور، دوم: مجاز اور کشمیر

آیئے چند باتیں کتاب میں روا رکھے گئے معانی، اسلوب اور آہنگ کے حوالے سے کرتے ہیں:

کتاب میں شامل تقریباً تمام تحقیقی مضامین کی مشترکہ خوبی یہ ہے کہ کوئی نئی بات پیش کرتے وقت یا کسی دعوے کو غلط ثابت کرتے وقت ٹھوس شواہد اور حوالہ جات کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایسا کرتے وقت جدید سائنسی طریقہ ہائے کار کا استعمال کیا گیا ہے۔ حوالہ جات کا اندراج ایم ایل اے اسٹائل شیٹ کے عین مطابق کیا گیا ہے۔ ادبی تحقیق کی ایک خصوصیت یہ ہونی چاہیے اور ہوتی بھی ہے کہ یہ مزید تحقیق کے لیے دروازے وا کرتی ہے۔ کتاب میں شامل تقریباً سبھی تحقیقی مضامین اس خصوصیت سے مزّین ہیں۔ خاص طور پر ''شورش کشمیری کا زورِ خطابت''، ''غنی کشمیری''، ''شیخ یعقوب صرفی''، ''اردو اور جنوب ایشائی ہم آہنگی''، جیسے مضامین دیگر محققین کے لئے مہمیز کا کام کر سکتے ہیں۔

غنی کشمیری کے کرالہ پن سے متعلق مصنف کا یہ خیال کہ ''یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ملک الشعراء مرزا صائب صرف ایک لفظ کے معنی معلوم کرنے کی خاطر سفر کی صعوبتیں برادشت کر لیتا'' اپنے آپ میں ایک پختہ کار سوچ کا غماز ہے۔ ساتھ ہی یہ مثبت بیان کہ اس واقعے کا سچا یا جھوٹا ہونا غنی کے مرتبے میں کسی کمی بیشی کا باعث نہیں بن سکتا کیونکہ غنی بہر حال غنی ہے مصنف کی بالغ نظری پر دال ہے۔ ہاں اس مضمون میں خاص طور پر اور عمومی طور پر دیگر مضامین میں ایک بات کی کمی بار بار کھٹکتی ہے وہ یہ کہ فارسی اشعار اور اقتباسات کا اردو ترجمہ نہیں دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ فنی سطح پر کوئی نقص تصور نہیں کیا جا سکتا مگر کیا کیجیے کہ زمانۂ حال میں اردو والوں کی اکثریت فارسی سے نابلد ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ اردو والوں کا فارسی سے دوری اُن کے اردو زبان و ادب کی میراث

سے لاتعلق ہونے کے برابر ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اُمید ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں فارسی متن کا ترجمہ بھی شامل کیا جائے گا تاکہ نئی پود کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکے۔

مضمون ''اردو ادب اور جنوب ایشائی ہم آہنگی'' میں فاضل محقق نے بلیغ اشاروں میں اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ مضمون اردو زبان کے تحفظ اور بقا کی خاطر ایک مشن چلانے کے لیے مینی فیسٹو کی بنیاد ثابت ہوسکتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں خیالؔ صاحب نے اس مضمون میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں نا اختصار دانائی کی روح ہوتی ہے۔ اس لیتے میری شکایت میری نادانی کی دلیل بھی ہوسکتی ہے۔

مضامین بعنوان ''سعادت حسن منٹو اور کشمیر'' اور ''کشمیر: فیض اور فلمستان'' ایسے مضامین ہیں جو قاری کو ایک انوکھی دنیا کی سیر کراتے ہیں، جہاں انسان ہمدرد اور ظالم، حاکم و محکوم، مجبور و مقہور، غلام و آزاد ہر دو صورتوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ خیالؔ صاحب نے ایک تجربہ کار صحافی کی نظر سے اُن فلموں پر بات کی ہے جن میں کشمیر کے حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ایسی فلموں کی تعریفیں بھی کی ہیں جن میں غیر جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ اس طرح کے موضوعات پر قلم اُٹھانے کے لئے خیالؔ صاحب لائق صد تحسین و آفریں ہیں۔ اگرچہ ایسے موضوعات پر لکھنا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور اپنی زمین سے محبت کا تقاضا بھی لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ایسے موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں۔

اسی طرح مضامین بعنوان ''انگریزی اور کشمیری کا لین دین'' اور ''عقیدتی

ادب کے کشمیری تراجم'' ترجمے کی اہمیت وافادیت کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں، ساتھ ہی قاری موضوع سے متعلق ہوئے کام کی پیش رفت سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔

جہاں تک تنقیدی مضامین کا تعلق ہے یہ تمام مضامین ناقد کی دقت نظر پر دال ہیں۔ فاضل ناقد نے الگ الگ مضامین کے لیے الگ الگ طریقہ نقد سے کام لیا ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو موضوع یا متن جس طریقۂ انتقاد کا متقاضی تھا اُسے اُسی میزان سے تولا گیا ہے۔

تمام تنقیدی مضامین میں جو وصف قدرے مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ متن خصوصاً شعری متن کی تفہیم کا مشرقی انداز ہے، جہاں معانی کے ساتھ ساتھ صوت وآہنگ اور جمالیاتی حض کی اہمیت کو بھی زیر نظر رکھا گیا ہے۔

مضمون بعنوان ''جوشؔ اور حفیظؔ کی شاعری میں کشمیریات'' میں دونوں شاعروں کے کشمیر سے والہانہ عشق اور اہل کشمیر کے ساتھ یکجہتی کا ذکر بلند آہنگ سے کیا گیا ہے۔ یہ شاید ان شاعروں کے آہنگ کی بازگشت ہے یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ناقد چونکہ خود کشمیری ہے اور تنقید ہو یا تخلیق دونوں میں زمانے کے اثر کے ساتھ ساتھ مقامیت کے عنصر سے گریز ممکن نہیں ہے۔ موضوع کی مناسبت سے مضمون میں دونوں شاعروں (جوشؔ اور حفیظؔ) کی شاعری سے درج کی گئی مثالوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

مذکورہ مضمون میں خیالؔ صاحب نے مرزا سلامت علی دبیر کے مشہور مرثیے ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' کو میر انیس سے منسوب کیا ہے، جس کی تصحیح کرنا ضروری ہے (یہ غلطی سہواً ہوئی ہے۔ یہ مصرعہ دراصل میرزا دبیر کا ہے۔ معذرت خواہ ہوں۔ خیالؔ) تاکہ قارئین تک غلط جانکاری نہ پہنچے۔ خیالؔ صاحب مذکورہ مضمون میں حفیظ کی شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کشمیر سے حفیظ

کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ غزل میں بھی کشمیر کو نہیں بھولتے''۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعروں نے کشمیر کو غزل میں ہی یاد رکھا ہے اور جب کبھی کشمیر کو غزل سے نکال کر نظم میں جگہ دی گئی ہے تو اِس کی حقیقی تصویر قارئین تک پہنچی ہے جو قدرتی نظاروں کے ساتھ ساتھ غلامی، حسرت و یاس اور ظلم و ناانصافی سے تعبیر ہے۔

مضمون بعنوان ''فیض احمد فیضؔ: تلخیٔ امروز اور شیرینیٔ فردا کا شاعر'' میں خیال صاحب نے فیضؔ کی شاعری اور ان کے نظریہ حیات، انسان دوستی اور فیض کے پیامبر امن و آشتی ہونے پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ خیالؔ صاحب نے اس مضمون میں فیضؔ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کئی دلچسپ حقائق کو حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پورا مضمون قاری کو مسحور کُن طریقے سے از ابتداء تا انتہا باندھے رکھتا ہے۔

اس مضمون میں فیض کے تخیل کی آفاقیت کو اُن کی شاعری کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی خوبصورت، مفکرانہ اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ فیض کے حافظ قرآن ہونے کی بات سچ مچ قارئین کے لیے ایک خبر ہے۔ اس مضمون میں فیض کے نکاح نامہ کے تعلق سے درج جانکاری کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ جس کے مطابق اس نکاح نامہ میں پہلی بار کسی منکوحہ کو اپنے خاوند کو طلاق دینے کا پورا حق اور اختیار دیا گیا تھا۔ خیالؔ صاحب کے بقول یہ نکاح نامہ مکمل اسلامی اور ترقی پسند دستاویز کہلایا جا سکتا ہے۔ اسی مضمون کے ذیل میں صفحہ نمبر 189 پر خیالؔ صاحب نے بنا کسی داخلی یا خارجی شہادت یا دلیل کے فیض کو دہری کہا ہے جو ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ ایسا دعویٰ کرتے وقت مصنف کو فیض کی شاعری، نثری تصنیفات یا کسی اور چیز کو بنیاد بنانا چاہیے تھا۔ ورنہ ایسے دعوے کٹھ ملاؤں کے فتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔

''شورش کشمیری کا زورِ خطابت'' ایک ایسا مضمون ہے جو نئے محققین کے لیے چراغِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ شورش کشمیری جیسے فرزند کشمیر پر اب تک کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا ہے۔ کسی نصابی یا غیر نصابی تحقیقی پروگرام کے تحت ان پر کام کرنا عصری ادیبوں اور دانشوروں کی اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے۔ خیال صاحب کا اپنے مضمون کے توسط سے اس طرف توجہ دلانے کو نیک فال سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

بلبل ہزار داستان اختر محی الدین جیسا مضمون خیالؔ صاحب کی دقت نظر کا غماز ہے۔ اگر اختر محی الدین جیسے کشمیری افسانہ نگار کے افسانوں کو اردو دنیا میں ترجمہ و توضیح کے ذریعے متعارف کرایا جائے تو یقیناً وہ لوگ جو کشمیری زبان میں سنجیدہ فکشن کی موجودگی کے انکاری ہیں لال پیلے ہو جائیں گے۔ خیالؔ صاحب کا یہ مضمون ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے'' کے مصداق ہے۔

کتاب میں شامل نیم سوانحی قسم کے مضامین دلچسپی کا سارا سامان اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ قاری ان مضامین کے آئینے میں صاحبِ کتاب کی شخصیت کے ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ گزشتہ 60 برسوں میں کشمیر کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی اُتار چڑھاؤ کا بھی بہ خوبی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

مضمون ''یارانِ وطن جو چلے گئے'' میں کشمیر کے تین اہم شاعروں طاؤس بانہالی، آزر عسکری اور تحسین جعفری کے سوانحی کوائف اور علمی و ادبی استبداد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ زیریں لہر کی صورت میں خیالؔ صاحب کی اپنی ادبی شخصیت سے بھی قاری روبرو ہوتا ہے۔ ہاں اس مضمون کو کسی ایسے مقالاتی سلسلے کی کڑی بتایا گیا ہے، جس کے تحت سن 1947 کے فوراً بعد مقامی سطح پر سرکاری دارو گیر کے نتیجے میں کشمیر سے پاکستان یا پاکستانی کشمیر ہجرت کر گئے ادباء کا تذکرہ ہوگا۔ اللہ کرے کہ باقی افراد پر تذکرے جلد از جلد قارئین تک پہنچیں۔

مضمون ''سنتوش کشمیر کا ممتاز مصور'' کے تناظر میں اُس عہد کے کشمیر کی

تصویر آنکھوں میں رقص کرنے لگتی ہے جس میں کشمیر کے مسلمان اور پنڈت ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر ہو کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ رکھتے تھے۔ یہ مضمون کشمیر میں ترقی پسند دور کی تہذیبی صورت حال کا بھی عکاس ہے۔

خیال صاحب لکھتے ہیں کہ ''سنتوش کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگر وہ مسلکی اعتبار سے اہل تشیع میں سے تھا لیکن اُس نے مذہب کی تمام تنگ نظری پر مبنی جزئیات کو خیر باد کہا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر اور روشن دماغ اور واضح نظریہ رکھنے والا فنکار تھا''۔

اس پیراگراف میں لفظ ''اگر وہ'' کی جگہ ''اگرچہ'' استعمال کیا جائے اور لفظ ''اہل تشیع میں سے تھا'' کے بدلے ''اہل تشیع تھا'' کہہ کر جملہ مکمل کیا جائے پھر لفظ ''لیکن اور مذہب'' حذف کر کے نیا جملہ شروع کیا جائے جس میں سے فقرہ ''اور روشن دماغ اور واضح'' حذف کیا جائے تو دیکھیے پیراگراف کی کیا شکل بنتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''سنتوش کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگرچہ وہ مسلکی اعتبار سے اہل تشیع تھا لیکن اُس نے تمام تنگ نظری پر مبنی جزئیات کو خیر باد کہا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر نظریہ رکھنے والا فنکار تھا''۔

جملے کی یہ صورت خیالؔ جیسے دانشور کے شایان شان لگتی ہے۔

مقبول فدا حسین''، ''مجاز اور کشمیر'' اور ''کشمیری لال ذاکر'' ایسے مضامین ہیں جن میں ان اشخاص کے ذکر کے ساتھ ساتھ متوازی خط پر مصنف کی اپنی ادبی شخصیت روشنی میں آتی ہے۔ اظہار ذات کی یہ دبی دبی چنگاری جب شعلہ بن جاتی ہے تو مصنف بہ نفس نفیس ''خیال نامہ'' کے عنوان سے اپنی ادبی کاوشوں، حصولیابیوں اور کامیابیوں کا ذکر فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔

آخری سے پیشتر مضمون ''جشن خیال'' یوپی مراد آباد میں غلام نبی خیال صاحب کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریب کی روداد ہے۔ اِسے رپوتاژ کہہ کر اس کی قدر میں کمی ہونے کا خدشہ ہے۔ اس مضمون کا آہنگ ناول سے قریب تر ہے یا یوں کہیے کہ اِسے ناول کی ہئیت میں لکھا گیا ہے۔ اِس جشن کی خاص خوبی یہ رہی ہے کہ اس کا انعقاد مراد آباد کی خواتین کی ادبی سوسائٹی نے کیا تھا۔ سرزمین جگر مراد آبادی میں فرزند کشمیر کی عزت افزائی کشمیر کے تمام ادباء کے لیے باعث فخر ہے۔

رنگین تصاویر نے کتاب کے صوری حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ عمدہ کاغذ اور طباعت دل موہ لیتی ہے۔ کتاب کی قیمت 800 روپے اگر چہ اس مہنگائی کے دور میں زیادہ نہیں ہے لیکن اردو قارئین کے مزاج سے ہم سب لوگ خوب واقف ہیں کیونکہ ہم اُن میں شامل ہیں اور زیادہ تر مفت میں کتابیں حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے سنجیدگی سے پڑھا جائے اور پھر اپنی ذاتی لائبریری میں محفوظ بھی رکھا جائے۔ میں مصنف کو اس کتاب کی رسم اجراء پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔



خیال قلم پر ایک تبصرہ

ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ

جموں و کشمیر کی جو شخصیات شعر و ادب کے حلقوں میں خاصی معروف ہیں‘ ان میں جناب غلام نبی خیالؔ بھی شامل ہیں۔ آپ ایک خوش فکر شاعر‘ ادیب‘ محقق‘ ناقد‘ ترجمہ کار اور صحافی ہیں۔ عصر حال تک صاحب موصوف کی تقریباً اکتیس کتابیں‘ اردو‘ کشمیری اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ راقم کی نظر میں ان کا ایک اہم علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے سر والٹر لارنس کی شہرہ آفاق کتاب **The Valley Of Kashmir** کا سلیس اردو ترجمہ ''کشمیر کی وادی'' کے نام سے کیا‘ جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام 2014ء میں شائع ہوا۔ زیر نظر تصنیف ''خیال قلم'' میں کشمیر کی ثقافت‘ ادبیات اور دیگر چند شخصیات پر درجہ ذیل ستائیس مضامین شامل ہیں۔

چنار کے رنگ۔ اقبالِ کشمیر۔ ذکر رومی اور اُن کے ہم عصر مشاہیر۔ شیخ یعقوب صرفیؔ۔ غنی کشمیری۔ جوشؔ اور حفیظؔ کی شاعری میں کشمیریات۔ فیض احمد فیضؔ۔ کشمیری زبان میں تحقیقی ادب۔ شورشؔ کشمیری کا زور خطابت۔ خوشی محمد ناظرؔ جوگی کا شاعر۔ مفکر کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی۔ علامہ اقبالؔ کا سفر کشمیر۔ اردو اور جنوب ایشائی ہم آہنگی۔ اختر محی الدّین۔ بلبل ہزار داستان۔ یاران وطن جو چلے گیے۔ انگریزی اور کشمیری کا لین دین۔ عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم۔

گوئٹے اور ''دیوان مغربی''۔سعادت حسن منٹو اور کشمیر۔ کشمیر: فیضؔ اور فلمستان۔ سنتوشؔ۔ کشمیر کا ممتاز مصوّر۔ مجازؔ اور کشمیر۔ مقبول فدا حسین۔ کشمیری لال ذاکر۔ خیالؔ نامہ۔ جشن خیالؔ۔ مراد آباد۔ غلام نبی خیالؔ: کشمیر کا مجسم ...فاروق ارگلی۔

مذکورہ مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ صاحب تصنیف نے دل نشین اسلوب میں کشمیر کی ثقافت، تاریخ، کشمیری اور غیر کشمیری شعراء کی ادبی خدمات وغیرہ موضوعات پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی نقطہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ کشمیر کے خوبصورت مناظر نے ہر کسی انسان کو ضرور متاثر کیا ہے، چاہے وہ سیاست کار ہو یا علم وادب کا شیدائی۔ تصنیف کے پہلے مضمون ''چنار کے رنگ'' میں کشمیر کے دلفریب نظاروں کے عاشق سخن وروں اور حکمرانوں کی شعری تخلیقات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ اس میں کشمیر اور بیرون کشمیر سے تعلق رکھنے والے ان منتخبہ شعرائے کرام کا فارسی کلام شامل ہے جنھوں نے اپنا کلام در مدحِ کشمیر تخلیق کیا ہے۔ ان شاعروں میں مغل بادشاہ جہانگیر، میرزا محمد طاہر آشنا، مرزا داراب جویا، ظفر خان احسنؔ، پنڈت لسہ کول بہارؔ، محمد اسماعیل بینش کشمیری، پنڈت دامودر نرمل سعادت، خواجہ حسن شعریؔ، ملک الشعراء فیضیؔ، طالب آملی، ملا طغریٰ مشہدیؔ، عرفیؔ شیرازی، عزیز لکھنوی، غنی کشمیریؔ، قدسیؔ مشہدی، مولانا ابوالبرکات منیر لاہوری، پنڈت بیربل کاچروؔ، حافظ شیرازی، سعدی شیرازیؔ، مولانا جامیؔ، مولانا شیخ یعقوب صرفیؔ، عبدالقادر بیدلؔ، علاّمہ اقبالؔ وغیرہ شامل ہیں۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید　　گر مرغِ کباب است کہ باباَل وپر آید

(عرفیؔ شیرازی)

علاّمہ اقبالؔ فکری، فنی اور عملی طور پر کشمیر کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات اور مسائل سے وابستہ رہے ہیں۔ علاّمہ کی اس وابستگی کے تناظر میں کئی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں تین کتابیں ایک ہی عنوان کے

تحت یعنی ''اقبالؔ اور کشمیر''، جگن ناتھ آزادؔ، صابر آفاقی اور سلیم خان گمی نے تصنیف کی ہیں۔اس موضوع پر اگرچہ غلام نبی خیالؔ کی ایک تحقیقی کتاب ''اقبالؔ اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' بھی موجود ہے تاہم انھوں نے پیش نظر کتاب میں بھی تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا ایک مضمون بعنوان ''اقبالِ کشمیر'' شامل کیا ہے۔اس مضمون میں کشمیر کے تعلق سے علّامہ اقبالؔ کے افکار اور اشعار کے ساتھ ساتھ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کے ایک متنازعہ نکتے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔خیالؔ صاحب کشمیریوں کے تئیں علّامہ اقبالؔ کی فکرمندی اور عملی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علّامہ اقبالؔ کشمیر کے لیے ایک پُرعزم سپاہی، کشمیریوں کے لیے بااعتماد ہمدرد اور کشمیر کی آزادی کی خاطر ایک ایسے مجاہد کی صورت میں ابھر کر برصغیر کی ادبی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے کشمیر کی تہذیب وثقافت، وراثت اور کشمیریت کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنا کر اہل کشمیر کی سب سے زیادہ اور سب سے پُراثر ترجمانی کی ہے۔''

(خیال قلم۔ص34)

جہان تصّوف میں مولانا جلال الدّین رومیؒ ایک ایسے آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی ضوفشانی سے شرق وغرب کے اہل معرفت کے قلوب منور ہوتے آئے ہیں۔مولانا کے علم وادب کا ہی یہ فیض ہے کہ یونیسکو نے 2007 کو بین الاقوامی سالِ رومیؔ قرار دیا۔''خیال قلم'' میں مقالہ ''ذکرِ رومیؔ اور ان کے ہم عصر مشاہیر'' میں فاضل مقالہ نگار نے تحقیقی انداز سے مولانا رومی (30 ستمبر 1207) کی حیات، فکروافکار، پیام، تعلقات شمس تبریزؒ اور ان کے ہم عصر اولیائے کرام اور بزرگان دین کے علم وفیوض اور معرفت الٰہی کی چاشنی پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔مولانا رومیؔ کے فکروفن اور شعری تخیلات اور تفکرات کا احاطہ کرتے

ہوئے صاحب مقالہ لکھتے ہیں:

''مولانا جلال الدّین رومیؒ نے دنیائے مشرق میں فکروفن اور فلسفۂ تصوف کے جو چراغ روشن کیے ان کے نور سے رفتہ رفتہ سارے جہان کی ثقافتی اور روحانی دنیا منور ہوتی گئی اور یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں مولانا کو دنیا اور بالخصوص مشرق کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے''

(خیال قلم۔ص ۳۸)

کشمیر کے جلیل القدر عالموں اور سخن وروں میں حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ نمایاں مقام کے حامل ہیں، جس کا اعتراف ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں بھی کیا ہے۔ موصوف کی نابغۂ روزگار شخصیت پر اس تصنیف میں ایک تحقیقی مقالہ بعنوان ''نابغۂ عہد... حضرت شیخ صرفیؒ کشمیری'' بھی شامل ہے۔ راقم کے نزدیک یہ مقالہ حاصل کتاب ہے کیونکہ اس میں نہ صرف حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کی نجی زندگی، علمی اسفار، سیاسی بصیرت، زبان دانی، شاعری، تواریخی شعور، فلسفۂ وتصوف، دین ومعرفت اور فقہ وحدیث پر سیر حاصل گفتگو کی گی ہے بلکہ کشمیر کے سماجی حالات اور سیاسی اتار چڑھاو خصوصاً مغل حکمران اکبر بادشاہ کا کشمیر کو اپنی سلطنت میں ضم کرنے کی وجوہات کو تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ صاحب مقالہ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کے علمی تبحر اور مرتبہ کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت صرفیؒ اپنے عہد کے اُن بلند پایہ عالموں اور مفکروں میں شمار ہوتے تھے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے جس مضمون پر قلم اٹھاتے تو اس کی فنی اور علمی باریکیوں کی گرہیں کھول کر رکھ دیتے۔ حضرت صرفیؒ نے تصوّف ومعرفت، دین ومذہب، علم تفسیر وحدیث اور شعر وشاعری، غرض ہر سنجیدہ مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اپنے کمالِ تفکر اور ذہنی اپج کی بدولت ہم عصر علماء اور اصحابِ قلم میں اس درجہ ممتاز ہوئے کہ ''آئینِ اکبری'' کے مصنف کے بقول ''در تمام انواعِ

شعر وشاعری وعلوم مختلف تسلط کامل داشت''

(خیال قلم۔ ص79)

سرزمین کشمیر میں فارسی علم وادب کے دورزرین کے ایک باکمال شاعر غنی کشمیریؔ کی فارسی دانی کا اعتراف اہل زبان تک کرتے آئے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایران کے مشہور فارسی شاعر مرزا صائب اور دیگر مشاہیر شعراء نے بھی غنی کشمیری کی بہت سی غزلوں کی زمین میں غزلیں لکھی ہیں۔ ''خیال قلم'' میں غنی کشمیری کی شخصیت اور فن پر دلچسپ معلومات نظر آتی ہیں۔ اس مضمون میں مرزا صائب اور غنی کشمیری کے اس مشہور واقعہ کو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں غنی کشمیری کے درجہ ذیل شعر میں آئے لفظ 'کرالہ پن' کے معنی جاننے کے لیے مرزا صائب ایران سے کشمیر آ کر غنی کشمیری سے ملا تھا۔

موئے میان تو شدہ ''کرالہ پن''

کرد جدا کاسۂ سرہا ز تن

غنی کشمیریؔ کے اشعار کی فنی پختگی کا اظہار کرتے ہوئے خیال صاحب لکھتے ہیں کہ ''...بسیار گوئی کے باوجود اس کے ایک شعر میں بھی کسی قسم کی سطحیت یا فن کی ذرہ بھر کمی نہیں پائی جاتی۔ اس کا ایک ایک مصرعہ ادب عالیہ کا ایک نمونہ ہے۔''

(خیال قلم: ص۔100)

کشمیر کی تعریف وتوصیف میں جن شعرائے کرام نے اشعار تحریر کیے ہیں ان میں شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری بھی شامل ہیں۔ ''خیال قلم'' میں مذکورہ شعراء کے کشمیر کے سیاسی' سماجی' ثقافتی اور قدرتی مناظر سے متعلق منظومات اور دیگر سیاسی معاملات کا دلچسپ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ حفیظ جالندھری کی طویل نظم ''تصویر کشمیر'' بھی پیش ہوئی

ہے جس کے چند اشعار ضرب مثل ہیں:

آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
شِیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجموعی طور پر ''خیال قلم'' ایک معلومات آفریں کتاب ہے۔ ہر مضمون میں تحقیقی اور تجزیاتی انداز نظر آتا ہے۔ کشمیریات کے حوالے سے اردو کے شائقین کے لیے یہ ایک قابل قدر تحفہ ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ بھی خوبصورت ہے۔ کتاب میں شامل تاریخی مقامات، اہم شخصیات اور کتب کی رنگین تصویریں صوری معنویت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ''خیال قلم'' کا آخری مضمون جناب فاروق ارگلی (دہلی) کا بعنوان ''کشمیریات کا مجسم فکری زعفران زار۔۔۔غلام نبی خیالؔ'' ہے۔ اس میں خیال صاحب کی حیات اور شعری و ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کرنے کی احسن کوشش کی گی ہے۔ کشمیری ادب و ثقافت پر خیالؔ صاحب کے تحقیقی و تنقیدی کام کو سراہتے ہوئے فاروق ارگلی صاحب لکھتے ہیں:

''....وہ کشمیری ادب، تاریخ اور ثقافت کے نامور محقق ہیں. اس میدان میں ان کی حیثیت و اہمیت یہ ہے کہ ''کشمیریات'' کے موضوع پر لکھنے والوں میں منفرد اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے کشمیری تہذیب اور خاص طور پر کشمیری اساطیری ادب پر تاریخ ساز تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں۔''

(خیال قلم۔ص468)



خیال قلم

ڈاکٹر منور حسن کمال

اردو زبان کی عہد ساز شخصیتوں میں ایک نام غلام نبی خیال کا بھی ہے۔ غلام نبی خیال کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی ایک صنف میں قید نہیں رہے۔ وہ کشمیری ادب، تاریخ اور ثقافت کے نامور محققین میں شامل ہیں۔ اُنھوں نے جہاں کشمیری تہذیب اور خاص طور پر کشمیری اساطیری ادب پر تاریخ ساز تخلیقات پیش کی ہیں، وہیں اردو میں بھی ان کی فکر انگیز غزلیں اور نظمیں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ کشمیری زبان کے شعراء کی اہم تخلیقات کے منظوم تراجم، خیابان کشمیر کے عنوان سے شائع ہو کر قبول عام سند حاصل کر چکی ہے۔ یہ ان کی شعری مہارت اور فکری بصیرت کا قابل قدر نمونہ ہے۔ دوسری طرف انھوں ے رباعیات عمر خیام اور ارسطو کی بوطیقا' کو کشمیری زبان کا جامہ پہنا کر اپنی زبان کے ادیبوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

پیش نظر کتاب 'خیال قلم' انھی غلام نبی خیال کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں 27 مضامین شامل کیے گئے ہیں، جن میں آخر الذکر 'خیال نامہ' ان کے خود نوشت حالات پر مبنی ہے اور 'جشن خیال' جو مراد آباد میں منعقد ہوا تھا، اس کی روداد ہے۔ جب کہ غلام نبی خیال، "کشمیریات کا مجسم" فاروق ارگلی کا تحریر کردہ

ایک طویل مضمون ہے، جس میں موصوف نے غلام نبی خیال کی شاعری، ادب اور نقد پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یوں تو تمام مضامین ہی قابل مطالعہ ہیں، لیکن 'چنار کے رنگ'، 'کشمیری زبان مین تخلیقی ادب'، 'شورش کاشمیری کا زورِ خطابت'، 'علامہ اقبال کا سفر کشمیر'، 'اردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی'، 'عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم'، 'گوئٹے اور دیوان مغربی'، 'سعادت حسن منٹو اور کشمیر' اور 'مجاز اور کشمیر' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کی داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔

کتاب سفید گلیزڈ کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور رنگین تصاویر سے مزین ہے جو اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

'چنار کے رنگ' میں مصنف نے جہاں کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں، رواں دواں جوئباروں اور دریاؤں، خاموش اور پرسکون جھیلوں، لہلہاتے ہوئے کھیتوں، ثمردار باغوں اور پربہار دشت و دمن اور بیابانوں اور خیابانوں کی مدح سرائی کی ہے، وہیں یہ بھی بتایا ہے کہ مغل بادشاہوں، پٹھان اور سکھ حکمرانوں نے سالہا سال کشمیر کو اپنے زیر نگیں رکھا۔ اس لیے وہاں کشمیری زبان کے برعکس فارسی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی مضمون میں انھوں نے کشمیری شعراء کا فارسی کلام بھی پیش کیا ہے۔

کشمیری زبان میں تحقیقی ادب میں غلام نبی خیال کا یہ شکوہ بجا ہے کہ یہاں تحقیقی ادب پر جتنا کام ہونا چاہیے تھا، نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ کشمیری محقق اس امر کا حتمی طور پر دستاویزی ثبوت کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں کہ للہ عارفہ اور شیخ نورالدین نورانی کے کلام میں کتنی تخلیقات ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہوگئی ہیں۔ ان پر جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ بھی سنی سنائی باتوں اور مفروضوں پر مبنی ہے۔ شورش کاشمیری کے زورِ خطابت میں غلام نبی خیال نے بڑے پُرکشش انداز میں ان کی شعلہ بیانی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے

کہ زور خطابت میں ان کا مقابلہ صرف مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ہی تھا۔ ان دونوں سے وہ بذات خود بھی بہت متاثر تھے، لیکن زور خطابت کے معیاری نمونے اس مضمون میں نہیں کے برابر ہیں۔ البتہ شورش کاشمیری نے جو اس وقت کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے، اُس کے اقتباسات پورے واقعات کو پڑھنے کے لیے اُکساتے نظر آتے ہیں۔ یہی مصنف کے طرز تحریر کی خوبی ہے جس کا بہر حال اعتراف کیا جانا چاہیے۔

علامہ اقبال کے سفر کشمیر میں جہاں مصنف نے علامہ اقبال کی کشمیر سے محبت کا تفصیلی بیان کرتے ہوئے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ''گرمی کے موسم میں کشمیر کی ہوا اور آپ ہم رکاب ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہوسکتی ہے۔ خدا نے چاہا تو کبھی یہ موقع بھی آئے گا''

''اردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی'' میں غلام نبی خیال نے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ جنوبی ایشیاء میں اردو ادب نے انسانی ذہن کی خاصیت اور ابدی حُسن کو فروغ دینے میں اپنی قوت اور اثرانگیزی کا بھرپور مظاہرہ کیا، جو ذہن انسانیت کی اُن اقدار سے سرشار ہیں جو ایک متمول ثقافتی زندگی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ''کشمیری میں عقیدتی ادب کے تراجم'' میں حمد، نعت، منقبت اور مراثی وغیرہ جو وقتاً فوقتاً کشمیری زبان میں منتقل کیے گئے ہیں، کشمیری زبان میں اس عقیدتی ادب کا کثیر سرمایہ موجود ہے۔ ''سعادت حسن اور منٹو'' میں کلام مہجور سے بحث کی گئی ہے اور مہجور کی پانچ نظموں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ''مجاز اور کشمیر'' میں غلام نبی خیال نے اپنی یادوں کے شہر نگاراں سے ایسی تصویر کشی کی ہے کہ پڑھتے ہی بنتا ہے۔ اس مضمون میں مجاز کی کشمیر پر لکھی گئی نظم ''نیا کشمیر'' بھی شامل ہے۔ غلام نبی خیال کی زبان سادہ اور شستہ ہے۔ کوئی بھی

مضمون شروع کرنے پر قاری کا رُکنا مشکل نظر آتا ہے، اس لیے کہ انھوں نے عموماً حقائق سے گفتگو کی ہے۔ طویل مباحث سے مضامین کو گراں بار نہیں کیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ ''خیال قلم'' کا اس کے شایان شاں استقبال کیا جائے۔

(ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی، جنوری 2015ء)



''گاشرِ مُنار''۔ ایک مطالعاتی تجزیہ

ڈاکٹر احسان کشمیری

(اس تبصراتی مضمون کی تکمیل کے سلسلے میں مجھے کئی بار محترم غلام نبی خیال صاحب سے ملنا پڑا، تاکہ اس حوالے سے کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوں جن کا مجھے علم نہیں تھا۔ خیال صاحب نے نہایت خندہ پیشانی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ میرے تمام سوالوں کے خاطر خواہ جواب دئے اور ''گاشرِ مُنار'' سے متعلق کئی اور باتیں بھی قارئین کے لیے بیان کیں۔ میں اُن کا سپاس گزار ہوں۔ احسان)

غلام نبی خیال کشمیر کے کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز ادیب، ماہر لسانیات، انشا پرداز، تحقیق کار، نقاد اور صحافی ہیں۔ وہ بیک وقت تین زبانوں کشمیری، اُردو اور انگریزی میں گزشتہ پچپن سال سے برابر لکھ رہے ہیں۔ اس دوران ان زبانوں میں اُن کی تیس کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے لیے انھیں وقتاً فوقتاً دو درجن کے قریب بین الاقوامی، ملکی اور مقامی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

''گاشرِ منار'' (روشنی کے مینار) غلام نبی خیالؔ کی طرف سے اہل کشمیر اور کشمیری زبان کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے، کیونکہ اس نوع کی کوئی کتاب کم از کم برصغیر کی کسی بھی زبان میں میری نظروں سے نہیں گزری ہے۔

یہ کتاب دنیا کے ممتاز شاعروں کی حیات اور فن کا احاطہ کرتی ہے جن میں دنیا کی گیارہ زبانوں کے سربرآوردہ سخن وروں کا مصنف نے خود ہی انتخاب کیا ہے۔ ان میں ہومر (یونانی)، ورجل (لاطینی)، کالی داس (سنسکرت)، امرالقیس (عربی)، ڈانٹے (اطالوی)، حافظ (فارسی)، شیکسپیر (انگریزی)، گوئٹے (جرمن)، پشکن (روسی)، اقبال (اُردو) اور ٹیگور (بنگالی) شامل ہیں۔

عالم سخن گوئی کے قابلِ ستائش نمائندوں پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں، البتہ ''گاشرِ مُنار'' کی طرز پر ایسی کوئی تخلیق برسرِ عام نہیں آسکی ہے، جس میں متذکرہ صدر شاعروں ہی پر تحقیقاتی اور تنقیدی مقالات کی شیرازہ بندی کی گئی ہو۔ اس لحاظ سے اسے ایک منفرد تخلیق کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ خاص کر انھوں نے یونانی، لاطینی، فارسی اور اطالوی زبانوں کے کلاسیکی ادبیات کا بغور اور انہماک کے ساتھ گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ہومر، ورجل اور ڈانٹے پر ان کے تبصرات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کتاب کے حوالہ جات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی تکمیل میں لاتعداد اہم تصانیف اور دیگر کارآمد مواد کا بھرپور مطالعہ بھی کیا ہوگا۔

''گاشرِ مُنار'' کشمیری زبان کی وہ اولین کتاب ہے جس کے اخیر پر حوالہ جات سائنسی طریقے پر ایک جامع طریقے سے درج کیے گئے ہیں۔ ایک سو تیرہ صفحات پر پھیلے ہوئے اس انڈیکس میں اسما کے نام نستعلیق اور کتب و جرائد کے نام نسخ میں ڈالے گئے ہیں۔

یہ ایک اتفاقیہ مگر دلچسپ حقیقت ہے کہ ''گاشرِ مُنار'' کے گیارہ مضامین کو مکمل کرنے میں بھی مصنف کو پورے گیارہ سال یعنی 1960ء سے 1971ء تک

کا عرصہ لگا۔ یہ کتابی سائز کے 512 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے 1972ء میں طبع کیا گیا اور اس کی قیمت پچیس روپے رکھی گئی۔ اس میں مصنف نے محنتِ شاقہ سے متعلقہ شاعروں کی نادر تصاویر شامل کر کے اس کے معنوی حُسن کو چار چاند لگائے ہیں۔ مثال کے طور پر ہومر کے سنگی مجسمے کی تصویر ایتھنز کے قومی عجائب گھر سے لی گئی ہے۔ ورجل کا مجسمہ بھی کیپٹولین میوزیم، فلاسفرس ہال، روم نے بھیجا ہے۔ کالی داس کا قلمی خاکہ اکھل بھارتیہ کالی داسا پریشد، اُجین سے موصول ہوا ہے۔ جیوتو ڈی بونڈون کی بنائی ہوئی ڈانٹے کی شبیہہ نیشنل موزیم، فلورنس کے شکریہ کے ساتھ شامل کتاب کی گئی ہے۔ حافظ شیرازی کی تصویر برٹش میوزیم کی عطا کردہ ہے۔ گوئٹے کی شکل کا عکس نئی دہلی میں جرمن سفارت خانے نے بھیجا ہے۔ پشکن کی تصویر ہند میں روس کے سفارت خانے کے شعبہ ثقافت کی عطا کردہ ہے اور ٹیگور کی شبیہہ مغربی بنگال میں شانتی نکیتن کے شعبہ اشاعت سے ملی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بسیار کوشش کے باوجود خیال صاحب کو عربی شاعر امرالقیس کی تصویر یا قلمی خاکہ حاصل نہیں ہوسکا۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ بقول خیال صاحب ''گاشرِ مُنار'' کا نام مرحوم اختر محی الدین نے تجویز کیا تھا اور اس کا گرد پوش ریاست کے ممتاز مصور مرحوم غلام رسول سنتوش نے مزین کیا تھا۔

''گاشرِ مُنار'' کو 1974ء میں ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکیڈیمی نے پہلا انعام دیا اور اگلے سال یعنی 1975ء میں اسے ہندوستان کی سب سے معتبر ساہتیہ اکادمی (نیشنل اکیڈیمی آف لیٹرس) کی طرف سے تین سال میں لکھی گئی بہترین کشمیری کتاب کا انعام عطا کیا گیا۔

اکیڈیمی کے انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں نئی دہلی میں 21رفروری 1976ء کو جو تقریب منعقد ہوئی اُس میں اکیڈیمی کی طرف سے

''گاشرِ مُنار'' کے بارے میں کہا گیا کہ ''اس تصنیف کو دنیا کی چند عظیم الشان ادبی ہستیوں پر محققانہ مقالات اور ایک پختہ اور فن کارانہ طرز تحریر کی وجہ سے گزشتہ تین سال کے لیے کشمیری زبان کی بہترین کتاب قرار دیا جاتا ہے''۔

اس سے قبل ممبئی سے شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے PEN کے اکتوبر 1974ء کے شمارے میں پروفیسر ترلوکی ناتھ رینہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا، ''اس کتاب میں کشمیری نثر میں ایک نئی زمین ہموار ہوئی ہے۔ مقبول اُردو اخبار ''اقبال'' کے مدیر غلام نبی خیالؔ کو متعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُن کا سیمابی ذہن نہ تو ادبی اظہار کے کسی ایک ذریعہ تک محدود رہ سکا ہے اور نہ ہی اُن کی عالمانہ برتری ایک زبان کے دائرے میں بند ہو سکی ہے۔ وہ پانچ زبانوں انگریزی، فارسی، عربی، اُردو اور کشمیری پر عبور رکھتے ہیں۔ خیال صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ اپنی مادری زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے''

سرینگر سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ''ایکارڈ'' کے جنوری 1976ء کے شمارے میں پروفیسر بیگم نصرت اندرابی نے ''گاشرِ مُنار'' پر ایک طویل تبصرہ میں لکھا، ''کشمیری زبان میں نثر کی صنف صرف چند برس قبل تک ناپید تھی۔ جن کشمیری ادیبوں نے اس صنف ادب کو اپنی زبان میں متعارف کرایا اُن میں Poet Laureate غلام نبی خیالؔ بھی شامل ہیں۔ ''گاشرِ مُنار'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے دنیا کے بڑے بڑے شاعروں پر قلم اُٹھاتے وقت اُن کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا جس کی بنا پر ان شاعروں کو کشمیری قارئین سے متعارف کراتے ہوئے ان کا بھرپور جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ مجموعہ کشمیری ادب میں ایک یادگار اضافہ ہے''

نئی دہلی میں منعقدہ ساہتیہ اکادیمی کی تقریب پر خیال صاحب نے انگریزی میں ''گاشرِ مُنار'' کی شانِ نزول اور اس کی تخلیق کے محرکات کو زیر بحث لایا۔ تقریر

کے اخیر پر خیال صاحب نے ٹیگور کی ایک دعائیہ نظم کے یہ اشعار پڑھے:

Let my love for thee be so
Closely knit with my life.
As in the music with rabab
It is my fervent wish
That I surrender my life to thee
With all the love I have

فروری 1976ء ہی میں اخبار ''انڈین ایکسپریس'' کے مدیر کلدیپ نیر کے کہنے پر اس انگریزی روزنامہ میں ''گاشرِ مُنار'' پر جو تبصرہ شائع ہوا اُس میں خیال صاحب کے اس اظہار خیال کو بھی شامل کیا گیا تھا، ''کشمیری کتابیں پڑھنے والوں کا یہ عالم ہے کہ ''گاشرِ مُنار'' کی صرف ڈھائی سو جلدیں چھاپی گئیں، جن میں سے ایک سو سرکاری کتب خانوں کے لیے خریدی گئیں اور باقی سو جلدیں میں اپنے احباب میں تقسیم کرتا پھر رہا ہوں''۔

''گاشرِ مُنار'' کے بارے میں زیر بحث شاعروں کے فن پر جس پُرکاری اور تجزیاتی نظر سے بحث کی گئی ہے وہ خیال صاحب کے وسیع تر مطالعہ کی گواہی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ہومر کی شاعری کے بارے میں یہ تاثرات کہ ''ہومر کا قلم اس قدر اثر کا مالک ہے کہ ہم اس کے کرداروں کے جذبات اور احساس کے ہمراہ اپنے آپ کو بھی غیر شعوری طور پر شامل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایکلیز کا وقتی غصہ ہم پر بھی غالب آجاتا ہے۔ ایگامنان اور ہیکٹر سے ہم جاں نثاری اور عالیشان جرأت کا درس لیتے ہیں۔ ہیلن ہمارے جنسی جذبات کو بھی ہوا دیتی ہے۔ ہم ناسیکا کو معصومیت اور حُسن کا بہترین نمونہ جان کر اس کی وہی عزت کرتے ہیں جو اُس کو اوڈیسیس نے کی۔ اسی طرح اوڈیسیس کی بے قرار زندگی

ہمارے سکھ چین کو بھی لوٹتی ہے'' (مقالہ ہومر)

ایک انسان جو محاسن اور قبول ماحول کے اثرات قبول کر کے پیدا ہوتے ہیں وہ بہرحال کسی نہ کسی صورت میں اس کے خیالات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ٹیگور انسانی وجود کے ان سبھی سیاہ اور سفید رنگوں پر نظر رکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ اس کا ایمان اسے صداقت، حق اور نیکی کا ثنا خوان بناتا تھا۔ اس کے ڈرامے انسانی احساسات اور انھی فکری اور ذہنی تبدیلیوں کے ترجمان ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اس کے دو ڈراموں ''راجہ اور رانی'' اور ''وسر جن'' میں ملکہ گنہ وتی اسی سیلاب میں بہہ گئی ہے کہ کالی دیوی کے نام انسان یا حیوان کی قربانی دینے سے وہ کسی حد تک فرحت محسوس کرتی ہے۔

اس جگہ ٹیگور مرد اور عورت دونوں کی اُس برائی اور اچھائی کا پردہ فاش کرتا ہے جو یا تو اُن کی زندگی کو اندھا بناتی ہے یا اسے دوسروں کے لیے رہنمائی کا رُتبہ عطا کرتی ہے۔ (مقالہ ٹیگور)

''گاشرِ مُنار'' بلاشبہ کشمیری ادب کے بالخصوص تنقیدی اور تحقیقی شعبے میں ایک خاطر خواہ اضافہ ہے، جسے پڑھنے والے مدتوں تک ایک تحفۂ نادر کی حیثیت میں یاد رکھیں گے۔



پراگاش

فاروق نازکی

''رباعیات عمر خیام'' کا منظوم ترجمہ کرنے کے بعد غلام نبی خیال نے کشمیر کے ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ اس کتاب کو جہاں قبول عام کی سند حاصل ہوئی، وہاں شعروادب کوفن کی کسوٹی پر پرکھنے والوں کے دل میں بھی اس کتاب نے جگہ بنالی۔

''رباعیات خیام'' کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ خیال کی طبیعت میں موزونیت بھی ہے اور حقائق کو تلاش کرنے والی نظر بھی۔ جس کا صحیح اندازہ اُن کے تازہ ترین مجموعہ کلام ''پراگاش'' سے کیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزل جو کہ ہمارے مزاج میں رچ بس گئی ہے، اس مجموعے میں بھی عروج پر نظر آتی ہے۔ کشمیری شاعری میں بھی اس صنف نے مختلف ادوار میں ترقی کی بلندیاں چھولی ہیں اور دورِ جدید کے فن کار بھی اس صنف کی طرف سنجیدگی سے مائل ہیں۔ آج کی غزل گل وبلبل اور وصل فراق کی کیفیتوں کا اظہار نہیں، بلکہ اس کا دامن اتنا وسیع ہوگیا ہے جس میں زندگی کے ہمہ گیر مسائل سما سکتے ہیں۔

خیالؔ نے معمول کے طور پر اس صنف سخن سے اپنی شاعری کی ابتداء کی ہے۔ اُن کی غزل میں اگرچہ خیالات کی بلندی کا وہ احساس نہیں ملتا جو کسی نئے

آہنگ کا پیش خیمہ ہو، لیکن ایک جدّت ضرور نظر آتی ہے، جس میں اُن کے روشن مستقبل کے امکانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

اظہار بیان کی سادگی، الفاظ کا موزوں استعمال اور خوبصورت بحروں کا انتخاب خیالؔ کی غزلوں میں نغمگی کو جنم دیتا ہے اور اُن کے کلام میں وہ اثر پیدا کردیتا ہے جس سے بعض اوقات احساس کی وادیاں گنگنانے لگتی ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

بأگراون وألِک کأتیاہ بألیے
توتہِ دامن خألی کأتیاہ بألیے

گُلاس آسہِ ہے مادِلس منز داغ یودوے
گولائبِکر پأٹھی رٹہِ ہے کنڈین منز جاے لالو

أسِن خیالسؔ مرحبأ ئمِ دلبری ہُند شان تھوٚو
ئمِ میوٹھ مَس بأگر بیَن یُس پانہِ گوژاپان زہر

مُنزل ڈیشتھ تہِ یُس پوٚت پھیرِ أخر
قدم تمی سندی زمانس بار یارو

خیال آج کے ادبی کاروان کا ایک فرد ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کے ساتھ شانہ بشانہ جانب منزل رواں ہے۔ اس کارواں کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے باوصف خیالؔ نے اپنے لیے نیہ راہیں تلاش کی ہیں جو ابھی تک پوری طرح واضع نہیں ہو پائی ہیں۔ لیکن تجربات اور مشاہدے کی رہنمائی میں ان راہوں کا کھل اٹھنا ممکن نہیں، زندگی سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہیں ہوسکتی۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

غم روزگار کھ اسی تن یا اسی تن لولکھ مژر
آدم چھ پریتھ وزہ کج کلاہ ادہ زانھ تہ نومر وون نہ سر

خیال کا یہ نظریہ ان کی نظم 'زندگی چھا پادلوسان' میں زیادہ واضع نظر آتا ہے۔اس نظم میں شاعر اپنے ایک رفیق کار سے مخاطب ہے جو عنفوان شباب ہی میں موت سے بغل گیر ہوتا ہے۔اپنے دوست کے غم میں غرق ہو کر شاعر زندگی کی رعنائیوں کا پرستار ہے اور موت کے ڈر سے نڈھال ہونے کے بجائے زندگی کے خاکے میں رنگ بھرتا ہے۔دوسری نظموں میں بھی شاعر کا انداز بیان کافی دل نشین ہے اور مجموعی اعتبار سے خیالؔ کا یہ مجموعہ ان کے خوبصورت مستقبل کا غماز ہے۔

(شیرازہ، کلچرل اکیڈیمی، سرینگر، جولائی 1962ء)



''شبنم کا آتش کدہ''

فاروق نازکی

غلام نبی خیالؔ اُن معدودے چند قلم کاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے 1955 کے بعد اپنی خاصی پہچان بنالی ہے۔ وہ اردو کے جانے مانے صحافی ہیں۔ انگریزی صحافت کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کیے ہیں اور ملک اور بیرون ملک انگریزی جرائد میں، روز ناموں میں اور ہفتہ وار رسالوں میں اپنی تحریر کے نقش ثبت کیے ہیں۔ ساونڈ براد کاسٹنگ سے لے کر ریڈیو کشمیر سے لے کر وویس آف امریکہ تک اُن کی جولانگاہ رہی ہے۔ ریڈیو کی بھی لاتعداد تحریریں ہیں، جو منفرد انداز بیان کے لیے آج بھی یاد کی جاتی ہیں۔

جب ٹی وی وارِدِ سرینگر ہوا تو انھوں نے ''نیوز ویک'' نام کے ہفتہ وار پروگرام میں ایک نیوز Anchor اور تجزیہ نگار کے رول میں نہ صرف اپنے آپ کو ثابت کیا بلکہ وہ دوسروں کے لیے ایک قابل تقلید مثال بن کر ابھرے۔ پھر ان سے میں نے ایک سیریل بھی لکھوایا جو ''شب رنگ'' کے نام سے آج بھی ٹی وی کے مقبول ترین سیریلز میں شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سیریل 1982 کے آس پاس اختتام کو پہنچا مگر اس کے کردار، جن میں سے کئی اہم اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں، اب بھی روزمرہ کی گفتگو میں اپنے ذکرِ خیر پر لوگوں کو اکساتے ہیں۔

غلام نبی خیالؔ کا تعارف قدرے مشکل عمل ہے۔ آپ شاعر خیال سے

ملنے جایئے تو ضرور صحافی خیال سے مل کر آئیں گے۔ آپ ناقد خیال سے گفتگو کیجئے بعد میں معلوم ہوگا کہ آپ محقق خیال سے گفتگو کر رہے تھے۔ آپ عالمی ادب کے پارکھ اور ''گاشری منار'' کے لافانی مصنف کی لافانی علمی کتاب کے خالق سے محو گفتگو ہو جایئے تو بعد میں پتہ چلے گا کہ آپ چودھری خوشی محمد ناظر کے ''جوگی'' سے مل آئے ہیں۔

غلام نبی خیال ایک ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت کا نام ہے۔ خیال ایک جہدِ مسلسل کی ایک متاثر کن داستان ہیں لیکن فن اور بیش قیمت صلاحیتوں کے آگے وہ جدوجہد کچھ معنی نہیں رکھتی۔

خیال شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ ایک زبردست صحافی ہیں۔ جس کشمیری زبان کو ''وطن'' جیسا اخبار دیا۔ اس اخبار کا ''امن نمبر'' ایک ریفرنس کے طور پر ہمارے عہد کے لیے ایک بہت بڑا حوالہ بن گیا ہے۔ اس نمبر میں چرچل سے لے کر برٹرنڈ رسل، جمیلہ بوپاشا، صدر ڈاکٹر سویکارنو اور بلراج ساہنی سے لے کر شمیم احمد شمیم تک سبھی موجود ہیں اور امن کو اپنے طور پر زیر بحث لاتے ہیں۔ امن ایک نغمہ بن کر ابھرتا ہے اا ردور خلاؤں میں بکھر جاتا ہے۔ ''امن نمبر'' میں کوئی غیبی طاقت کارفرما تھی۔ ''امن نمبر'' امن کی دہائی دے رہا تھا اور برسہا برس پہلے کہہ رہا تھا:

یہاں ابھی بم گرا نہیں ہے
یہاں ابھی کچھ ہوا نہیں ہے
یہ ننھے بچے یہ سب کھلونے
یہ کارخانے یہ دستکاروں کا سوئی دھاگا
تم ہی سے بھائی! تم ہی سے بھائی!
امن کی بھیک مانگتا ہے (نامعلوم)

اس کے بعد یہی وادیٔ جنت نشاں، گہوارۂ امن و آشتی خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاش بن گئی۔ یہ ''امن نمبر'' نے پیش گوئی کی تھی کہ امن کے چراغ کو شر کی ہواؤں سے بچائے رکھنا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ غلام نبی خیال کو زندہ رکھنے کے لیے عالمانہ تاریخی کتاب ''گاشری منار'' کشمیری نثری ادب میں کافی ہے اور جہاں تک شعری بصیرت اور دیوانگی میں فرزانگی کا تعلق ہے، یہ کام عمر خیام نے ان کے لیے آسان کر دیا ہے۔ فٹز جیرالڈ نے خیام کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انگریزی میں اس کو دوبارہ کشف کیا ہے۔ وہ اکتسا شافی شاعری ہے۔ خیام اس کے الفاظ کے اندر ایک احساس اور ایک قوت کی طرح بیٹھا ہے جس کا اعتراف ناقدوں نے کیا ہے۔ بقول میر غلام رسول نازکی: ''یہ بات واقعی قابل تحسین ہے کہ عمر خیام کی رباعیات کا یہ کشمیری ترجمہ پڑھنے کے بعد آدمی ایک قسم کی تشفی محسوس کرتا ہے، تشنگی نہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمہ کشمیری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کہیں کہیں ایسا گمان ہوتا ہے کہ خیال صاحب نے حسنِ بیان، شعر کی لطافت اور استعاروں کے لطیف استعمال میں عمر خیام پر بھی سبقت حاصل کر لی ہے''۔

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ خیام کے جو بھی ترجمے میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں میراجی کا ترجمہ ''خیمے کے آس پاس'' کافی وقیع اور بھرپور ہے۔ کشمیری زبان کا واحد ترجمہ غلام نبی خیال کا ''رباعیات عمر خیام'' ہے جو خیال کو کشمیری ادب میں تب تک زندہ رکھے گا جب تک کشمیری زبان زندہ ہے۔ اس وقت اس موضوع کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا موقعہ نہیں ہے مگر خیام خیال کی ایک اور شناخت کا نام ہے۔ یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔

آج میں ایک اور پہلو کی طرف آپ کی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے

غلام نبی خیالؔ کا یہ مختصر سا مجموعۂ اردو کلام ''شبنم کا آتش کدہ''۔

اردو ریاستی عوام کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بہت دیر تک ہماری تحریری زبان اردو ہی رہی۔ کاروباری، سرکاری اور ذاتی سطح پر اردو ایک رابطے کی زبان بن کر ابھری۔ اور پھر تخلیقی سطح پر جموں سے کشمیر تک، مظفر آباد سے گلگت تک، لداخ کی بلندیوں سے سانبہ کے چٹیل میدانوں تک اردو کا سکہ چلتا رہا۔ خیال نے اردو میں ایک مقتدر اخبار ہفت روزہ ''اقبال'' بھی لگ بھگ آٹھ سال تک شایع کیا۔ اور وہ اسی دوران اردو کی طرف راغب ہوئے۔ ان کی اردو شاعری غالبؔ کی طرح بے رنگ من است ہی سہی، ترجمۂ خیام کے پائے کی نہ سہی مگر اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس مجموعے میں دو حصے ہیں۔ پہلے مختصر سے حصے میں شاعر کی جوانی کے دوران کہی گئی عشق اور رومان کی تصویر کشی اور اس جذبے کی والہانہ عکاسی اور کشمیر کی خوبصورتی، حسنِ جمال، آبشاروں کی چھنک، چٹانوں سے ٹکراتی ہواؤں کی کھنک، جھیلوں کی خاموشی، ندیوں کا خرام، غرض امن کی، سکون کی اور راحت کی فراوانی ہے۔ جمالِ کشمیر کا بیان خیال نے کبھی حفیظؔ کے رنگ میں کیا ہے، کبھی خوشی محمد ناظرؔ کی کے اور کبھی غلام رسول نازکیؔ کے انداز میں برتا ہے۔

دوسرے حصے میں جو اس مجموعے کا بڑا حصہ ہے اُس جد و جہد کی داستانِ خوں چکاں بیان ہے جس کی ترجمانی علامہ اقبال نے یہ کہہ کر کی تھی:

دہقان وکشت و جوئے وخیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس حصے میں بے اطمینانی اور عدم یقینیت کی ایک ایسی فضا ہے جس نے کشمیری عوام کو ایک مسلسل تشکیک میں گرفتار کیا ہوا ہے۔ یہ تشکیک وتوہم ایک عجیب وحشت خیز ذہنی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ اس حصے کی شاعری میں جبر،

اکراہ، بے رخی اک طرف اور دوسری طرف مایوسی، ڈر اور مصلحت ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں:

تیرگی میں چیختی ہے کیوں یہاں آواز دل
موسم گل پھر رہا ہے در بدر اس شہر میں



میرے ارض وطن کب تک تیرا یہ حال یوں سہہ لوں
کہ گذرے صبح ماتم اور پھر شام غریباں ہو



میں نے بھی اشک بہائے جو دامن پر گر کر آب ہوئے
پر دل کے غم دل میں رکھے جو آہوں سے سیراب ہوئے

اس میں تیغ وسناں کا موسم ہے جہاں گل لالہ کی جگہ خون کے چراغ جلتے ہیں۔ جہاں صبح کا بھولا شام تو کیا۔ کبھی لوٹتا ہی نہیں۔ حزن و ملال کا یہ موسم اگر چہ اپنی شدت کھو بیٹھا ہے مگر ابھی تک جاری ہے۔ یہ وبا قابو سے باہر ہے۔ مگر اس کے اثرات ہنوز کشمیر کے رگ وریشے میں موجود ہیں۔ اس رستخیزِ بے جانے قدروں کی شکست وریخت کی۔ روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا اور یہ دست جفا کیش ابھی تک امن کے خرمن میں آگ لگانے سے باز نہیں آتا۔ اس خاک وخون میں غلطان لمحوں نے چناروں کی حنائی لالی کو خون ناحق کی رنگینی سے رنگ کر کے قدم قدم پر داستان کربلا تحریر کی۔ کرب وبلا کے یہ مہہ وسال کشمیری تو کشمیری غیر کشمیری لکھنے والوں کے کلیجے کو بھی چیر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہی حصہ خیال کے مجموعے کا آخری حصہ ہے۔ وہ اگر چہ امید کا دامن نہیں چھوڑتے لیکن جو خوف مسلسل پچیس چھبیس سال سے اس خطۂ زمین کا مقدر بن گیا ہے وہ ایک ایک لفظ سے عیاں ہے:

رات کے پچھلے پہر ہوئی پھر در پر دستک
گھر میں پھر وہ دہشت آئی
میرے بھائی!
جس کے فولادی پنجوں نے روش روش کو مسل کے چھوڑا
شمع شمع پل بھر میں بجھائی
آنگن آنگن آگ لگائی
میرے بھائی!

اس حصے میں سرخ رنگ اور سرخ پھول زیادہ نمایاں طور پر ابھرتے ہیں۔ یہ شعوری کیفیت سہی، مگر تحت الشعور میں رچی ہوئی ایک ٹریجیڈی ہے جس میں کہیں نہ کہیں کرفیوزدہ راتوں اور بیمار دنوں کے زخم موجود ہیں۔ ان لفظوں میں کہیں کہیں نغمگی بھی آگئی ہے مگر وہی:

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

یہ مجموعہ غلام نبی خیال کی کشمیری شاعری اور کشمیر کے حوالے سے نہایت اہم شاعری کا حصہ ہے۔ اس میں جن ادوار کی ترجمانی کی گئی ہے وہ ایک ایپک کا موضوع ہے اور یہ کیا کم ہے کہ آنے والی نسلیں اس سے ایک حوالے کا کام لیں گی:

بے کسوں کی قسم
خاک وخوں کی قسم
اس جنوں کی قسم

اب تو شاداب ہوگا یہ اپنا وطن
کھل اٹھے گا دوبارہ یہ ویراں چمن

جوشکست وریخت کا عمل اب دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے جاری ہے وہی ان نظموں کی تکنیک میں دکھائی دیتا ہے۔ شاعر ایک مربوط بے ترتیبی سے عمارت بنا کر رہا ہے۔ کھڑکیاں دروازے ایک ہی سایز کی نہیں ہیں۔ دیوار و در کے درمیان آنکھیں ابھر آتی ہیں جو بظاہر روشن ہیں۔ اسی طرح ایک الگ تکنیکی کارفرمائی وجود میں آتی ہے۔ جس میں شعور سے زیادہ لاشعور اور تحت الشعور کا اہم رول ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ شاعری شعور کو جگانے کی ایک مخلصانہ کوشش ثابت ہوگی۔

(پیش نامہ "شبنم کا آتش کدہ")

☆☆☆

''خیال قلم'' غلام نبی خیال کی قلمی خوبصورتی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

غلام نبی خیال ریاست جموں و کشمیر کی ایک ایسی ہمہ جہت علمی وادبی شخصیت ہیں جنھیں اردو؛ انگریزی؛ فارسی اور کشمیری زبان پہ عبور حاصل ہے۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک محقق؛ نقاد؛ شاعر؛ صحافی اور مترجم کی ہے۔ اس چہار لسانی شخصیت نے علم وادب کی دنیا میں ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد جو مقام ومرتبہ حاصل کیا ہے وہ قابل داد و تحسین ہے اور جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ غلام نبی خیال کو ان کی بہترین علمی وادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ریاستی؛ ملکی اور بیرون ملک کی کئی سرکاری وغیر سرکاری انجمنوں نے انعامات واعزازات سے نوازا ہے۔

کشمیر جیسی وادیٔ گلپوش ان کا وطن مالوف ہے۔ اپنے وطن سے ہر کسی کو ایک فطری لگاؤ تو ہوتا ہی ہے لیکن اس لگاؤ کا اظہار جب ایک کہنہ مشق اور سنجیدہ ادیب وشاعر کرتا ہے تو وہ اپنے وطن کے ہر شجر وحجر ، تہذیب وثقافت اور عوامی دکھ درد کو اپنی تخلیقات میں زندہ جاوید کر دیتا ہے۔ غلام نبی خیال کشمیری الاصل ہیں۔ چناں چہ کشمیر؛ کشمیری اور کشمیریات سے انھیں والہانہ لگاؤ ہے۔ جس کا برملا اظہار انھوں نے اپنی ادبی نگارشات میں کیا ہے۔ کشمیر کی تہذیب وثقافت کو کتابی صورت

میں متعارف کروانے میں جہاں عہد گزشتہ کے ادباو شعرا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے تو وہیں عصر حاضر میں جناب رحمان راہی، حامدی کاشمیری؛ محمد یوسف ٹینگ اور غلام نبی خیال وغیرہم نہایت فعال نظر آتے ہیں کہ جن کی نگارشات کشمیر کی ثقافت کی موثر آئینہ داری کرتی معلوم ہوتی ہیں۔اس حوالے سے صوبہ جموں کے خطۂ چناب سے تعلق رکھنے والے اردو؛ انگریزی اور کشمیری زبان کے شیدائی جناب ولی محمد بٹ المعروف اسیر کشتواڑی کا نام بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

غلام نبی خیال کی اب تک دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں انگریزی؛ فارسی؛ کشمیری اور اردو زبان میں اہم ترین موضوعات پہ لکھی ان کی کتابیں قاری کو جہان علم وادب کی سیر کراتی ہیں۔512 صفحات پہ مشتمل ان کی کشمیری کتاب " گاشری منار " (روشنی کے مینار) کو1974 میں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے بہترین کتاب کی حیثیت سے پہلا انعام دیا اور 1975 میں اسی تصنیف کو ہندوستان کی ساہتیہ اکادمی نے بھی بہترین کشمیری کتاب قرار دیا اور اپنے اعزاز سے نوازا۔ 2012 میں غلام نبی خیال کی انگریزی کتاب **Leaves of Chinar** (چنار کے پتے) کو جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی نے بہترین انگریزی کتاب انعام سے نوازا۔غلام نبی خیال محنت، لگن اور علمی وادبی ذوق وشوق کے جذبے سے سرشار ہیں۔یہ علمی وادبی جنون انھیں کسی بھی طرح کی تھکان کا احساس ہونے نہیں دیتا۔وہ کشمیر کے پہلے قلمکار ہیں جنھوں نے "خیابان کشمیر" کے عنوان سے کشمیری شعرا کی اہم تخلیقات کے منظوم تراجم کا گرانقدر مجموعہ پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے "رباعیات عمر خیام" اور ارسطو کی "بوطیقا" کو بھی کشمیری زبان میں پیش کر کے کشمیری ادب کی تاریخ میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔"اقبال اور تحریک آزادی کشمیر" فغان کشمیر" پاکستان میں چند روز " کاروان خیال " فکر خیال "خیالات "چنار رنگ" اور "خیال

قلم" (2012) غلام نبی خیال کی وہ تصانیف ہیں جو اردو تحقیق وتنقید کے میدان میں گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"خیال قلم" غلام نبی خیال کی وہ تصنیف لطیف ہے جس میں ان کے 27 مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کو اگر کشمیر رنگ مضامین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان مضامین میں زیادہ تر کشمیر کی تہذیب وثقافت؛ یہاں کی علمی؛ ادبی وسماجی شخصیات کے علاوہ بیرون ریاست کی ان ادبی شخصیات کا ذکر بھی بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ در آیا ہے۔ جنھوں نے کشمیر کو دیکھا ہے اور اسکے دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد اپنے جذبات واحساسات کا اظہار شعری ونثری تخلیقات میں کیا ہے۔ 480 صفحات پہ مشتمل غلام نبی خیال کی کتاب "خیال قلم" کو لفظ لفظ پڑھنے کے دوران میں نے یہ محسوس کیا کہ موصوف نہایت بے باک؛ حقیقت پسند؛ عالمانہ تفکر وتدبر کے حامل اور دلائل وشواہد کے قائل ہیں جنھیں دوران تحقیق وتنقید اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ رد وقبول کے سلسلے میں معتبر حوالے پیش کیے جائیں تا کہ موضوع اپنے پورے نفس مضمون کے ساتھ قاری پر منکشف ہو کے رہ جائے۔ علاوہ ازیں لفظ ومعانی کے ارتباط میں ان کا محتاط رویہ ادبی چاشنی اور ذہنی حظ فراہم کرتا ہے۔ آیئے یہاں مذکورہ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈالتے چلیں تا کہ اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے کہ فاضل مصنف نے جن موضوعات کو اپنی فکری اساس بنایا ہے ان کی علمی وادبی اہمیت وافادیت کیا ہے؟ "خیال قلم" میں شامل مضامین کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔

1۔ چنار کے رنگ۔ 2۔ اقبال کشمیر۔ 3۔ ذکر رومی اور ان کے ہم عصر مشاہیر۔ 4۔ شیخ یعقوب صرفی۔ 5۔ غنی کشمیری۔ 6۔ جوش اور حفیظ کی شاعری میں کشمیریات۔ 7۔ فیض احمد فیض۔ 8۔ کشمیری زبان میں تحقیقی ادب۔ 9۔ شورش

کشمیری کا زور خطابت۔10۔خوشی محمد ناظر، جوگی کا شاعر۔11۔ مفکر کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی۔12۔علامہ اقبال کا سفر کشمیر۔13۔اردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی۔ 14۔اختر محی الدین، بلبل ہزار داستان۔15۔یاران وطن جو چلے گئے۔16۔انگریزی اور کشمیری کا لین دین۔17۔عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم۔18۔گوئٹے اور دیوان مغربی۔19۔سعادت حسن منٹو اور کشمیر۔20۔کشمیر۔ فیض اور فلمستان۔ 21۔سنتوش کشمیر کا ممتاز مصور۔ 22۔مجاز اور کشمیر۔23۔مقبول فدا حسین۔24۔کشمیری لال ذاکر۔25۔خیال نامہ۔26۔جشن خیال، مراد آباد۔ 27۔ ''غلام نبی خیال، کشمیریات کا مجسم زعفران زار''۔بقلم فاروق ارگلی۔

مضمون "چنار کے رنگ" تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے جس میں مقامی اور غیر مقامی فارسی شعرا کے بہت سے نظمیہ اشعار کو بطور حوالہ پیش کیا گیا ہے کہ جن شعرا نے کشمیر کے دلکش مقامات و مناظر سے متاثر ہو کر کشمیر کی تعریف و تحسین کی ہے۔اصل میں غلام نبی خیال نے مذکورہ کتاب میں شامل اپنے اولیں مضمون میں چنار کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے جو کشمیر کے حسین مناظر اور پوری وادء گلپوش کے ہر ایک موسم کی دلربائی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ "اقبال کشمیر "میں علامہ اقبال کے حوالے سے اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ وہ شخصی راج میں ایک ہی بار کشمیر آئے یہاں کشمیری عوام کی مظلومیت کو دیکھ کے رنجیدہ ہوئے اور اپنی بہت سی نظموں میں علامہ اقبال نے کشمیر اور کشمیری عوام کی زبوں حالی کا بھرپور ذکر کیا ہے۔اس مضمون میں اقبال سے متعلق کچھ گمراہ کن امور کی بھی تصیح کی گئی ہے۔ "ذکر رومی اور ان کے ہم عصر مشاہیر" اور "نابغہ عہد حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری" غلام نبی خیال کے دو ایسے طویل مضامین ہیں جن میں انھوں نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔مولانا جلال الدین رومی

کے بارے میں مضمون نگار نے مولانا رومی کے سوانحی کوائف؛ ان کی مثنوی اور ان کے ہم عصر مشاہیر کا باتفصیل ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ مولانا رومی کو مشرقی دنیا کا ایک ایسا عظیم فلسفی قرار دیا ہے کہ جس نے فکروفن اور فلسفۂ تصوف کے نئے نئے چراغ روشن کیے جن کے نور سے رفتہ رفتہ سارے جہان کی ثقافتی اور روحانی دنیا منور ہوتی گئی۔ "غنی کشمیری سوانح اور شخصیت" میں فاضل مصنف نے فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر غنی کشمیری کی زندگی کے چند اہم حالات وواقعات اوران کی شاعرانہ عظمت کو انکے فارسی کلام کے حوالے سے اجاگر کرنے کی بہتر کوشش کی ہے۔ مضمون "جوش اور حفیظ کی شاعری میں کشمیریات" سب سے زیادہ طویل مضمون ہے لیکن اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اسکی طوالت میں ادبی لطافت کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری اپنے شعری وقار کے لحاظ سے بلند مرتبے کے شاعر رہے ہیں کہ جنھوں نے بنفس نفیس کشمیر کے بے پناہ حسن کی رنگینیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور کشمیر اور کشمیری نوجوانوں کی تعریف وتوصیف میں بہت عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ غلام نبی خیال نے ان دونوں شاعروں کی ان نظموں کو بطور حوالہ پیش کیا ہے جن کا تعلق کشمیر اور کشمیریات سے ہے۔ فیض احمد فیض کو غلام نبی خیال نے " تلخئ امروز اور شیرینئ فردا کا شاعر" قرار دیا ہے۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری کے کئی تابناک اور انقلاب آگیں پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت جاندار اور بصیرت افروز ہے۔ ''کشمیری زبان میں تحقیقی ادب'' مختصر لیکن مدلل مضمون ہے جس میں اس بات پر اظہار تاسف کیا گیا ہے کہ کشمیری زبان میں تحقیقی ادب کا بہت حد تک فقدان ہے۔ "شورش کاشمیری کا زور خطابت" مضمون میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے شورش کاشمیری ایک سرفروش

مجاہد آزادی؛ بے باک فرزند وطن ہونے کے علاوہ قلم کے سپاہی اور ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے۔ جو اپنی تحریر و تقریر سے کشمیری عوام میں ذہنی بیداری کے خواہاں تھے۔ مضمون "چودھری خوشی محمد ناظر" جوگی کا شاعر" اپنے عنوان کے لحاظ سے تجسس آمیز ہے۔ اس مضمون میں صاحب مضمون نے خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر صاحب سابق گورنر و منسٹر ریاست جموں و کشمیر کہ جن کا پیدائشی تعلق اگرچہ لائل پور (پاکستان) کے ساتھ تھا لیکن ان کی زندگی کا ایک طویل عرصہ کشمیر میں گزرا ہے کہ جہاں وہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ کشمیر سے ان کی جذباتی وابستگی ان کے کلام سے مترشح ہوتی ہے۔ خاص کر ان کی نظم " کانگڑی" اور "فردوس زمین" کا تعلق براہ راست کشمیر اور کشمیری کلچر سے ہے۔ زیر نظر مضمون میں ان کی ایک اور طویل نظم "جوگی" کو بھی بطور حوالہ پیش کیا گیا ہے۔

سن 1958ء میں بخشی غلام محمد کے دور حکومت میں جب غلام نبی خیال کو ایک سازش کے تحت سیاسی مقدمے میں ملوث کر کے پس زنداں ڈال دیا گیا تھا تو کشمیر کے سینٹرل جیل میں ان کی ملاقات مولانا محمد سعید مسعودی سے ہوئی تھی کہ جنھوں نے غلام نبی خیال کو فارسی کی طرف راغب کیا تھا۔ چناں چہ فارسی کی اہم مطبوعات کا مطالعہ انھوں نے جیل ہی میں کیا تھا۔ غلام نبی خیال نے اپنی تصنیف "خیال قلم" میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ میں علمی و ادبی دنیا میں آج جس مقام و مرتبے پہ فائز ہوں یہ سب دو سال کی زنداں کی دین ہے۔ مولانا محمد سعید مسعودی کی علمی و ادبی بصیرت اور ان کے سیاسی افکار سے متاثر ہو کر غلام نبی خیال نے انھیں مفکر کشمیر قرار دیا ہے۔ ان کی مرنجان مرنج شخصیت پر بھی ایک مضمون کتاب ہذا میں شامل ہے۔ مضمون "علامہ اقبال کا سفر کشمیر" میں یہ بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں بار بار کشمیر آنے کی تمنا کروٹ لیتی رہی لیکن انھیں یہ سعادت

1921 میں صرف ایک بار نصیب ہوئی۔ اس مضمون میں علامہ اقبال کے مکتوبات کے حوالے سے ان کے سفر کشمیر کو تقویت دی گئی ہے۔ "اردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی" مشترکہ لسانی نوعیت کا مضمون ہے جس میں مضمون نویس نے اردو کی تشکیل اور اسکے اثر و نفوذ میں عربی؛ فارسی؛ ترکی؛ زبانوں کی حصے داری اور خاص کر ہندوستانی فلموں؛ ڈراموں؛ غزلوں؛ نعتوں؛ قوالیوں اور لوک گیتوں میں اردو کو جنوب ایشیائی ہم آہنگی کا اہم عنصر قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں جی۔ڈی گارڈے؛ محمد عمر؛ سر تیج بہادر؛ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے لسانی نظریات کو بطور حوالہ درج کیا گیا ہے۔

اختر محی الدین کشمیری زبان و ادب کے ایک بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار رہے ہیں کہ جن کی ادبی رفاقت ایک طویل مدت تک غلام نبی خیال کے ساتھ رہی ہے۔ کلچرل کانفرنس سرینگر کی ہفت روزہ میٹینگوں میں اختر محی الدین کی ادبی مباحثوں میں شرکت اور ان کی زبان دانی سے متاثر ہو کر غلام نبی خیال نے انھیں بلبل ہزار داستان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مضمون "یاران وطن جو چلے گئے" میں طاوس بانہالی؛ آزر عسکری اور تحسین جعفری کی شاعری؛ شخصیت اور یاد رفتگاں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "انگریزی اور کشمیری ادبی لین دین کا خوش آئند عمل" ایک ایسا مضمون ہے جس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ کشمیری اور انگریزی کے ادبی شہکار کے تراجم نے کس طرح ادبی لین دین کی راہ ہموار کی ہے۔ "کشمیری میں عقیدتی ادب کے تراجم" میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ بات باور کروائی گئی ہے کہ للہ عارفہ؛ شیخ العالم اور حبہ خاتون کے صوفیانہ کلام کے اردو؛ انگریزی اور فارسی میں تراجم نے تزکیۂ نفس کے باب کھولے ہیں۔

"گوئٹے اور دیوان مغربی" بھی ایک معلوماتی مضمون ہے۔ جس میں اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ گوئٹے کو سارے یورپ کا ایک ممتاز اور عدیم

المثال شاعر؛ ڈراما نگار؛ فلسفی؛ انشاپرداز اور ناول نویس تصور کیا جاتا ہے کہ جس نے فنون لطیفہ میں اپنے فنی کمال کے موتی بکھیرے ہیں۔ لیکن اسی گوئٹے نے جب حافظ شیرازی کے دیوان کا جرمن ترجمہ پڑھا تو اس ترجمے نے گوئٹے کی آنکھوں کے سامنے جہان نو کے دروازے کھول دیئے۔ "سعادت حسن منٹو اور کشمیر" میں غلام نبی خیال نے منٹو جیسے مشہور مگر بدنام زمانہ افسانہ نگار کے وہ طنزیہ ومزاحیہ خطوط درج فرمائے ہیں جو اس نے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ایک مضمون کی شکل میں لکھے ہیں۔ " کشمیر۔فیض اور فلمستان" میں فیض کی زندگی کا ایک نیا رخ سامنے لایا گیا ہے عام طور پر فیض کو ایک بلند پایہ شاعر خیال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن کشمیر کے پس منظر میں بنی فلموں مثلاً "دور ہے سکھ کا گاوں" "قسم اس وقت کی" جاگو ہوا سویرا" آرزو" برسات" کشمیر کی کلی" ایک پھول دو مالی" اور "جب جب پھول کھلے" جیسی فلموں کے گیت اور مکالمے فیض کی دین ہیں؛ یہ نئی بات ہے۔ مضمون "غلام رسول سنتوش۔ جیسا دیکھا ویسا پایا" میں کشمیر کے باکمال مصور غلام رسول سنتوش کی شخصیت؛ فن اور صاحب کتاب کے ساتھ دوستانہ مراسم کا ذکر نہایت جزباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ "اسرار الحق مجاز اور کشمیر۔ چند یادیں" بالکل ایک مختصر مضمون ہے جس میں مجاز کا مشاعروں کے سلسلے میں کشمیر آنے کا ذکر ہے اور ان کی نظم نیا کشمیر سے ماخوذ چند اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ مضمون۔ "مقبول فدا حسین۔ ایک تحفہ میرے لیے سب کے لیے " ہندوستانی کلاسیکی آرٹ کے ماہر مقبول فدا حسین کے فن اور ان سے جڑی یادوں کو درشاتا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک اور مضمون " کشمیری لال ذاکر۔ کشمیر کا گل صدرنگ" میں غلام نبی خیال نے اردو کے قد آور فکشن نگار کشمیری لال ذاکر کے ادبی مقام ومرتبے اور ان کی تخلیقات میں کشمیر کے فطری جمال وکمال اور وہاں کی تہذیب وکلچر کا ذکر کیا گیا ہے۔ "خیال نامہ" براہ راست غلام نبی خیال کے

سوانحی؛ تعلیمی؛ ادبی؛ سیاسی وسماجی پہلوؤں پہ محیط ہے اور اسکے مطالعے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں قدم قدم پہ آزمائشوں اور حالات کے جبر سے گزرنا پڑا ہے۔لیکن بلا آخر وہ ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق ایک بلند مقام پہ فائز ہو کے رہے۔" جشن خیال۔مرادآباد" غلام نبی خیال کی علمی؛ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ان کے جشن کی ایک دلچسپ اور پرلطف ادبی روداد ہے جسے محترمہ قمر قدیر صاحبہ ارم نے ترتیب دیا ہے۔"خیال قلم" میں شامل آخری مضمون فاروق ارگلی کا ہے جو" کشمیریات کا مجسم فکری زعفران زار۔غلام نبی خیال" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔

غلام نبی خیال کی تصنیف ''خیال قلم'' میں شامل تمام مضامین معیاری تحقیق وتنقید کا حسیں امتزاج کہے جاسکتے ہیں۔انھوں نے ادبی تحقیق کے طریقئہ کار کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ان تمام حقائق تک رسائی حاصل کی ہے جن کی بازیافت بغیر محنت شاقہ کے ممکن نہ تھی۔ تحقیق میں دلائل وشواہد اور حوالے وحواشی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔اس اعتبار سے دیکھیں تو انھوں نے حسب ضرورت معتبر حوالے پیش کیے ہیں۔تقریبا تمام مضامین میں اپنے موقف کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ حوالے دیے ہیں۔متقدمین کے کئی بیانات کو دلائل وشواہد کے ساتھ رد بھی کیا ہے۔جارحانہ تنقید کے بجائے وہ صحت مند تنقید کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ تحقیق وتنقید کے رشتے کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے دونوں کا حق ادا کردیا ہے۔دراصل غلام نبی خیال کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔اپنے اسی وسیع مطالعے کی بنیاد پہ انھوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔جو انھیں دور اور دیر تک ادب کی دنیا میں زندہ رکھیں گئے۔مثلاان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا اندازہ آپ کو ان کی مذکورہ کتاب سے ماخوذ اقتباسات سے ہوسکتا ہے۔بقول غلام نبی خیال:

" غنی کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔وہ ایک

ایسے خداداد کمال کا مالک تھا جس کی بدولت بسیار گوئی کے باوجود اسکے ایک شعر میں بھی کسی قسم کی سطحیت یا فن کی ذرہ بھر کمی نہیں پائی جاتی۔ اس کا ایک ایک مصرعہ ادب عالیہ کا نمونہ ہے۔ اگر چہ فارسی ادب کا یہ بیش بہا سرمایہ زمانے کی دست برد سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکا ہے لیکن غنی کے صرف وہی دو ہزار اشعار جو مزکورہ دیوان میں درج ہیں فارسی زبان کے کسی بھی مجموعۂ غزلیات سے کم پایہ کے نہیں"۔ص 100

" کشمیری زبان کی لسانیت؛ ادبیات اور ثقافتی پس منظر پر سنسکرت؛ عربی؛ فارسی اور خاص کر ہندی کے اثرات نمایاں طور پر واضح ہیں۔ ان زبانوں کا کشمیر کی وادی میں صدیوں تک چلن رہا ہے اور سنسکرت کی اہم کتابیں مثلاً کلہن پنڈت کی راج ترنگنی؛ سوم دیو کی کتھا سرت ساگر اور کھیمیندر؛ ابھینو گپت؛ آنند وردھن اور دیگر قلم کاروں؛ تاریخ دانوں اور نقادوں کی ساری تصانیف تو سنسکرت ہی میں موجود ہیں"۔ (ایضاً" ص 298)

میرے خیال میں اچھی کتاب اپنے قارئین خود پیدا کرتی ہے۔ ادبی جمالیات اور ادبی مقاصد کی اہمیت وافادیت کل بھی تھی آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ معلوم یہ ہوا کہ وسیع مطالعے؛ گہرے مشاہدے؛ تفکر وتدبر کی رنگینیوں ؛قوت ادراک اور زبان وبیان کی خوش اسلوبیوں کے بغیر ادبی شاہکار عالم وجود میں نہیں آتے۔ غلام نبی خیال اپنی عمر کی آٹھویں دھائی میں داخل ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کا علمی وادبی ذوق وشوق مزید نکھرتا سنورتا چلا جا رہا ہے۔ کاغذ؛ قلم اور کتاب کے ساتھ ان کا رشتہ بہت پرانا اور اٹوٹ معلوم ہو رہا ہے۔ خدا کرے وہ اسی بے لوث جذبے کے تحت علم وادب کے موتی بانٹتے رہیں۔

موبائل:9419336120

خیال قلم

سیفی سرونجی

غلام نبی خیال اُردو ادب کی نامور ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی سیاسی اور ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ قومی کونسل اور دیگر اداروں سے منسلک رہے ہیں۔ اتنی مصروفیات کے باوجود وہ تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھتے رہے۔ کئی کتابیں ان کی شائع ہو چکی ہیں لیکن میرے سامنے اس وقت ان کی کتاب ''خیال قلم'' ہے، جس کے فلیپ پر جو تحریر ہے وہ پیش کرتا ہوں تا کہ ان کی شخصیت کے بارے میں واقفیت حاصل ہو سکے:

''غلام نبی خیال ریاست جموں و کشمیر کے ایک ممتاز شاعر، ادیب، محقق، ترجمہ کار اور صحافی ہیں۔ وہ بیک وقت تین زبانوں اُردو، انگریزی اور کشمیری میں لکھتے ہیں۔ اب تک ان کی اٹھائیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان میں سے ان کی ایک کشمیری تصنیف کو ریاستی کلچرل اکادمی کا اعزاز 1974 ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 1975 اور ایک انگریزی کتاب کو ریاستی حکومت کی طرف سے بہترین کتاب کا سالانہ اعزاز 2010 بھی دیا گیا ہے۔ گزشتہ زائد از نصف صدی کے دوران ادبی اور صحافتی خدمات کے عوض خیال صاحب کو پندرہ بین الاقوامی اور ریاستی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔''خیال قلم'' اردو میں مصنف کی آٹھویں کتاب ہے

اوران کی مزید چھ مطبوعات اس وقت زیر تکمیل ہیں۔ خیال صاحب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی کی مجلس عاملہ اور ریاستی سرکار کی لائبریریز کی کمیٹی کے بھی رکن ہیں"

اس اقتباس سے غلام نبی خیال صاحب کی ادبی حیثیت اور مقام ومرتبہ کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس پایہ کے ادیب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ غلام نبی خیال کشمیر کی آبرو ہیں۔ "خیال قلم" میں ان کے منتخب مضامین شامل ہیں جو اردو کی اہم ہستیوں پر ہیں، جس کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

چنار کے رنگ، اقبال کشمیر، ذکر رومی اور ان کے ہم عصر مشاہیر، شیخ یعقوب صرفی، غنی کشمیری، جوش اور حفیظ کی شاعری میں کشمیریات، فیض احمد فیض، کشمیری زبان میں تخلیقی ادب، شورش کاشمیری کا زور خطاب، خوشی محمد ناظر جوگی شاعر، مفکر کشمیر مولانا سعید مسعودی، علامہ اقبال کا سفر کشمیر، اردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی، اختر محی الدین بلبل ہزار داستان، یاران وطن جو چلے گئے، انگریزی اور کشمیری کا لین دین اور کشمیر کے اہم ادبی شعراء پر بہت ہی جامع مضامین ہیں۔ 28 کتابوں کے مصنف غلام نبی خیال نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ جس کی تفصیل کے لئے تو ایک دفتر درکار ہوگا۔ ان کی ہر کتاب اہم موضوع پر ہے اور کشمیر تو ان کی روح میں بسا ہے جس کا اظہار وہ اکثر مضامین میں کرتے رہے ہیں۔ "خیال قلم" بھی زیادہ تر کشمیری ادب سے متعلق ہے۔ غلام نبی خیال چونکہ ایک محقق شاعر کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں اس لئے ان کو زبان وبیان پر عبور حاصل ہے۔ جو بات کہتے ہیں اپنے منفرد انداز اور دلائل سے کہتے ہیں۔ فیض، جوش، اقبال اور منٹو پر ان کے بہت ہی معلوماتی اور اہم مضامین ہیں۔ حالانکہ اُردو میں شاعری نہیں کرتے بلکہ انھوں نے اولیت کشمیری زبان کو دی ہے اور کشمیری زبان میں ہی شعر کہتے ہیں، لیکن

ان کا اردو میں بھی بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ایک سچا اور بڑا ادیب سب سے پہلے اپنی مادری زبان اور اپنے وطن کی خوشبو سے سرشار ہوتا ہے اور اپنے لئے اظہار کا وسیلہ بھی اپنی مادری زبان کو بناتا ہے۔ غلام نبی خیال نے اپنے وطن جنت نظیر کشمیر سے بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے علاوہ جن شاعروں، ادیبوں پر بھی انہوں نے لکھا، اُن کا کشمیر سے تعلق بھی بتایا۔ کشمیر کا حسن ثقافت سے لے کر گویا کشمیری ادب کی تاریخ مرتب کر دی ہے، جوش اور حفیظ کی شاعری پر لکھتے ہیں:

''اُردو زبان کے متقدمین سے لے کر آج تک کے ہم عصر شعراء نے وقتاً فوقتاً کشمیر کی تعریف وتوصیف میں قصیدہ خوانی کی ہے۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں برصغیر کے جو سخن ور کشمیر کے مدح خوان بنے اُن میں علامہ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نواب جعفر علی خان، اثر لکھنوی، چودھری خوشی محمد ناظر، فانی بدایونی، محمد دین فوق، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں عاشقان کشمیر کے اس قافلے میں ساغر نظامی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، شاہد عزیز، روش صدیقی، شاذ تمکنت، راہی معصوم رضا، وامق جونپوری اور شمیم کرہانی بھی شامل ہو گئے۔ روش صدیقی نے تو سرزمین کشمیر پر نازل شدہ حسن فطرت کی شکل میں الٰہی فیضان کی مدحِ خوانی میں ایک پورا شعری مجموعہ ''خیاباں خیاباں'' تخلیق کیا''۔

غلام نبی خیال نے اپنی وطن پرستی اور کشمیر میں پیدا ہونے کا حق ادا کر دیا کہ ہمیشہ لکھتے وقت خواہ وہ کسی موضوع پر لکھا ہو، کشمیر ہمیشہ ان کے ذہن میں رہتا ہے۔

'خیال قلم''، میں جتنے بھی مضامین ہیں اُن میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں کشمیر موجود ہے۔ یہی ایک سچے اور بڑے فن کار کی پہچان ہے کہ وہ اپنی زمین

اپنے وطن کی خوشبو کو اس طرح محسوس کرے کہ وہ اس کی روح کا ایک حصہ بن جائے اور غلام نبی خیال اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

(سہ ماہی ''انتساب'' سرونج، مدھیہ پردیش، فروری تا اپریل 2016ء)



''غلام نبی خیالؔ: ایک مطالعہ''

ڈاکٹر شفیق سوپوری

''غلام نبی خیال: ایک مطالعہ'' اسی سال اشاعت پذیر ہونے والی ایک ایسی تصنیف ہے جس میں ریاستِ جموں وکشمیر کے ایک بلند پایہ شاعر، نقاد، محقق، تاریخ دان، ترجمہ نگار اور عالمی شہرت یافتہ صحافی غلام نبی خیال کی حیات، شخصیت اور کارناموں پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک جواں سال قلم کار ڈاکٹر رفیق احمد بانڈے ہیں جن کا تعلق ضلع بڈگام سے ہے۔ رفیق احمد بانڈے کشمیر کے اردو قلم کاروں کی نئی نسل میں کافی پرجوش اور پرامکان دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کے مضامین اگرچہ ان کی ادبی صلاحیتوں کا تعارف پہلے ہی پیش کر چکے ہیں مگر زیرِ نظر تصنیف میں ان کا زورِ قلم اور نکھر کے سامنے آیا ہے۔ وہ کافی پڑھے لکھے ہیں اور فی الحال درس وتدریس سے وابستہ ہیں لہازا ان سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ انھوں نے خیال شناسی کے سلسلے کا باضابطہ آغاز کر کے اس موضوع کے تعلق سے مزید دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کئی راہیں ہموار کی ہیں۔

غلام نبی خیال. ادب کے طلسم خانے کا ساتواں دروازہ کھولنے والا ایک ایسا شخص ہے جس کی ذات ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس کے ہر آئینے میں کئی ساحرانہ صورتیں نظر آتی ہیں، یہ صورتیں اگرچہ خدوخال سے جداگانہ ہیں مگر ایک

دوسرے کے وجود کا اعتراف کرتی ہیں۔ ایک شخص جو پیدائشی تخلیق کار ہے اور جس کے قلم کی شہ رگ میں دوڑنے والی شے جسے سیاہی کہتے ہیں جب صفحہ قرطاس پر اتر کے تخلیق کو جنم دیتی ہے تو روشنی بن جاتی ہے اور پھر صریرِ خامہ نوائے سروش کی صورت میں فکر و خیال کے مسافروں کے لیے بانگِ درا بن کر گونجتی ہے۔ پھر ایک ایسے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے. جس کے ہر پڑاؤ پر ایسی طلسماتی سرا تعمیر ہو جاتی ہے. جس میں خیام کے پرسوز نغموں پر لفظوں کی اپسرائیں تخیل کے الاؤ کے سامنے وہ رقص کرتی ہیں کہ تشنگان علم کے پیمانے چھلکنے لگتے ہیں. اور جب ساز کی لے اقبال کی فکر کے آہنگ پر تھرکتی ہے تو عشق کی ایک جست قصے کو تمام کرتی ہے۔

ایک آئینہ ایسا ہے. جس میں ایک شاعر اپنے نغموں کے ساز پر اپنے چاہنے والوں کے دلوں کو بھرماتا ہے۔ ایک آواز درد سے روشن، فکر و خیال اور جذبہ و احساس سے دمکتی لفظوں کے زیر و بم سے دلوں کو تلپٹ کرتی. یہ آواز صرف غلام نبی خیال کی ہی ہو سکتی ہے، جو کبھی پری محل کی سرگوشی بن جاتی ہے اور کبھی شہدائے کشمیر کی تربتوں پر احتجاج کی گونج پیدا کرتی ہے۔ کبھی خون آلودہ جھیلِ ڈل کے کنارے پر اقبال کے خضر کی طرح سوچتی ہے کہ آزادی کی منزلوں پر خون کے خیمے نصب کرنے والے مسافروں کو کب سراب کی اوٹ سے انقلاب کی ندی بہتی نظر آئی گی۔ کتنے نغمے ایسے ہیں جو درد کی مضراب سے پھوٹ کر فیض احمد فیض کی اندوہناک سسکیوں میں ڈھل جاتے ہیں۔

اور یہ آئینہ بھی دیکھتے جایئے ایک تنقید نگار، جس کی آنکھوں میں تحقیق کا ایسا نشہ ہے جو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ اس آئینے میں کئی عکس جھلک رہے ہیں۔ خیابانِ کشمیر، فغانِ کشمیر، چنار رنگ..... کشمیر کی تہذیب و تمدن اور ادبیات و شعریات سے خیال کی گہری محبت کا گیروا رنگ ہر تصویر کو تصویرِ جاناں بنا دیتا

ہے۔قلم کے رنگ منچ پر ایک کردار صحافی کا بھی ہے......ایک نڈر، دلیر اور بے باک صحافی، جس نے سچائی بیان کرنے کے لئے نہ تلوار اٹھائی اور نہ منھ پر ڈھاٹا باندھا......قلم کی نوک کو جراح کا پچھنہ بنایا اور سماج اور سیاست کی فصد کھول دی۔

اگر چہ خیال شناسی کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا ہے مگر ڈاکٹر رفیق احمد بانڈے کی تصنیف ''غلام نبی خیال :ایک مطالعہ'' اس وجہ سے موضوع کے اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں خیال کے جملہ ادبی، علمی اور صحافتی کارناموں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔خاص کر غلام نبی خیال کی شخصیت کے باب میں ان کے سوانحی کوائف کا خاکہ پیش کر کے رفیق احمد بانڈے نے تحقیق دانوں کے لیے کئی راستے ہموار کیے ہیں۔کیونکہ خیال صاحب ماشاءاللہ ابھی بقید حیات ہیں لہٰذہ تمام حوالوں کو باوثوق تصور کیا جائے گا۔

ادبی، ذہنی وسیاسی پسِ منظر کے ضمن میں خیال صاحب کے عہد، شعرو شاعری سے ان کے ذہنی رجحان، کشمیر کے سیاسی، ادبی اور تہذیبی حالات کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا حال نہایت مدلل طریقے سے بیان ہوا ہے۔اس کے بعد خیال کے ان کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو انھوں نے تحقیق وتنقید، ترتیب وتدوین، صحافت اور تراجم کے میدان میں سرانجام دئے ہیں۔اس باب سے خیال کی ادبی، علمی اور صحافتی شخصیت کا بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔مصنف نے غلام نبی خیال کی شاعری کا مختصر مگر کارآمد جائزہ لیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب خیال شناسی کا سنگ بنیاد قرار دی جاسکتی ہے۔ کتاب 340 صفحات پر محیط ہے۔طباعت اچھی ہے۔قیمت 300 روپے۔خرید کر پڑھنے کی چیز ہے۔یہ بلاشک ذاتی کتب خانے کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

☆☆☆

فغانِ کشمیر

سالک دھامپوری

زیرِ نظر مجموعہ اصل میں جناب غلام نبی خیال کی بے پناہ محنت و عرق ریزی کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ اصل میں اس مجموعہ میں مصنف نے کشمیر کے عنوان پر ہندوپاک کے شعراء کی تخلیقات یکجا کردی ہیں۔ بلاشبہ یہ مجموعہ اپنے مقصد اور ترتیب کے اعتبار سے ایک کامیاب اور لائق تحسین مجموعہ ہے۔ اس میں موجود نظمیں اور غزلیں کشمیر میں ہونے والا کشتِ وخون اور وہاں کے حکمران اور فوجی نوجوانوں کی صحیح تصویر کشی کرتی ہے۔ اس بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ کیا کشمیر کے نوجوانوں کو اپنی آزادی کے لئے مسلح اقدامات کرنا چاہیے۔ یہ بات پوری طرح اس مجموعہ میں موجود نظموں اور غزلوں سے واضح ہوجاتی ہے کہ وہاں پر موجود مسلح فوجی دستے عوام پر بے پناہ ظلم ڈھا رہے ہیں اور اس بے پناہ ظلم کے باوجود کشمیری خوددار نوجوانوں کے جذبہ حریت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

جہاں تک غلام نبی خیال کی شاعری کا تعلق ہے تو اُن کی نظموں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں اور ان کے دل میں مظلوموں، لاچاروں اور بے بس انسانوں کے لئے جو درد ہے وہ اُن کے اشعار سے متشرح ہوجاتا ہے۔ اس مجموعہ میں بہت سے شاعروں کا کلام ہے جو

کشمیر کے موضوع پر ہے اور بعض شعراء کو چھوڑ بیشتر شعراء نے کشمیر میں ہونے والے ظلم وستم پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

بعض غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر میں حریت پسند نوجوانوں کے لئے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار خصوصی طور پر قابل توجہ اور جرأت مندانہ پہلو سے بے مثال کہے جاسکتے ہیں:

مولانا ظفر علی خان صفحہ بیس پر اپنی تخلیق ''نالہ شب گیر'' میں اس شعر میں کشمیریوں کا قصور اس طرح بتارہے ہیں:

ہے خطا اتنی کہ کیوں کرتے ہیں اپنا حق طلب
ہیں یہ ساری سختیاں خمیازہ اس تقصیر کا

غلام نبی خیاؔل کی نظموں میں بلا کا درد، احساس محرومی، بے بسی اور خون کے آنسوں موجود ہیں۔ وہ اپنی ایک نظم ''بھائی'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

میرے بھائی
ایک دکھیاری ماں کی وہ فریاد تو سن لو
جو اس قبرستان کے گوشہ میں چلائی
جس میں چھپا ہے درد جدائی
وہیں پہ وہ دو سال کا بچہ

(یہ بچہ ثاقب تھا جس کی عمر صرف دو سال تھی۔ اس بچے کو اُس وقت 7 جون 1990ء کو مسلح دستوں نے گولی مار کر ہلاک کردیا تھا جب وہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا)۔

ایک دوسری نظم ''خون کی خوشبو'' میں ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

تمہارا خون خون تھا اور خون پانی نہیں ہوتا
فنا معصوم ہوتا ہے مگر وہ فنا نہیں ہوتا

اس شعر کا پس منظر وہ لکھتے ہیں کہ 21 دسمبر 1990ء کو سری نگر میں مسلح دستوں نے کالج کے تین طلباء حنیف بابا، امتیاز سعید اللہ، مظفر احمد کو گولیوں سے بھون ڈالا، جب کہ وہ اپنے شناختی کارڈ اور کتابیں دکھا کر واضح کر رہے تھے کہ وہ طالب علم ہیں۔ اُن کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اُن کی ایک نہیں سنی گئی۔

بلاشبہ کشمیر کے حالات انتہائی ناساز گار ہیں اور اب تو وہاں کے وزیر اعلیٰ جناب فاروق عبداللہ صاحب کے حق خود اختیاری کی مانگ گویا حریت پسندوں کو تقویت پہنچاتی ہے۔ شاید فاروق عبداللہ کشمیر کے انقلابی اور خود دار نوجوانوں کے جذبات سے متاثر ہو گئے ہیں، جن کی ترجمانی اس مجموعہ میں جناب شفقت مرزا نے اس طرح کی ہے:

لیکن اے وقت کے جبار خداؤ سن لو
ظلم کی کھیتیاں سرسبز نہیں ہوسکتیں
جو تمنائیں مچل اُٹھیں جواں سینوں میں
موت کی نیند جو چاہو تو نہیں ہوسکتیں

اسی طرح اس مجموعہ میں ریاض الرحمٰن ساغر کے قلم نے نوجوانوں کو اس طرح للکارا ہے اور اپنی حمایت کا ان کو یقین دلایا۔

اے وادیٔ کشمیر کے خود دار جوانو
اس جدوجہد میں نہیں تنہا تری شمشیر
ہم ساتھ تھے ہم ساتھ ہیں ساتھ رہیں گے
اب ٹوٹنے والا ہے ہر اک حلقہ تقصیر

اسی کے ساتھ جناب سلمان رضوی صاحب اپنی نظم ''اُمید صبح'' میں کشمیری عوام کو شاید یہ خوشخبری سنانے کو مجبور ہیں:

انشاء اللہ پھول کھلیں گے فصل بہاراں آئے گی
اب دکھ درد کی ماری دنیا ساعتِ درماں آئے گی
ظلم کا حد سے آگے بڑھنا ظالم کی پسپائی ہے
مظلوموں کی ہر بستی میں صبح درخشاں آئے گی

جناب غلام نبی خیال کی یہ کوشش اور محنت قابل قدر ہے۔ ان کی جرأت مندی بھی قابل قدر ہے کہ انھوں نے کشمیر کے موضوع پر ان شاعروں کے کلام کو یکجا کیا جو کشمیر کے موجودہ حالات سے بری طرح پریشان اور نالاں ہیں۔
جناب غلام نبی خیال کی اپنی نظمیں اس مجموعہ میں بہت سی ہیں اور ان کی نظموں میں درد ہے، فغان ہے، آہ ہے، ٹیس ہے، فکر ہے، غم ہے اور زندگی کو درخشاں اور جنت نشاں بنانے کی اُمنگ ہے، تڑپ ہے۔ یہ سب باتیں اس مجموعہ کے مطالعہ کے بعد آپ سے آپ سمجھ میں آجائیں گی۔

کتاب کی طباعت نفیس اور عمدہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں موجود تمام تخلیقات کی مناسبت سے اس کا نام "فغانِ کشمیر" بہت ہی موزون رکھا گیا۔

(E-35-B م، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئ دہلی، 110025)



”کشمیر کی وادی“

خالد حسن

وادیٔ کشمیر اور اہل کشمیر کے طرزِ زندگی، رسم و رواج، بود و باش اور رہن سہن پر کئی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ ان میں سب اپنی جگہ اور اپنے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔ واضح ہو کہ یہ کتاب دراصل لارنس کے ذریعے انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ اس سے قبل کئی مترجمین اس کتاب کا اُردو ترجمہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

غلام نبی خیال جو خود قابل مصنف و صحافی کے علاوہ کشمیری باشندے بھی ہیں وہ اس ترجمے کے لیے مناسب تھے، کہ وہ نہ صرف اصل عبارت بلکہ طرز معاشرت سے بھی بھرپور آگہی رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے وہاں کے حکمرانوں کے اوصاف کے ساتھ ساتھ اُن کے دور میں عوام جن مشکلات سے گزر رہی تھی اُس کو وضاحت سے بیان کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

لارنس کی یہ تاریخی ضخیم کتاب مختلف نوع کے اُنیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائیہ، بیانیہ، ارضیات، نباتات، حیوانات، آثار قدیمہ، سیاسی تاریخ، مادی تاریخ، اعداد و شمار، سماجی زندگی، مذاہب، نسلیں اور قبیلے زراعت اور کاشتکاری، مال اور مویشی، صنعتیں اور کاروبار، تجارت، قدیم انتظامیہ جدید بندوبست اور زبان و لسانیات۔

لارنس نے ان ابواب کی تقسیم میں پورے کشمیر نیز وہاں کی ہر چیز کو اپنی کتاب میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے جو کافی دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔تاریخی نوعیت کی یہ ضخیم کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔لارنس نے یہاں کی زبان، کردار، رسم ورواج کے علاوہ اہل کشمیر کے مخصوص لباس اور بود وباش کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ کشمیر کی سلطنتیں ہمیشہ تنازعہ کا شکار رہی ہیں۔ مصنفین کے ذریعے یہاں کے ناقص انتظامی امور کا ذکر بڑی وضاحت اور صاف گوئی سے کیا گیا ہے۔نااہل سلطنت کی سزا بے قصور عوام کو جھیلنی پڑی۔

لارنس نے بھی اپنی تصنیف میں حکومت کی خامیوں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے، لیکن عوام کو بے قصور اور دیانت پسند تحریر کیا ہے۔پھل وغیرہ کو بھی لارنس نے اپنی کتاب میں دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

فن تعمیر یوروپی طرز پر ہے۔ کشیدہ کاری بھی مثالی ہے۔ ہندوستان میں کشمیر کی تاریخ سے متعلق ہمیشہ تضاد رہا۔لیکن یورپی علمانے اس پر گہری نظر رکھی اور وہاں کے تاریخ دانوں نے کافی محنت ولگن سے یہاں کی قدیم تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ ان میں لارنس ایک عظیم نام ہے جنھوں نے اپنی تصنیف میں جس بصیرت سے کشمیر کی تاریخ کو پیش کیا ہے وہ قابل غور امر ہے۔ علاوہ ازیں یورپی دانشور نے کشمیر کے تاریخی پہلوؤں کو منظر عام پر لانے میں کشادگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر ہوریس ہیمین ولسن نے 1825ء میں کشمیر کی ہندو قدیم تاریخ پر اپنا مقالہ شائع کیا جو کشمیر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعداد وشمار، ارضیات کی تقسیم اور اس کا نظم ونسق کشمیری زمین پر معدنیات کے علاوہ نباتات میں کستوری، زعفران جیسی بیش قیمت شے اور جڑی بوٹیاں،

کشمیریوں کا رہن سہن و بود و باش اور ان کے پیشے سے متعلق اطوار کو بھی بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ایسے ہی ذاتی تفریق ہندو اور مسلمان دونوں میں موجود ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں چھتری، برہمن، دلت اور مسلمانوں میں شیخ، سید، مغل اور پٹھان کے علاوہ شیعہ مسلم اور سنی مسلم کا ذکر بھی خوبصورت اور دلچسپ انداز میں ہے۔

حیوانات جن سے نہ صرف روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں بلکہ لباس کے لیے ریشم اور اون، کھانے میں عمدہ شہد بھی حیوانات سے ہی میسر آتا ہے۔

طوالت سے قطع نظر باقی تمام طرح سے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے جو اہل اُردو اور محبّ زبان کے لیے قیمتی معلومات کے ساتھ سچائی، جاں نثاری اور قوت ارادی کا درس دیتی ہے۔

غلام نبی خیال نے بھی اپنی مترجمانہ صلاحیت کے ذریعے اس کتاب کو جو جلا بخشی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ غلام نبی خیال نے اس کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے عظیم فنکاروں اور دانشوروں کی صف میں اپنی موجودگی ہی درج نہیں کرائی بلکہ اُردو ترجمہ کو ایک نئی جہت بھی عطا کی ہے۔ امید ہے کہ اس سے اہل اُردو کشمیر کی تاریخ اور حالات سے باخبر ہوسکیں گے۔ قومی کونسل بھی مبارکباد کی مستحق ہے جس نے عظیم نایاب نسخے کا ترجمہ کرانے میں ایک بہترین مترجم کا انتخاب کیا۔

(ماہنامہ "اردو دنیا"، نئی دہلی، اکتوبر 2014ء)

69-273، گراونڈ فلور، گلی نمبر 10، غفار منزل، نئی دہلی



تصانیفِ خیال

کشمیری:

1۔ لولک پرتو (پرتوِ عشق): شاعر کے کشمیری کلام کی اولین شیرازہ بندی۔ سولہ صفحات پر مشتمل یہ ایک کتابچہ ہے جس میں خیال صاحب کی ابتدائی شاعری شامل ہے۔ اسے 1959ء میں شائع کیا گیا اور اُس وقت اس کی قیمت چار آنے رکھی گئی۔ لولک پرتو کا پیش لفظ پروفیسر رحمان راہی نے لکھا ہے۔

2۔ رباعیات عمر خیام: کشمیری زبان میں یہ خیال صاحب کی مقبول ترین کتاب ہے۔ یہ مشہور فارسی شاعر عمر خیام کی منتخبہ 150 رباعیات کا منظوم ترجمہ ہے جسے مترجم نے براہ راست فارسی الاصل سے کیا ہے۔ ترجمے کا پیش لفظ فارسی میں ہند میں ایران کے سابق ثقافتی کونسلر ڈاکٹر محمود تفضلی نے لکھا ہے۔ کتاب میں کشمیری مصور مرحوم موہن رینہ کی قلمی تصاویر بھی شامل ہیں۔ سال اشاعت: 1961، قیمت: تین روپے۔ اس کتاب کا دوسرا ڈی لکس ایڈیشن 2007 میں نہایت اہتمام سے آرٹ پیپر پر شائع ہوا اور اس میں سرکردہ ایرانی مصور اکبر تجویدی کی سولہ رنگین تصاویر شامل کی گئیں۔ اس ترجمے میں خیام کی مزید پچاس رباعیات کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے اس کا آغاز خیالؔ صاحب اپنے اس طبع زاد فارسی قطعے سے کیا ہے:

نغمۂ عشرت، فغانِ غم، حدیثِ سوز وساز
اہل دل را تحفہ اربابِ حال آوردہ ام
نوش کن تا رازہائے بستہ گردند آشکار
بادۂ خیامؔ در جامِ خیالؔ آوردہ ام

کشمیری زبان میں آج تک ایسی خوبصورت کتاب شایع نہیں ہوئی ہے۔کتاب کا تیسرا ایڈیشن زیر ترتیب ہے۔

3۔ پراگاش (صبحِ نو): 1954 سے تک شاعر کے کلام کا انتخاب۔ چھیانوے صفحات کے اس مجموعے کا پیش لفظ شمیم احمد شمیم نے لکھا اور میر غلام رسول نازکی، رحمان راہی اور علی محمد لون نے اس پر اپنے تاثرات قلم بند کئے جو کتاب کے اخیر پر درج ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپے۔1962ء

4۔ پوئیٹکا: ارسطو کی مشہور عالم ادبی تنقید کی اولین کتاب۔ غلام نبی خیال نے 38 صفحات پر مشتمل ایک مبسوط پیش لفظ کے ساتھ اس کا کشمیری ترجمہ کیا ہے یہ کشمیری زبان کی پہلی کتاب ہے جس کے اخیر پر انڈکس (اشاریہ) موجود ہے۔ قیمت تین روپے۔شاہین بک سٹال، سرینگر،1962

5۔ ویور (پھولوں کا رس): ہندی شاعر سمترا نندن پنت کے منتخب ہندی کلام کا کشمیری ترجمہ جس میں خیالؔ کے ساتھ ساتھ جیالال کول اور پرتھوی ناتھ پشپ اور کئی کشمیری شعرا کے تراجم بھی شامل ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔1960

6۔سام نامہ: کشمیری شاعر لکھمن کول بلبل کی مثنوی کے قلمی نسخے کی تدوین و ترتیب۔ خیال صاحب کے ایک جامع مقدمے کے ساتھ۔کلچرل اکیڈیمی سری نگر۔1962

7۔زنجورہ ہند ساز (سازِ زنجیر): فروری1958 میں غلام نبی خیال کو ایک سیاسی مقدمے میں ملوث کر کے دو سال کے لیے سری نگر کے سنٹرل جیل میں نظر بند کیا گیا۔ یہ مجموعہ کلام اسی قید و بند کے دوران مکمل ہوا جس پر جگہ جگہ فیض احمد فیض کا اثر نمایاں طور پر نظر آئے، اس کا آغاز شاعر نے مجروح

سلطانپوری کے اس شعر سے کیا ہے:

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غمِ جاناں، دردِ وطن
کیا کہیئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

سال اشاعت:۔1963ء

8۔سون ادب (ہمارا ادب): کشمیری ادب کا سالانہ انتخاب۔ ترتیب وتدوین: غلام نبی خیال۔ کلچرل اکیڈیمی سری نگر۔1963

9۔محمود گامی: کشمیر کے فردوسی اور برگزیدہ شاعر محمود گامی کے کلام کا انتخاب جسے خیال صاحب نے ایک تحقیقی مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے کتاب میں گامی کی مثنویات، منظومات، غزلیات اور متفرقات کا انتخاب شامل ہے۔ کلچرل اکیڈیمی سری نگر۔1964ء

10۔کاشُر نثر (کشمیری نثر): کشمیری زبان کے سالہا سال کے نثری سرمائے کا انتخاب جو غلام نبی خیال اور اوتار کشن رہبر نے مل کر کیا اور اس کام میں تین سال لگے۔ بدقسمتی سے جب رہبر نے مسودہ اکیڈیمی کو برائے اشاعت پیش کیا تو مرتبین میں سے خیال کا نام حذف کیا جسے رہبر کی ادبی خیانت ہی کہا جاسکتا ہے۔ کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔1967ء

11۔گاشری منار (روشنی کے مینار): یہ ضخیم کتاب مصنف کی گیارہ سالہ عرق ریزی کا ماحصل ہے۔ اس میں خیال صاحب نے دنیا کے دس عظیم شاعروں پر تحقیقی اور تنقیدی مقالے لکھے ہیں جو دنیا بھر میں اپنی مادری زبانوں کی سخن گوئی کے لیے عالمی اور ابدی دوام حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں ہومر (یونانی)، ورجل (لاطینی)، کالیداس (سنسکرت)، امراء القیس (عربی)، ڈانٹے (اطالوی)، حافظ (فارسی)، شیکسپیر (انگریزی)، پشکن (روسی)، گوئٹے (جرمن)، اقبال (اردو) اور ٹیگور (بنگالی) شامل ہیں۔ اس تصنیف کو 1975ء

میں ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی انعام ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دی گیا۔اس سے قبل ''گاشری منار'' کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے اولین انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ صفحات : پانچ سو پچیس، قیمت: پچیس روپے، ادارۂ ہفت روزہ اقبال سرینگر۔1972

12۔اکہ نندُن: کشمیری دیومالا پر مبنی مشہور لوک کتھا کی نئی ترتیب و تدوین جس میں مرتب نے مختلف کشمیری شاعروں کے تحریر کردہ اکہ نندُن ایک جگہ جمع کر کے ان تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔اس کتاب میں کشمیری سخن وروں بہادر گنائی، رمضان بٹ، تاراچند بسمل کشمیری، صمد میر اور عبدالاحد زرگر کے اکہ نندن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کشمیر کلچرل اکیڈیمی سری نگر، 1974

13۔میڈیا: قدیم یونان کے سرکردہ المیہ نگار یوری پیڈیز کے شہرۂ آفاق ڈرامے ''میڈیا'' کا کشمیری ترجمہ جو کشمیری زبان میں کسی یونانی کلاسیکی شاہکار کا پہلا ترجمہ ہے۔ترجمے کے اخیر پر یونان کے قدیم اسماء کی تشریح کی گئی ہے۔ شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، 1998ء

14۔ قلم پارہ: کشمیری زبان وادب پر مصنف کے مقالات کا مجموعہ اس کا پیش نامہ امین کامل نے تحریر کیا ہے۔ کشمیری رائیٹرس کانفرنس سری نگر 2003

15۔گلزارِ خیال: شاعر کی اُن غزلیات اور نغمات کا مجموعہ جو اکثر و بیشتر ریڈیو کشمیر سری نگر، سرینگر ٹیلی وژن اور ساز و آواز کی محفلوں میں موسیقی کی دھنوں پر سجا کر گائے جا رہے ہیں۔ کشمیری رائیٹرس کانفرنس سری نگر 2004

16۔الہام: شاعر کے منتخب کشمیری کلام کی شیرازہ بندی جس میں 1970 کے بعد کا انتخاب شامل ہے۔کتاب کے آخری صفحات پر خیال صاحب کی تخلیقات اور فن پر احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید عشرت، شاہد بڈگامی، علی محمد لون، امین کامل، پروفیسر ترلوکی ناتھ رینہ، پروفیسر نصرت اندرابی، شمس الرحمان فاروقی،

ابرار رحمانی مدیر آجکل دہلی، روزنامہ نوائے وقت لاہور، کشمیر ٹائمز جموں، گریٹر کشمیر سری نگر، ڈاکٹر اکبر حیدری، سالک رامپوری، رحمان راہی، شمیم احمد شمیم، میر غلام رسول نازکی اور ڈاکٹر محمد یوسف بخاری، لاہور کے تاثرات شامل ہیں۔ کشمیری رائیٹرس کانفرنس سری نگر۔2005

17۔ اختر محی الدین: کشمیری زبان کے اس بے مثال افسانہ نگار اور ناول نویس کی حیات اور فن پر ایک مونوگراف۔ کشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔2012

اردو

18۔اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر: علامہ اقبال کی تحریک آزادی کشمیر کے تئیں عدیم المثال خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ۔ کشمیری رائیٹرس کانفرنس سری نگر 1997 ۔اس تصنیف کا طبع ثانی اقبال اکیڈیمی لاہور، پاکستان نے 200 میں شایع کیا۔ تیسرا ایڈیشن خیالات پبلکیشنز سری نگر نے 2011 میں منظر عام پر لایا اور چوتھا ایڈیشن گلشن پبلشرز سری نگر کشمیر کی طرف سے 2016 میں اشاعت پذیر ہوا۔

19۔خیابانِ کشمیر: کشمیر کی سات سو سالہ شاعری کے انتخاب کے اردو میں منظوم تراجم کا ایک گلدستہ جسے غلام نبی خیال نے مرتب کیا ہے۔اس مجموعے میں چالیس کشمیری شعراء کا انتخاب شامل ہے جن کی تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ کشمیر کلچرل اکیڈیمی سری نگر۔1998

20۔ کاروانِ خیال: خیال صاحب کا ایک منفرد کارنامہ۔اس کتاب میں مصنف نے کشمیر کی ادبیات۔ ثقافت، لسانیات اور دیگر موضوعات کے علاوہ عالمی ادبی دنیا کے چند اہم مضامین پر تحقیقی مقالے قلم بند کیے ہیں جن میں

کزمیری شاعری پر تحریک آزادی کے اثرات، اقبال، حافظ اور گویٹے۔ سلسہ محسوسات، ارسطو اور فنِ شاعری، سفر نامہ عراق، رباعیات عمر خیام پر تنقیدی نظر وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں غلام نبی خیال کے نام مقتدرین کے خطوط درج ہیں جن میں ٹھاکر پونچھی، سہیل عظیم آبادی، پروفیسر نند لال طالب، پریم ناتھ بزاز، قیصر قلندر، لارڈ برٹرینڈ رسل، امتیاز علی خان عرشی، شاذ تمکنت، رام لال، خوشتر گرامی، ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن، شمس الرحمان فاروقی، علی جواد زیدی، شیخ محمد عبداللہ، بلراج ساہنی، دیو آنند، راج کپور، رامانند ساگر، آل احمد سرور، فکر تونسوی، بشیر بدر، ڈاکٹر قمر رئیس، واجدہ تبسم، شمس کنول، ڈاکٹر عابد حسین، جگن ناتھ آزاد، صابر آفاقی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ 440 صفحات پر مشتمل یہ تصنیف کشمیری رائیٹرس کانفرنس سری نگر نے 1998 میں شایع کی۔

21۔ فغان کشمیر: مزاحمتی شاعری کے تخلیق کاروں کا انتخابی مجموعہ جس میں برصغیر کے ان تمام شاعروں کا کلام شامل ہے جنھوں نے آزادی کشمیر کے حوالے سے ن منظومات رقم کی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، 1999ء

22۔ اظہار خیال: ادبی مقالات کا مجموعہ، کشمیری رائیٹرس کانفرنس، سرینگر، 2003

23۔ فکرِ خیال: تحقیقی مضامین کا ایک اور مجموعہ۔ جے اینڈ کے رائیٹرس ایسوسی ایشن، سرینگر، 2007

24۔ چنار رنگ: کشمیر کے قدرتی حسن کی جالانیوں سے متاثر ہوکر وقت وقت پر یہاں دوسرے علاقوں سے سخنور آتے رہے۔ خاص کر مغلیہ دور میں وسط ایشیا اور ایران سے ایسے فارسی شاعروں کا کشمیر میں تانتا بندھا رہا جنھوں نے درج کشمیر شاعری کے عدیم المثال فن پارے تحریر کیے۔ ان کے علاوہ بر

صغیر کے اردو شاعروں نے بھی اس جنتِ ارضی کے گیت گائے۔ ''چنار رنگ'' اسی نوع کے کلام کی شیرازہ بندی ہے جسے غلام نبی خیال نے محنت شاقہ سے مرتب کیا ہے۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی سری نگر۔ 2010

25۔ خیالات: کشمیری ادبیات، ثقافت اور تاریخ کے موضوعات پر تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔ کشمیری رائیٹرس ایسوسی ایشن، سری نگر، 2009۔

26۔ خیال قلم: یہ ایسے بیس مقالات کا مجموعہ ہے جس میں کشمیر کی تاریخ، تمدن، تہذیب اور ادبیات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت حسن اہتمام سے ساری کی ساری درآمد کردہ آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہے اور اس میں چالیس کے قریب رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ صفحات: 480 قیمت: آٹھ سو روپے۔ اسے بہار اردو اکادیمی پٹنہ کی طرف سے 2014 میں بہترین کتاب کا اول انعام دیا گیا ہے۔ میزان پبلشرس، سرینگر، 2012

27۔ کشمیر کی وادی: مشہور مغربی محقق اور تاریخ دان سر والٹر لارنس کی شہرہ آفاق انگریزی کتاب The Valley of Kashmir کا اردو ترجمہ جسے خیال صاحب نے پہلی بار کیا اور اسے قومی کونسل برائے اردو زبان، حکومتِ ہند، نئی دہلی نے شایع کیا، 2014

28۔ ''کشمیر: دھوپ اور چھاؤں میں'' کشمیر میں جدید تعلیم کے بانی کار، سی، ای، ٹنڈیل بسکو کی دلچسپ کتاب Kashmir in Sunlight and Shade کا ترجمہ، جس میں اُس نے کشمیر میں اپنے قیام اور تجربات ایک سفرنامے کی شکل میں پیش کیے ہیں۔ خیال صاحب کا یہ ترجمہ بھی قومی کونسل برائے اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی نے شایع کیا ہے، 2015ء

انگریزی

29۔ Progressive Literary Movement in Kashmir خیالات پبلشرس سری نگر۔ 2011۔

30۔ Leaves of Chinar تحقیقی اور تنقیدی مضامین جن میں کشمیر کے گونا گون موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ 2009ء۔ اسے جموں کشمیر کلچرل اکیڈیمی کا بہترین کتاب کا انعام برائے 2012 دیا گیا۔ اس تصنیف کا ایک اور ایڈیشن گلشن بکس سری نگر نے شایع کیا ہے۔

31۔ شبنم کا آتش کدہ: شاعر کے اُس اردو کلام کا مجموعہ جو اُس نے کشمیر کے دگر گوں حالات کے تناظر میں مزاحمتی شاعری کے طور پر لکھا۔ اس میں شاعر کی دیگر اردو منظومات بھی شامل ہیں۔ 2016۔

صحافتی سفر

خیالؔ صاحب نے ان اخبارات و جرائد، خبر رسان ایجنسیوں اور برقیاتی ٹیلی وژن چینلوں کے لیے ریاستی نمائندے کا کام کیا ہے: انڈیا ٹوڈے، سٹیٹسمین، ٹائم میگزین، نوائے وقت اور نیشن (لاہور)، دی گارڈین (لندن)، راجستھان پتریکا (جے پور)، پروب (الہ آباد)، سنڈے میل، مسلم (اسلام آباد) جرمن ریڈیو، وویس آف امریکہ اور نیویارک ٹائمز۔

کالم نویسی اور مقالہ نگاری

ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس، گریٹر کشمیر، رائزنگ کشمیر، کشمیر پرچم، چوتھی دنیا، بے لاگ، انڈین لٹریچر نئی دہلی، اِن کویسٹ کوچین، کشمیر ٹوڈے سری نگر، ویک کوچین، شیرازہ انگریزی

سرینگر۔ شیرازہ اردو سرینگر۔ تعمیر (سری نگر)

گذشتہ چھ دہائیوں کے دوران غلام نبی خیال کی شعری اور نثری تخلیقات جن رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں ان میں سے چند ایک کے نام یوں ہیں: آج کل دہلی، بیسوی صدی دہلی، انشا کلکتہ، تحریک نئی دہلی، تعمیر سری نگر، راوی لندن، سب رس حیدر آباد، شب خون الہٰ آباد، شاعر بمبئی، شیرازہ سری نگر، صبا حیدر آباد، صدا لندن، فکر و تحقیق نئی دہلی، معاصر لاہور، ماہ نو لاہور، اردو دنیا نئی دہلی، نیا دور لکھنو، نیا سفر الہٰ آباد، ندائے ملت لاہور، قومی ڈائجسٹ لاہور، زندگی لاہور، اسباق ناگپور اور تریاق بمبئی۔

انعامات و اعزازات

غلام نبی خیال کو ادب اور صحافت کی دنیا میں قابل تعریف خدمات کے لیے اب تک تقریباً دو درجن انعامات دئے گئے ہیں جن میں ریاست جموں و کشمیر سرکار کا ایوارڈ (2013)، ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ (1975)، ریاست جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ 1974 اور (2012) اور بہار اردو اکیڈیمی پٹنہ کا بہترین کتاب ایوارڈ (2014) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خیال صاحب کو انٹرنیشنل ایسے کمپیٹشن ایوارڈ، وارسا، پولینڈ (1968)، العرب میگزین شاعری مقابلہ اعزاز، نئی دہلی (1972)، اکھل بھارتیہ ناگری پرچارنی سبھا ایوارڈ، کلکتہ (1976) جرنلسٹس ویلفیر فونڈیشن ایوارڈ، نئی دہلی (1982)، لالہ ملک راج ٹرسٹ ایوارڈ جموں (1989)، لل دید فونڈیشن ایوارڈ سری نگر (2000)، دوردرشن ایوارڈ چندی گڑھ (2006)، فاضل کشمیری میموریل ایوارڈ سری نگر (2007)، بخشی میموریل کمیٹی ایوارڈ سرینگر (2007)، ہرموکھ کاشر مرکز ایوارڈ (2009)، جموں و کشمیر اردو اکیڈیمی ایوارڈ، سری نگر (2010)، خلعت

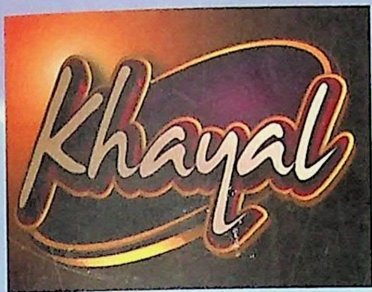
فاخرہ از انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، سری نگر (2013)، دستارِ فضیلت، پیش کردہ از ریڈیو کشمیر، کشتوار (2013) اور اج بیگم ایوارڈ سری نگر (2014) سے بھی نوازا گیا ہے۔

☆☆☆

JEHAN-E-KHAYAL

By

GHULAM NABI KHAYAL





عالمی شہرت کے مالک، سرزمین کشمیر کے مایہ ناز اور ممتاز شاعر، ادیب، نقاد، تحقیق کار اور صحافی غلام نبی خیالؔ گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ادب اور صحافت کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ اُن کی تصانیف کی تعداد تیس سے زیادہ ہو چکی ہے جو خیال صاحب نے کشمیری، اردو اور انگریزی زبانوں میں تحریر کی ہیں۔ صحافت کی دنیا میں انھوں نے ہندوستان کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک کی خبر رسان ایجنسیوں، اخباروں اور ریڈیو کے لیے نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری، اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی اخبار نکالے ہیں۔

خیالؔ صاحب گزشتہ چودہ سال سے انگریزی ہفت روزہ *Voice of Kashmir* باقائدگی کے ساتھ سری نگر کشمیر سے چلا رہے ہیں۔

خیالؔ صاحب کو ادبی اور صحافتی خدمات کے عوض تقریباً دو درجن انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے جن میں ریاست جموں و کشمیر کا سٹیٹ ایوارڈ (2013)، ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ برائے ادب، (1975) ریاستی کلچرل اکیڈیمی انعام (1974) اور (2012) اور بہار اردو اکیڈیمی، پٹنہ کا بہترین کتاب انعام (2014) بھی شامل ہیں۔

رابطہ: 9906408998 (and) 9419005909

Email:gulkhayal@gmail.com



